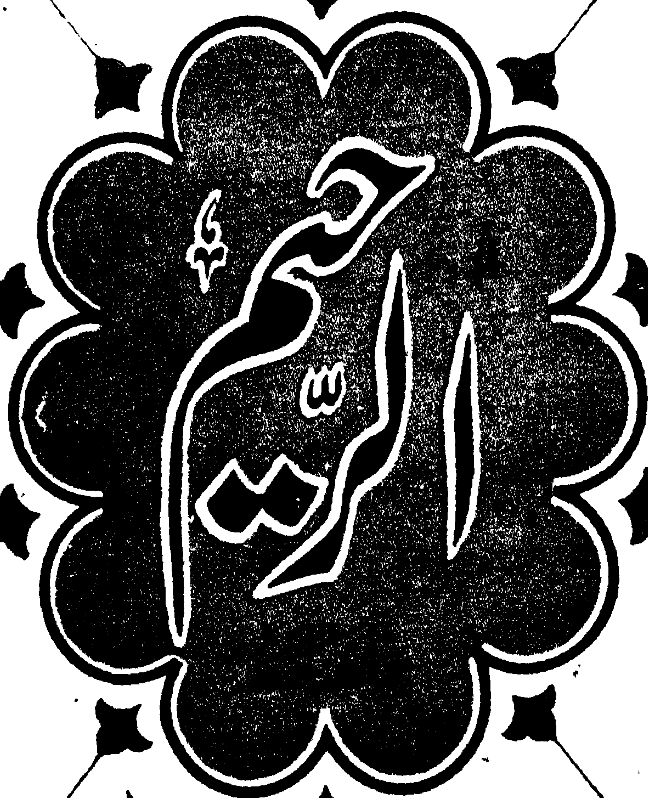
شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

1(3)



مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی

مخدوم امیر احمد

مُدیر:

محمد سرور

قیمت سالانہ :- آٹھ روپے قیمت فی پرچہ پچھتر پیسے

الرحیم

جلد ۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۳ء نمبر ۳

فہرست مضامین

کتبہ۔ عبدالمجید ۶۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے علمی اداروں اور اہل قلم نے شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ وحکمت کی نشر واشاعت کے لئے اکیڈمی جیسے ایک مرکزی اشاعتی اور تصنیفی و تحقیقی ادارے کے معرض وجود میں آنے کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس سلسلے میں متعدد اداروں اور کئی ایک اہل قلم نے ہمیں اپنی ان اشاعتی و تصنیفی کوششوں سے بھی مطلع کیا ہے، جو وہ شاہ صاحب اور ان کے خانوادۂ علمی کی کتابوں کی طباعت و اشاعت اور ان کے تراجم کے ضمن میں کر رہے ہیں۔ گودھرا گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک بزرگ شاہ ولی اللہ کی ایک کتاب المسوی کا اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ حیدر آباد دکن کے ایک صاحبِ علم نے "الطاف القدس" کا اردو ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ گوجرانوالہ کا مدرسہ نصرۃ العلوم شاہ رفیع الدین کے متعدد رسائل شائع کر چکا ہے مجلسِ علمی کراچی نے بڑے اہتمام سے اور نہایت اچھے نسخ ٹائپ میں شاہ اسمٰعیل شہید کی تصوف و حکمت پر مشہور عربی کتاب "العبقات" چھاپی ہے اور مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا کیا ہوا اس کا اردو ترجمہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے، کئی ایک ناشرین کتب شاہ ولی اللہ اور ان کے سلسلے کے بزرگوں کی تصنیفات اصل عربی اور فارسی میں نیز ان کے ترجمے اردو میں چھاپ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان کے بعض عربی دینی مدارس شاہ صاحب کی کتابوں کو اپنے نصاب میں باقاعدہ طور سے شامل کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

یوں تو اس برصغیر میں اہل علم کی شروع ہی سے ولی اللہی علوم کی طرف توجہ رہی ہے اور اسی زمانے سے شاہ صاحب کی کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی ہو رہے ہیں لیکن اب کچھ عرصہ سے برصغیر میں جو نئے حالات رونما ہوئے ہیں اور سیاسی آزادی کے حصول کے بعد مسلمانوں پر داخلی اور خارجی ہر دو سمت سے نئے افکار و خیالات کی یورش شروع ہوئی ہے اس کی وجہ سے شاہ صاحب کے علوم کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ ہو رہی ہے اور چونکہ موجودہ حالات میں نئے افکار و خیالات کی یورش اور بڑھے گی اور اس سے قدرتاً ذہنوں میں حرکت، اضطراب اور بے چینی بھی پیدا ہوگی، اس لئے ظاہر ہے شاہ ولی اللہ اور ان جیسے عظیم مفکرین اسلام کی کتابوں کی طرف مسلمانوں کا اور زیادہ رجوع ہوگا۔ وہ زیادہ چھپیں گی اور ان کے مختلف زبانوں میں بکثرت ترجمے ہوں گے۔

"الرحیم" کی یہ کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہے، وہ ان تمام علمی و اشاعتی سرگرمیوں کا احصاء کرتا رہے۔ اپنے قارئین کو ولی اللہی فکر پر اور اس سے متعلق حضرات کے بارے میں شائع ہونے والی کتابوں سے باخبر رکھے اور حتی الوسع ان کا جائزہ لیتا رہے۔ یہ اکیڈمی پاکستان اور ہندوستان دونوں میں شاہ ولی اللہ اور ان کے مکتب فکر پر تصنیفی و تحقیقی کام کرنے والوں کے درمیان اگر اس طرح کے علمی رابطے کی خدمات سرانجام دے سکے تو اسے یہ اپنی بڑی خوش قسمتی سمجھے گی۔

اس سلسلے میں ایک عام شکایت یہ ہے کہ اس وقت تک شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے جو اردو ترجمے ہوئے ہیں، ان میں اکثر و بیشتر اتنے ہی مشکل اور غامض ہیں، جتنی کہ خود اصل کتابیں ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو اصل کتابوں سے زیادہ دقیق اور عسیر الفہم ان کے یہ اردو ترجمے ہیں۔ اب اگر شاہ صاحب کی تعلیمات اور خصوصاً ان کی حکمت کو عام کرنا ہے، تو ضرورت ہے کہ ان کی کتابوں کے ترجمے ملک کی تمام زبانوں میں ہوں، اور عام فہم اور آسان اسلوب میں ہوں تاکہ عام پڑھے لکھے اصحاب جنہیں تھوڑا بہت علمی و دینی شغف ہے، اور وہ فکر ولی اللہی کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کا مطالعہ کر سکیں۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ آج کے ذہنوں اور شاہ صاحب نے دو سو سال

قبل جس ماحول، زبان اور پیرایۂ بیان میں اپنے خیالات و افکار پیش کئے تھے، اس کے درمیان جو قدرتی خلا پیدا ہوچکا ہے، اسے اس طرح پُر کرنے کی کوشش کی جائے کہ ان کتابوں کے مترجم محض لفظی ترجمے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کتاب کے مطالب کی تشریح ہو، اور انہیں آج کے فکری و اجتماعی پس منظر میں پیش کیا جائے۔ فکر ولی اللہی سے حقیقی ذہن ربط صرف اسی صورت میں ممکن ہے اور عام قاری اسے اسی طرح ہی اپنا سکتے اور انفرادی و اجتماعی عمل کے لئے مشعل ہدایت بنا سکتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اگر شاہ صاحب کی کتابوں کے اس طرح ترجمے ہوں۔ اور ان کی تعلیمات اور حکمت کو آج کی زبان میں اور آج کے دینی و روحانی اور علمی و اجتماعی و معاشی تقاضوں کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ تو فکر ولی اللہی کی طرف ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کا عام رجوع ہوسکتا ہے اور وہ بالخصوص اس ملک میں اسلامی فکر و نظر کی ایک اہم بنیاد بن سکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ دین کی تعبیر و تشریح میں کسی خاص مکتب فکر کی اجارہ داری کے ہم قطعاً حامی نہیں ہیں۔ اور آزاد خیالی کے اس زمانے میں لوگوں کو اس کی دعوت دینا تو انتہائی بے سمجھی ہوگی۔ بے شک اس برصغیر میں شاہ ولی اللہ دین اسلام کے ایک بہت شارح ہیں اور ان کی یہ تشریح و تعبیر اس لئے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ان کی اپنی ایک جامع شخصیت تھی اور انہوں نے اسلام کو اسی جامعیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا لیکن اس برصغیر میں اور اس سے باہر گزشتہ صدیوں میں بڑے بڑے مجتہد، عالم، حکیم اور مفکر گزر چکے ہیں۔ فکر ولی اللہی کے تخصیصی مطالعے کے ہرگز یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ ہم ادھر سے آنکھیں اور دماغ بند کرلیں اور تصوف کے عقیدہ "توحید فی الشیخ" پر علم و فکر کی دنیا میں بھی عامل ہوں بہرحال اس سلسلے میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اگر ہمارے ہاں اس طرح فکر ولی اللہی کا تحقیقی مطالعہ شروع ہو جائے تو یہ ایک نقطۂ آغاز ہوسکتا ہے دوسرے بزرگان دین کے افکار و تعلیمات کے تحقیقی مطالعے کا کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہ نے جہاں ان تمام علمائے عظام سے استفادہ کیا۔ جو ان سے پہلے ہوئے اور ان

کے افکار سے انتخاب کر کے اپنے فکر کی عمارت تعمیر کی۔ وہاں انہوں نے ان کے افکار کا تنقیدی جائزہ بھی لیا۔ اسلام کے مجموعی نقشے میں ان کی جگہ معین کی اور ان میں آپس میں جو تضادات تھے، ان کی تشریح کی۔ اور ان میں مطابقت پیدا کی۔ اگر ہمارے ہاں اسلام کی دینی تاریخ اور اس کے مختلف مذاہب و مکاتب فکر کے اس طرح کے مطالعے کا رجحان فروغ پا سکے تو اس سے ایک تو مذہبی فرقوں کی موجودہ مخاصمتیں کم ہو جائیں گی اور دوسرے آج کل اسلامی مباحث میں عام طور سے جو سطحیت، تنگ نظری، ہنگامہ پسندی اور وقت پرستی آگئی ہے۔ اس کا تدارک ہو سکے گا۔ اور ان مباحث میں ایک حد تک عُمق، وسعت اور اس کے ساتھ ساتھ تفکر بھی پیدا ہوگا۔ جس کی کہ اس وقت ہمیں بڑی ضرورت ہے۔

بات یہ ہے کہ ہماری حالیہ تاریخ میں ایک دور وہ تھا، کہ ہم مسلمانوں کی غیر ملکی اور غیر مسلم تسلط کے خلاف جو سیاسی جدوجہد ہو رہی تھی، اس میں سب سے بڑا محرک اور فعّال جذبہ اسلام کا تھا اور نہ صرف عوام بلکہ خواص تک کے لئے بھی اس کی حیثیت ایک "رجز" کی تھی کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں ثابت قدم رہنے پر اُبھارا جاتا تھا۔ آزادی کے حصول اور اس کے نتیجے میں غیر ملکی اور غیر مسلم تسلط کے ختم ہونے کے بعد یہ صورت حال بدل گئی۔ اور اب اسلام کو "کُفّار" کے خلاف بطور "رجز" کے استعمال کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ آزادی کے فوراً بعد بعض جماعتوں نے اسلام کو خود مسلمانوں کے خلاف بطور "رجز" استعمال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ زیادہ کامیاب نہ ہوئیں۔ پھر انہوں نے اپنی وقتی سیاسی ضرورتوں کو اسلام کا نام دیا۔ اور اس سے اپنے جماعتی مصالح کی تائید میں دلائل اخذ کرنے لگیں اور اس طرح اسلام جو ساری انسانیت کے لئے اخوت، مساوات، حق و انصاف اور فلاح عامہ کا پیغام تھا۔ وہ ان جماعتوں کے ہاتھ میں محدود قسم کی حزبی سیاست کا آلۂ کار بن گیا۔ یقیناً سمجھ دار اور باشعور طبقوں میں اس کے خلاف ردِّ عمل ہونا تھا اور وہ ہوا۔ اس پر مستزاد یہ کہ پچھلے چند سالوں میں ہمارے ہاں بعض بڑی دُور رس سیاسی اور معاشی تبدیلیاں

ہوئی ہیں۔ نیز ملک میں آزادی کے فوراً بعد جو صنعتیں قائم ہونا شروع ہوئی تھیں، ہماری سماجی زندگی میں اب ان کے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ غرض اب ہمارے نہ وہ مسائل ہیں، جو آزادی سے پہلے دورِ غلامی میں تھے۔ اور ان مسائل کی نوعیت بھی یکسر بدل گئی ہے، جن سے ملک کو آزادی کے دس بارہ سال تک واسطہ رہا۔ فرد اور جماعت کے پرانے رشتے بسرعت ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ سماج کی پہلی اخلاقی بندھنیں بھی کمزور پڑ رہی ہیں، پرانا طبقاتی توازن ختم ہو رہا ہے اور نئے گروہ اقتدار میں آتے جاتے ہیں۔ اب جوں جوں صنعت و تجارت کا دائرہ وسیع ہوگا، سماج کے رنگ ڈھنگ بھی بدلیں گے اور ہم میں سے ہر ایک کو نئے سماجی، معاشی اور ذہنی مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قدرتی بات ہے کہ جب حالات ہمیں ان مسائل کے حل ڈھونڈنے پر مجبور کریں گے اور ہمیں اس بارے میں سوچنا پڑے گا، تو ہماری سوچ کا رخ لامحالہ اسلام کی طرف ہوگا۔ اور ہم اسی سے ہدایت حاصل کرنے میں کوشاں ہونگے۔ اب یہ مسائل جن کے ہمیں حل ڈھونڈنا ہوگا، ٹھوس اور سنگین مسائل ہیں اور یہ واضح، معین اور ممکن العمل حل چاہتے ہیں۔ یہاں جذبات پرستی، نعرہ بازی اور رجز خوانی سے کام نہیں چلے گا۔ تاریخ اسلام پر تنقیدی نظر ڈالنی ہوگی اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر اور اسکے علوم سے باخبر ہونا ضروری ہوگا۔ اور تاریخ کا رخ کدھر کو ہے۔ اس کا اندازہ کرنا بھی پڑے گا۔

بے شک ہم مسلمانوں کے لئے اسلام کیساتھ جذباتی اور نظریاتی ارتباط ضروری اور لابدی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ آج اسلام کو ہماری عملی زندگی میں ایک تعمیری، تخلیقی اور اخلاقی کردار بھی ادا کرنا ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اسلام کا ایسے نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں کہ جہاں وہ ہمیں باطنی سکون و اطمینان عطا کر سکے، وہاں اس کی مدد سے ہمیں اپنے مسائل کے حل بھی مل سکیں — وہ صرف "نظریۂ حیات" اور "آئیڈیالوجی" ہی نہ ہو، بلکہ ہمیں اپنے لئے "نظام حیات" کی تشکیل میں بھی مدد دے اور ہماری رہنمائی کرے۔

ہمارے ہاں بعض لوگوں کو "احیاء" اور "تجدید" کی اصطلاحوں سے بڑی چڑ ہے۔ اور وہ ایسی

اصلاحی اور تعمیری کوششوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں، جن میں حال کو ماضی سے مکمل طور پر منقطع کئے بغیر مستقبل کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ اور قومی شیرازے کی روایات کا حتی الوسع تسلسل ٹوٹنے نہیں دیا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمود کے معنی موت کے ہوتے ہیں اور ہر وقت نظریں پیچھے رکھنا قوم کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا، لیکن آگے قدم بڑھاتے ہوئے پیچھے نہ دیکھنا یا اس کا خیال نہ رکھنا کہ جن کے ہم آگے چل رہے ہیں وہ ہمارے ساتھ بھی ہیں یا نہیں، زیادہ دانشمندی کی بات نہیں ہوگی۔ اس ضمن میں مصطفےٰ کمال اتاترک اور اس کے انقلابی اقدامات ہمارے لئے ایک سبق ہیں مرحوم نے ترک قوم کو زبردستی "یورپین" بنایا۔ اسے "فرسودہ ماضی" سے یک قلم آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کا لباس بدلا، قانون بدلا، زبان کا رسم الخط بدلا اور اس کے سماجی اطوار بدلے۔ لیکن ان اقدامات نے ترک قوم کو اس طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے کہ اب ایک طرف روشن خیال اور یورپین اقلیت ہے اور دوسری طرف قدامت پسند اکثریت، اور دونوں میں خانہ جنگی کے سے حالات پیدا ہو گئے ہیں، اس سے آج ترکوں کے سمجھ دار طبقے خود پریشان ہیں۔ سیاسی انقلابات کی تو بات دوسری ہے۔ لیکن جہاں تک سماجی انقلابات یا دور رس تبدیلیوں کا تعلق ہے، انہیں بروئے کار لانے کے لئے عوام کی اکثریت کی نہ سہی، لیکن ان کے ایک کافی بڑے حصّے کی رضامندی اور دلی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے اور انہیں یقین دلانا پڑتا ہے کہ ان اقدامات سے ان کی انفرادی، جماعتی اور قومی شخصیت کی نفی نہیں ہوگی، بلکہ ماضی کے جن باقیات صالحات کو وہ اچھا سمجھتے ہیں اور جو ان کے ہاں "معروف" کا درجہ رکھتی ہیں، یہ اقدامات دراصل ان کے خلاف نہیں، خواہ ظاہری طور پر انہیں ان میں کچھ اختلاف نظر بھی آتا ہے۔ اسے آپ احیاء پرستی کہیں یا تجدید، اگر سیاسی و سماجی اصلاح خود قوم کے اندر سے ہونی ہے اور اسے وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کی طرح غیر ملکی طاقت کے ہاتھ سے اوپر سے تھوپا نہیں جانا تو احیاء اور تجدید کے بغیر کام نہیں بن سکتا۔ ہمارے نزدیک آج مسلمانوں کو اپنے سماج اور ذہن و فکر میں جن دُور رس تبدیلیوں کی ضرورت ہے، اور ہم مانتے ہیں واقعی ان

کی ضرورت ہے۔ اس احیاء و تجدید میں فکر ولی اللہی ایک مشعل کا کام دے سکتی ہے اور اسلام کی جو تعبیر اس میں کی گئی ہے اس کے طفیل ہم ماضی کی باقیات صالحات کو برقرار رکھتے ہوئے کامیابی سے آگے بڑھ سکتے ہیں،

آج کی سائنٹفک زندگی کے تقاضوں سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ اور انسانی افکار جس سرعت سے ترقی کر رہے ہیں، ان کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انہیں کس طرح اپنایا جائے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اپنے ماضی کو دورِ جاہلیت قرار دیکر اس سے بالکل قطع تعلق کر لیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ ماضی کی اچھی باتوں کو برقرار رکھتے ہوئے نئی زندگی کو اپنا لیا جائے۔ اس طرح ہم اپنی قومی و ملّی شخصیت قائم رکھ کر ترقی کر سکیں گے اور پہلی صورت میں ہماری مثال اس کشتی کی ہوگی جس کا لنگر ٹوٹ گیا ہو، اور وہ سمندر کی موجوں کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ہو، شاہ ولی اللہ اور ان جیسے مفکرین اسلام کی تعلیمات ہمیں دوسری صورت کے اختیار کرنے میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ریسرچ پروفیسر مولانا غلام مصطفٰے قاسمی صاحب حج سے بخیریت واپس تشریف لے آئے ہیں، وہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور حجاز مقدس کے دوسرے شہروں کی زیارت کے بعد اردن، لبنان، شام اور عراق بھی گئے، وہاں کے مشہور علماء سے ملاقاتیں کیں تاریخی کتب خانے دیکھے، اور انہیں اس سفر میں ان اسلامی ملکوں کی علمی، فکری و اجتماعی سرگرمیوں کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ مولانا موصوف نے الرحیم میں اپنی اس بابت کے تاثرات لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

فقہ میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام

حافظ عباد اللہ فاروقی[1]

حضرت شاہ ولی اللہ کی اساسی تربیت فکری میں ان کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب نے فقہ اور دیگر علوم شاہ عبدالرحیم ہی سے حاصل کئے۔ شاہ عبدالرحیم فتاویٰ عالمگیری کے مصنفین میں سے ایک عالم ہیں۔ اس لحاظ سے حضرت شاہ ولی اللہ کے کمالاتِ علمی عالمگیر کے دور کا نتیجہ ہیں۔ شاہ صاحب اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی وفات کے ۱۲ سال بعد تک دہلی میں درس و تدریس میں مشغول رہے اس کے بعد جب وہ حجاز گئے تو وہاں شیخ ابوطاہر شافعی اور شیخ تاج الدین حنفی کی صحبتوں سے مستفید ہوئے ان کی صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ صاحب نے حجاز پہنچکر فقہ شافعیہ اور حنفیہ کو ایک درجہ پر مانا۔ اور ان دونوں میں مؤطا امام مالک کو امر مشترک قرار دیا۔

فقہ کی ابتدا اور اس کے ارتقائی مراحل

عہدِ رسالت و صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نہ تو کوئی حدیث کی کتاب لکھی گئی اور نہ فقہی مسائل یا شرعی احکام کو کسی صحابی نے جمع کیا۔ نہ کسی اور علم کے اصول و قواعد

---

[1] ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ۔ رنگ محل، لاہور

اُس وقت معین ہوئے۔ اُس زمانے میں صورت یہ تھی کہ اصحاب نبویؐ جیسا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کرتا دیکھتے، ویسا ہی خود کرتے۔ چونکہ اصحاب میں سے ہر ایک کو آپؐ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنے کا موقع نہ ملتا، اس لئے انہیں ایک دوسرے سے دریافت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جو شخص صحابہ میں سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر اسوۂ حسنہ سے زیادہ واقف ہوا۔ وہی زیادہ ممتاز فقیہہ کہلایا۔

دورِ رسالت کے بعد جب صحابہ کا زمانہ آیا تو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیکھی اور آپؐ سے سنی ہوئی باتوں پر عمل کرتے رہے۔ لیکن اگر کوئی نئی بات پیش آتی تو منصوصاتِ کتاب وسنت پر غور کیا جاتا۔ اور ان کی روشنی میں اس کا حل تلاش ہوتا۔ اس زمانے میں لوگ بالعموم صحابہ کو ہی فقہا سمجھتے، اور شرعی معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے۔

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد صحابۂ کرام دور دراز ملکوں میں منتشر ہو گئے تھے۔ جہاں بھی وہ پہنچے، وہ اپنا علم حدیث ساتھ لے گئے۔ ان کی حیثیت بستیوں اور شہروں میں ائمہ کی تھی لوگ اپنے اپنے شہر اور محلّہ کے علماء (یعنی صحابہ) سے امور دینی کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ انہیں سے انہوں نے احادیث نبوی اور مسائل شرعی کو سیکھا۔ اگرچہ اصحاب نبیؐ اس زمانے میں فقہا کا کام بھی سرانجام دے رہے تھے لیکن ان میں باہمی اختلاف نہ تھا۔ ایک شہر کا فقیہہ دوسرے شہر کے فقیہہ سے کسی قسم کا بغض نہ رکھتا تھا۔ بلکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ دین کی اشاعت کی جائے۔ غرض صحابۂ کرام کے عہد میں فقہی مسائل میں اختلاف کی راہیں نہیں کھلی تھیں اور فقیہہ ہونا دلائل منطقی کے جاننے اور اصولِ فلسفہ سے واقف ہونے پر منحصر نہ تھا۔ اور نہ اس زمانے کے لوگوں کو تفقہ کا اظہار منظور تھا۔ لوگ سیدھی سادھی روزمرہ کی باتوں کے لئے اپنے شہر کے عالم سے مسائل دریافت کر لیا کرتے تھے۔

جب صحابہ کا زمانہ گذر گیا تو ان کی جگہ علمائے تابعین اپنے اپنے شہر کے عالم اور محدّث قرار پائے اس زمانے میں لوگ اپنے اپنے شہر اور بستی کے امام کی بیان کی ہوئی احادیث اور شرعی مسائل روایت کرتے اس طرح ہر شہر کے آدمی اپنے ہی شہر کے فقیہہ مفتی اور محدث کے قول پر عمل کرتے اور اس سے

فتوے لیتے اور علم سیکھتے چنانچہ مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ کے فقہا اور محدثین الگ الگ تھے۔ جن کے اصول اور اجتہاد کی وہاں کے لوگ تقلید کیا کرتے تھے۔

یہ صورت دوسری صدی کے وسط تک یعنی ۱۴۳ھ تک قائم رہی اور لوگوں نے شرعی مسائل میں اگرچہ اپنے اپنے امام کی پابندی کی لیکن ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ مگر بعد میں وہ زمانہ شروع ہوا۔ جس میں فقہ کے مذاہب اربعہ کی بنیاد پڑی۔

فقہ کے مذاہب اربعہ

تبع تابعین کے زمانے میں حدیث و فقہ کی تعلیم و تعلّم کی صورت تو وہی تھی، جو تابعین کے دور میں تھی لیکن اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ اور مذہبی امور کے بارے میں ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان حالات میں لوگ اصول و قواعد کے منضبط کرنے اور اجتہاد و استنباط اور استخراج کے قاعدے ترتیب دینے کی طرف راغب ہو گئے۔

سب سے پہلے حنفی مذہب کی بنیاد پڑی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اجتہاد اور استنباطِ مسائل اور استخراجِ فروعات میں ایک خاص قسم کی استعداد تھی۔ نیز ان کے زہد و ورع میں کسی کو شک نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے شہر کے امام و فقیہہ ابراہیم نخعی کی احادیث اقوال اور روایات پر اپنے مذہب کی بنیاد قائم کی اور انہیں کے قائم کردہ اصول پر جزئیاتِ مسائل کا استخراج کرنا شروع کیا

غرض جب امام ابو حنیفہ نے فقہ کی تدوین کی تو فقہائے کوفہ نے ان کے اجتہاد کو قبول کر کے ان کے استخراجی مسائل پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمد نے اگرچہ فروعات میں امام ابو حنیفہ سے اختلاف کیا۔ لیکن اصول میں انہوں نے ان کی پوری تقلید کی۔ حنفی مذہب امام ابو حنیفہ کے مذکورہ بالا دو شاگردوں کی وجہ سے عراق خراسان اور ماوراء النہر میں پھیل گیا

حنفی مذہب کے بعد مالکی مذہب فقہ کی بنیاد پڑی۔ امام مالک حدیث اور فقہ کے علم میں بے مثل تھے۔ انہوں نے حدیث کی ایک جامع کتاب "موطا" لکھی جسے حضرت شاہ ولی اللہ نے فقہ حنفی اور شافعی میں لفر مشترک

تسلیم کیا ہے۔ جہاں جہاں یہ کتاب پہنچی، مالکی مذہب پھیلتا گیا۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اپنے استاد کے مذہب کے اصول اور دلائل کو ترتیب دیا۔ مؤطا کی تلخیص کی اس طرح مالکی مذہب کی بڑی اشاعت ہوئی۔

مذکورہ بالا مذاہبِ فقہ کی بنیاد پڑ چکی تو امام شافعی پیدا ہوئے۔ انہوں نے مذکورہ بالا دونوں مذاہب کے اصول و فروع کو دیکھ کر اور ان کی کلیات و جزئیات پر نظر کر کے ان باتوں کو جو اُن کے نزدیک ان مذاہب میں ناقص تھیں، درست کیا۔ اور نئی طرز سے فقہ کے اصول اور قواعد کو ترتیب دیا اس موضوع پر انہوں نے ایک کتاب تالیف کی۔ اس میں احادیث مختلف کے جمع کرنے کے قاعدے مرتب کئے۔ اور احادیث مرسل اور منقطع پر ضروری شرائط کے بغیر استناد ترک کیا۔ واضح رہے کہ امام شافعی کے زمانے میں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجاز پہنچکر محسوس کیا کہ اسلامی بین الاقوامی سیاست میں عرب و عجم کو آپس میں متفق ہونا چاہیئے۔ اس لئے انہوں نے عربوں اور عجمیوں کی فقہ کی اصل یعنی موطا امام مالک کو تسلیم کر کے حنفی اور شافعی مذاہب فقہ کو ایک درجہ پر مان لیا۔ حنفی فقہ ہندوستان اور ترکستان میں زیادہ تر رائج تھی زوال بغداد کے بعد وہاں کی فارسی بولنے والی قومیں جب ہندوستان آئیں تو وہ حنفی فقہ اپنے ساتھ لائیں۔ لیکن عربی بولنے والی قومیں جو مصر اور مغرب کی طرف گئیں۔ وہ شافعی اور مالکی مذہب رکھتی تھیں۔ غرض شاہ صاحب اس نتیجہ پر پہنچے کہ فقط حنفی فقہ تمام مسلمانوں کو جو علاوہ فارسی کے عربی بھی بولتے ہیں ایک نقطہ پر جمع کرنے کے لئے کافی نہیں ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شاہ ولی اللہ مذہب حنفی اور شافعی میں مجتہد منتسب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل امام شافعیؒ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بھی امام شافعی ہی کا مسلک اختیار کیا یعنی جب احادیث کا ذخیرہ جمع ہو گیا تو انہوں نے صحابہ کے اقوال پر استدلال ترک کر کے احادیث کی طرف رجوع کیا۔ اور جو مسئلہ وہ قرآن اور حدیث میں نہ پاتے اس کے متعلق قرآن اور سنت کی روشنی میں غور و فکر کرتے۔

غرضیکہ ان ائمہ میں سے کسی نے بھی اپنے فقہی مذہب کی اس لئے طرح نہیں ڈالی تھی کہ لوگ

ان کی شخصی تقلید کریں۔ اور نہ اپنے آپ کو صاحب مذہب کہلوانے کے لئے انہوں نے شرعی مسائل میں اجتہاد اور استنباط کیا تھا۔ ان کے دل میں مقتدا بننے کی بھی بالکل خواہش نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنی شخصی تقلید سے لوگوں کو منع فرماتے اور اگر کوئی مسلمان فرمانروا چاہتا کہ ان کی مرتب کردہ کتابِ فقہ کو تمام لوگوں میں مشتہر کرے، تو وہ اس کو ایسا کرنے سے روکتے۔

مذاہب اربعہ میں اختلاف کے اسباب

مسلمانوں میں اختلاف دو قسم کا رونما ہوا۔ اوّل اختلاف عقائد میں رونما ہوا۔ دوسرا اختلاف مسائل اور فروع میں۔ جو شخص عقائد اور اصول میں مخالف ہے وہ اہل سنت کے گروہ سے خارج ہے مثلاً معتزلہ، قدریہ، مرجیہ اور خوارج وغیرہ۔ اس قسم کا اختلاف نہ تو صحابہ نہ تابعین نہ تبع تابعین اور نہ ائمہ میں پیدا ہوا۔ بلکہ یہ سب عقائد اور اصول میں متفق رہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاروں مذہبِ فقہ اہل سنت ہی کہلاتے ہیں۔ مسائل اور فروع سے فقہ کے مسائل مراد ہیں۔ اور ان میں البتہ چاروں مذاہب میں اختلاف ہے صحابہ بھی اختلاف رکھتے تھے اس اختلاف کے اسباب حسب ذیل ہیں

صحابہ کے اقوال و افعال اور احکام و مسائل کا مدار ہمیشہ قرآن اور حدیث پر رہا ہے۔ قرآن پیغمبر صلعم کے سامنے جمع ہو گیا تھا، اس لئے کسی ایسے مسئلہ میں جو قرآن میں صاف موجود ہے۔ باہم اختلاف نہیں ہوا۔ اس کے برعکس احادیث نبوی آپؐ کے سامنے جمع نہ کی گئیں، اس لئے جن مسائل کا استخراج حدیث پر موقوف تھا۔ ان میں اختلاف پیدا ہوا۔ اس کے کئی اسباب ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ نے حجتہ اللہ البالغہ میں جمع کئے ہیں۔

اختلاف سماعت۔ یعنی ایک صحابی نے حدیث نبوی کو سنا۔ اس سے دوسرے صحابی نے سنا اور عمل کیا۔ مگر ایک صحابی جس کو یہ حدیث پہنچی ہی نہیں، جب اس کو ویسا معاملہ پیش آیا تو اس نے اجتہاد سے کام لیا۔ اگر اس کا اجتہاد حدیث کے مطابق ہوا تو دونوں صحابی متفق ہو گئے اور اگر اجتہاد میں خطا ہوئی تو ان میں اختلاف ہوا۔

ترک اجتہاد

یعنی کسی صحابی کا اپنے اجتہاد سے رجوع کرنا۔ مثلاً ایک صحابی نے کسی امر میں اجتہاد کیا، اس سبب سے کہ اس بارے میں حدیث اسے نہ پہنچی تھی۔ پھر جب اس کو وہ حدیث مل گئی تو اس نے اپنے اجتہاد کو ترک کر دیا۔ اور حدیث پر عمل کیا لیکن جن لوگوں نے اس صحابی کے اجتہاد کو سنا اور انہیں ان کے اس سے رجوع کرنے کی خبر نہ ملی انہوں نے اس صحابی کے قول پر عمل کیا اور اس طرح اس صحابی کا یہ فعل اختلاف کا باعث ہوا۔

اشتباہ فی الحدیث

جب حدیث کا راوی ضعیف ہوتا اور حدیث کی صحت میں کسی قسم کا شک وشبہ کیا جاتا تو اس صورت میں صحابہ اپنے اجتہاد پر قائم رہتے۔ اور اس حدیث کو صحیح نہ جان کر اس پر عمل نہ کرتے اس طرح اختلاف کی راہیں کھل گئیں۔

سمجھ میں اختلاف ہونا۔

یعنی مختلف صحابیوں نے پیغمبر خدا کو ایک کام کرتے ہوئے دیکھا اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اسے سمجھا۔ اس طرح ایک نے دوسرے سے اختلاف کیا۔

سہو ونسیان۔

اختلاف کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ کسی صحابی نے جو کچھ پیغمبر خدا صلعم سے سنا یا آپؐ کو کرتے دیکھا وہ اسے بھول گیا۔ لیکن دوسروں نے یاد رکھا۔

اختلاف ضبط۔

پیغمبر خدا صلعم نے جو کچھ فرمایا بعض صحابہ نے اس کا مطلب کچھ اور سمجھا جیسا کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ مردہ کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔ اس حدیث کو حضرت عائشہؓ نے سنکر کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور راوی نے غلطی کی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر صلعم ایک یہودی کے جنازہ پر گذرے اس کے گھر والے رو رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا یہ تو روتے ہیں اور

وہ عذاب میں مبتلا ہے۔

علت حکم میں اختلاف ہونا۔

رسول خدا صلعم کے حکم یا سنت کی کوئی علت قائم کرکے اس میں اختلاف کرنا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ایک جنازہ کو دیکھ کر رک گئے کسی نے اس قیام کی علت تعظیم ملائکہ خیال کی۔ کسی نے ہول قیامت۔

دو مختلف حدیثوں کے جمع کرنے میں اختلاف ہونا۔

یہ مسلّم ہے کہ عادات مباحات اور سنن میں رسول اللہ صلعم فرق نہ فرماتے تھے۔ اور جو صحابی صاحب علم تھے۔ وہ عادات کو عبادت سے اور سنن کو واجبات سے جدا کرتے اور جو اس میں تمیز نہ کرتے وہ سب کو عبادات اور واجبات ہی خیال کرکے اختلاف عادات کو اختلاف فی العبادات جانتے۔

تقلید و اجتہاد

مذاہب اربعہ میں مذکورہ بالا اختلاف کے باوجود حضرت شاہ ولی اللہ ان کو مساوی مانتے تھے اور ان کی پیروی پر زور دیتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ جس تقلید کے معتقد تھے اس کے بارے میں مولانا خیر محمد صاحب ماہنامہ الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں لکھتے ہیں

"تقلید کا اچھا ہونا یا برا ہونا "معتقد فیہ" کے احوال پر موقوف ہے۔ اگر معتقد فیہ غیر مطیع (فاسق و فاجر یا مشرک و کافر) ہو تو تقلید حرام و قبیح ہے قرآن و سنت میں اس کی ممانعت جابجا وارد ہے اور اگر معتقد فیہ مطیع اور لائق اتباع (امام و مجتہد) ہو تو تقلید حسن اور بعض حالات میں واجب ہے۔ قرآن و حدیث اس کی تاکید سے مملو ہے۔ اور یہی امت مرحومہ میں رائج و مشہور ہے اور حضرت شاہ صاحب اس تقلید کے معتقد ہیں" (ص ۳۷۳)

شاہ ولی اللہ نے اپنے اس نقطۂ نظر کو عقد الجید میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"معرفت شریعت میں تمام امت نے بالاتفاق سلف پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا

ہر ہر طبقہ میں پچھلے علماء پہلے علماء پر اعتماد و اعتبار کرتے چلے آئے ہیں۔"

اس ضمن میں حضرت شاہ صاحب نے تقلید کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ تقلید شخصی و غیر شخصی ائمہ اربعہؒ کے مذاہب کی تدوین سے قبل دوسری صدی کے آخر تک تقلید غیر شخصی کا رواج رہا، حتیٰ کہ صحابہؓ و تابعین میں بھی اس کا دستور تھا۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب فقہ چوتھی صدی ہجری میں مدوّن ہوئے۔ اس کے بعد چاروں مذاہب کی تقلید شخصی شروع ہو گئی، شاہ صاحب عقد الجید میں فرماتے ہیں۔

"جب بجز مذاہب اربعہ دوسرے مذاہب حقہ معدوم ہو گئے تو انہیں چاروں کا اتباع سواد اعظم کا اتباع ٹھہرا۔ اور ان سے نکلنا سواد اعظم سے نکلنا ہوا۔" (ص ۵۳۸)

اسی طرح انصاف صفحہ ۷۰ میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں عوام کے لئے مذہب حنفی کی تقلید کا ترک کرنا حرام ہے ان کی عربی عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"جب ایک عامی انسان علاقہ ہندوستان اور ماوراء النہر میں رہنے والا ہو، جہاں کوئی عالم شافعی اور مالکی اور حنبلی اور ان کی کتب مذہبیہ میسر نہ آسکتی ہوں تو اس پر واجب ہے کہ صرف امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تقلید کرے اور ان کے مذہب سے علیحدہ ہونا اس کے لئے حرام ہے کیونکہ وہ اس وقت شریعت کی رسی ہی اپنی گردن سے اتار کر مہمل بیکار رہ جائے گا۔"

اجتہاد کے بارے میں المصفیٰ میں فرماتے ہیں۔

"بہ یقین معلوم شد کہ طریق اجتہاد و فقہ امروز مسدود است اِلّا از یک وجہ کہ "موطا" را پیش گیرند و وصل مرسل آں و ماخذ اقوال صحابہ و تابعین بہ شناسد۔ و نظر مجتہدانہ اختیار کند و تعقبات شافعی وغیر آں در نظر دارد۔ بعد ازاں جہد کند بعلم احکام الٰہی و یقین یا غالب رائے حاصل کند۔ بدلالت دلائل بر آں مسائل۔"

اس طرح شاہ صاحب تقلید اور اجتہاد دونوں کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اگرچہ تقلید کی بنیاد دوسری صدی کے وسط میں شروع ہوئی اور اس وقت یہ تقلید غیر شخصی تھی البتہ اس کی تکمیل چوتھی صدی میں ہوئی۔

ابوطالب مکّی نے قوت القلوب میں لکھا ہے کہ چوتھی صدی سے پہلے مذاہب اربعہ کی تقلید کا رواج نہ تھا۔ اور لوگ اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہیں کہتے تھے۔ بلکہ وہ ہر مذہب کے عالم سے ضرورت کے مطابق مسائل دریافت کرتے۔ لوگوں میں کچھ اہل حدیث اور کچھ صاحب اجتہاد تھے اور ان میں کچھ مقلّد بھی تھے۔ اگرچہ مقلّدین کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی لیکن وہ تیسری صدی ہجری میں بھی موجود تھے۔ اہل حدیث کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کتاب الٰہی حدیث نبوی اور آثار صحابہ پر عمل کرتے اور اشد ضرورت کے وقت کسی فقیہہ کی طرف رجوع کرتے۔ خواہ وہ فقیہہ مکّی ہوتا یا مدنی، کوفی ہوتا یا بصری اور جو صاحب اجتہاد تھے وہ اجتہاد اور تخریج کرتے۔ اصول اور قواعد کو سامنے رکھ کر ان سے فروعات کا استنباط کرتے۔ اگر ان کے یہ اصول و قواعد کسی امام کے ساتھ مخصوص ہوتے۔ تو لوگ اس مجتہد کو بھی اسی امام کی طرف منسوب کرتے۔ یہ صورت تیسری صدی کے آخر تک قائم رہی اس وقت تک نہ عمل بالحدیث پر کوئی طعن کرتا اور نہ اجتہاد پر الزام دیتا۔ مگر چوتھی صدی ہجری میں حالات دگرگوں ہوگئے سلاطین عباسیہ کے سامنے مناظرے اور مجادلے ہونے لگے۔ ہمسروں پر غالب آنے کے شوق نے لوگوں کے دلوں میں لالچ پیدا کر دیا۔ اور انہوں نے علم کو دنیائی تحصیل کا ذریعہ سمجھنا شروع کر دیا وہ اپنے ائمہ کے اقوال کو مثل کتاب اور سنت کے مستند گردانتے۔ یہاں تک کہ کورانہ تقلید کے جذبے میں لوگ حقائق سے غافل ہوگئے۔ اس طرح فقہ حکمت اور علم کی حقیقت تو جاتی رہی اور مباحثات و مناظرات کا نام استنباط و دقائق شرع رکھا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ جو کوئی علم الکلام کے جاننے والا ہوتا۔ اسے لوگ جامع منقول عالم سمجھتے جیسا کہ امام غزالی احیاء العلوم میں فرماتے ہیں۔

"یعنی جو شخص جھگڑالو اور چرب زبان ہوتا اس کو لوگ عالم جانتے اور جو بیہودہ قصّے بیان کرنے والا اور خرافات بکنے والا ہوتا اس کو سب عالم کہتے۔ غرض اس طرح تقلید جو دوسری صدی میں شروع ہوئی، چوتھی صدی میں پوری ہوگئی۔ اور یہ وہ وقت تھا جب کہ قال اللہ وقال الرسول کی جگہ قال زید و قال عمر رائج ہوگیا۔ اور فقہی امور میں بجائے عقلی دلائل کے نقل سے کام لیا

جانے لگا۔ اور بغیر کسی سند اور قول کے بات نہ بنتی تھی۔ جب قرآن اور سنت میں انہیں اپنے اقوال کے اثبات میں سند نہ ملتی تھی، تو انہوں نے اپنے شیوخ کے اقوال کو بطور سند پیش کرنا شروع کر دیا اور انہی کو حجت گردانا۔ جس طرح موضوع احادیث کو اس زمانہ میں صاحب الشریعت کی طرف منسوب کیا جاتا۔ اسی طرح اس زمانے میں علماء اور فقہا کے اقوال سند میں پیش ہونے لگے۔ نیز فقہا کے قول کی عزت زیادہ کرنے کے لئے اکثر جھوٹی باتیں ان کی طرف منسوب کی جانے لگیں۔ موضوع احادیث کو الگ کر کے علماء نے ان کی موضوعیت کو تو بیان کر دیا۔ لیکن فقہا کے اقوال موضوعہ کو ان کے اقوال صحیحہ سے جدا کرنے پر اس طرح کسی نے توجہ نہ کی۔"

علامہ اقبال مرحوم نے اپنی کتاب تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے خطبہ ششم میں جس کا عنوان "ہیئت اسلامی میں اصول حرکت" ہے، فقہ اسلامی پر بحث کرتے ہوئے تقلید شخصی کا ذکر تو کیا ہے۔ لیکن تقلید غیر شخصی کے متعلق انہوں نے سکوت اختیار کیا ہے وہ اپنے مذکورہ بالا خطبہ میں لکھتے ہیں کہ بعض مغربی مصنفوں نے ترکوں کو تقلید اور جمود کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ لیکن یہ نظریہ بالکل سطحی ہے اس لئے کہ تاریخ اسلام میں ترکی اثر و نفوذ کے کارفرما ہونے سے بہت پہلے فقہی مذاہب مستقل بنیادوں پر قائم ہو چکے تھے۔ اور مسلمانوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ ان کے نزدیک تقلید کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تحریک عقلیت (Rationalism) اسلام میں عہد عباسیہ کے آغاز میں پیدا ہوئی۔ اور اس تحریک نے تلخ اختلافات کو جنم دیا۔ آخری خلفائے عباسیہ کو عقلی آزاد خیالی سے خطرہ محسوس ہوا۔ تو ملک اور قوم کو انتشار سے بچانے کے لئے انہوں نے تمام شریعت اور فقہ کو جامد کر دیا۔

۲۔ مرتاض تصوف کا آغاز اور اس کی ترقی۔ اس نے تدریجی طور پر غیر اسلامی تأثیر کے اثرات کے تحت ایک خالص قیاسی پہلو تعمیر کیا تھا۔ بڑی حد تک تقلید اس طرز عمل کی ذمہ دار ہے۔ تصوف کی عقلی توجیہات میں غیر اسلامی عناصر نفوذ کر چکے تھے۔ لیکن مذہبی حیثیت سے وہ

فقہاء کی دُور از کار موشگافیوں کے خلاف ایک ردِ عمل تھا۔ اس طرح تصوّف عقلیت اور آزاد خیالی کا حامی ہوگیا تھا۔ فقہا کی ظاہر پرستی سے بیزار ہو کر صوفیائے کرام نے ظاہری شریعت کو ترک کر کے تصوف کی راہ اختیار کرلی۔ تصوف کے اس طرز فکر نے اسلام کا معاشری نظام آنکھوں سے اوجھل کردیا اور نفوس عالیہ کو تصوف نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ عوام کی رہبری کے لئے نہایت ہی معمولی قابلیت کے آدمی رہ گئے۔ اب عوام کے لئے تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

۳۔ تیرہویں صدی کے وسط میں بغداد کی تباہی سے کتب خانے تباہ ہوگئے۔ نیز علماء کثرت سے شہید ہوگئے۔ ان حالات میں اجتہاد کو روکا گیا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ ہنگامی طور پر یہ طریق غلط نہ تھا۔ مگر بعد میں تقلید شیوہ ملّت بن گئی اور تباہی کا موجب ہوئی۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں بھی حالات اجتہاد کے لئے سازگار نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان میں فقہ حنفی کی تقلید پر زور دیا۔ تاہم وہ اجتہاد کے خلاف نہ تھے۔



بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دین اسلام کے ضروری اصول و مبادی کا تعلق ہے، مذاہب فقہ میں سے ہر مذہب میں وہ موجود ہیں۔ مزید برآں اگر کوئی شخص فقہ کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا تابع نہ ہو، تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ آپؐ اس شخص سے ناراض ہوں۔ ہاں اس سلسلے میں اگر کوئی ایسی بات ہو، جس سے ملّت میں اختلاف ہو یا اس بنا پر لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں اور ان میں ناچاقی پیدا ہو جائے تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر آپؐ کی ناراضگی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

فیوض الحرمین

سرزمینِ سندھ میں علمِ حدیث[1]

مخدوم امیر احمد

شیخ ابوالحسن ٹھٹوی سندھی ثم مدنی

نام محمد بن صادق سندھی ۱۱۳۵ھ میں ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں تعلیم حاصل کی اور حرمین شریفین کی طرف ہجرت فرما گئے۔ حرمین شریفین کے مشہور علماء شیخ محمد حیات سندھی، شیخ شمس بن عقیلہ، شیخ سالم بن عبداللہ بصری اور عطاء مکی وغیرہم سے استفادہ کیا اور رازی صغیر، فلانی، شیخ شاکر العقاد، حافظ مرتضیٰ زبیدی، امین الدین بن حمید الدین کاکوروی اور شیخ محمد عابد انصاری سندھی جیسے فضلائے وقت آپ کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔

آپ وقت کے امام، علم حدیث کے شیخ اور اجتہاد کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ میں مذہبی تعصب نہ تھا۔ آپ اصولاً حنفی تھے لیکن اگر آپ کو حق اپنے امام کے مذہب کے خلاف دکھائی دیتا تو اپنے امام کے مذہب کو چھوڑ کر حق پر عمل پیرا ہوتے۔ اپنے شاگردوں کو بھی ان فقہی روایات کو جو حدیث نبوی کے موافق ہوں ان کے مخالف روایات پر ترجیح دینے کی ہدایت فرماتے تھے۔ انہوں نے شرح نخبۃ الفکر تصنیف کی ابن الاثیر کی کتاب جامع الاصول کی شرح بھی شروع کی تھی لیکن فقط ایک جلد مکمل کر سکے۔ اپنے استاذ شیخ محمد حیات سندھی کی وفات کے بعد ان کی مسند پر بیٹھ کر حدیث کا درس دیتے رہے۔

---

[1] اس مضمون کی پہلی قسط جولائی کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

آپ بڑے خوشخط تھے اور عادت تھی کہ بخاری شریف نہایت احتیاط سے زیر و زبر کے ساتھ لکھتے جب مکمل ہوجاتی تو لوگ بڑے شوق سے ایک سو ریال تک قیمت ادا کرکے خرید کرتے آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا بخاری شریف کا ایک نسخہ امام یمن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱۸۷ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

شیخ عبداللہ بن محمد سندھی

سرزمین سندھ میں پیدا ہوئے۔ مدینہ شریف ہجرت کرگئے اور وہاں شیخ محمد حیات سندھی کی صحبت اختیار کی۔ چالیس سال تک مدینہ منورہ میں رہ کر درس دیا اور مدینہ منورہ کے طلباان سے فیض یاب ہوتے رہے۔

آپ بڑے صاحب برکت تھے۔ جو طالب علم ان سے کچھ پڑھتا تھا، اس کا انشراحِ صدر ہوجاتا تھا اور کمال حاصل کرلیتا تھا۔ آپ بڑے سخی، صاحب مروت حیادار اور شفیق تھے۔

۱۱۹۷ھ میں مدینہ شریف میں فوت ہوئے۔

شیخ محمد عابد سیوستانی سندھی ثم مدنی

محمد عابد بن احمد علی بن حافظ یعقوب بن محمود انصاری خزرجی۔ آپ میزبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوایوب انصاری خزرجی کے اولاد میں سے ہیں۔ سندھ کے مشہور تاریخی شہر سیون میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان سندھ کا ایک مشہور علمی خاندان تھا۔ آپ کے دادا حافظ یعقوب شیخ الاسلام کے عہدہ پر فائز تھے آپ کے والد احمد علی اور چچا محمد حسین بھی بڑے عالم اور فاضل تھے۔ آپکے چچا محمد حسین شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد تھے۔

شیخ محمد عابد نے اپنے چچا شیخ محمد حسین سے تعلیم حاصل کی اور کمال کے درجہ کو پہنچے۔ آپکے دادا حافظ یعقوب نے آخر عمر میں عربستان کی طرف ہجرت کی اور جدہ میں وفات فرمائی۔ آپکے والد

---

(۱) الجبرتی علی عاش الکاملی ج ۲ ص ۹۲

احمد علی بھی جدہ میں فوت ہوئے اور آپ کے چچا محمد حسین یمن کی طرف گئے اور حدیدہ میں دارالبقا کی طرف راہی ہوتے۔

شیخ محمد عابد نے بھی عمر کا بڑا حصہ یمن کے شہر زبید میں گذارا اور اپنے چچا، نیز زبید اور حجاز کے مشہور علماء سے استفادہ کیا۔ پھر انہوں نے کچھ وقت یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں اقامت اختیار کی اور یمن کے امام کا کامیاب علاج کیا اسی عرصہ میں یمن کے وزیر کی بیٹی سے آپ کا عقد بھی ہوگیا۔ یمن کے امام نے ان کو اپنا سفیر بناکر ہدایا و تحائف دیکر مصر روانہ کیا۔ مصر کا حاکم آپ کے علم و فضل، عقل و ذہانت سے کافی متاثر ہوا۔ آپ کو مدینہ منورہ میں سکونت کا بڑا شوق تھا اور ہمیشہ اپنے پروردگار سے یہی دعا مانگتے رہتے تھے کہ "خدایا میری زندگی اور موت مدینہ میں ہو۔ تیرے محبوب کے سایہ میں زندگی گذرے اور دارالامان میں امان نصیب ہو"۔ ایک دفعہ آپ مدینہ شریف رہنے کے ارادہ سے پہنچے لیکن چونکہ آپ کی طبیعت میں حق گوئی اور راستبازی کی عادت تھی اس لئے وہاں کے لوگوں میں جو بدعات رائج ہوچکی تھیں ان پر ان کو ٹوکنا شروع کیا۔ لوگ آپ کے خلاف ہوگئے اور مجبوراً آپ کو جوارِ حبیبؐ ترک کرنا پڑا۔

اس حق گوئی کی وجہ سے آپ کو یمن میں بھی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ ۱۲۲۴ھ میں جب آپ حدیدہ میں ساکن تھے، اس وقت وہاں کے قاضی سید حسین بن علی الحازمی نے یمن کے زیدی شیعہ امام کو راضی کرنے کے لئے اذان میں "حی علی خیر العمل" بڑھانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ فجر کی اذان سے الصلوٰۃ خیر من النوم کا جملہ نکال دیا جائے کیونکہ یہ جملہ عمر فاروقؓ نے اضافہ کرایا تھا۔ لوگوں نے قاضی کے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا تو قاضی نے شہر کے چالیس سر برآوردہ حنفی علماء کو گردن میں زنجیر ڈال کر قید میں رکھ دیا۔ شیخ محمد عابد بھی ان میں شامل تھے۔ چھ دن تک قید میں رکھ کر دوسروں کو تو اس نے آزاد کردیا لیکن شیخ محمد عابد کو شدید زدوکوب کے بعد حدیدہ سے جلاوطن کردیا۔

اس کے بعد آپ ایک دفعہ پھر اپنے وطن مالوف سندھ واپس آئے اور لواری ضلع

حیدرآباد میں کچھ دن خواجہ محمد زمان لواری کی صحبت میں رہے یہاں سے پھر دیار حبیب کا عشق ان کو کشاں کشاں مدینہ طیبہ لے گئے لیکن اس دفعہ ان کو والیٔ مصر کی حمایت حاصل تھی اس لئے نہایت عزت و احترام کے ساتھ مدینہ منورہ میں رہنے لگے۔ آپ وہاں کے علماء کے سرگروہ تھے اور تازندگی اقامتِ سنت اور محوِ بدعت میں مصروف رہے۔

آپ بڑے عابد و زاہد، نیک سیرت اور خوش اخلاق بزرگ تھے۔ کئی ضخیم اور مختصر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

المواھب اللطیفہ شرح مسند الامام ابی حنیفہ، اس میں آپ نے مسند امام ابی حنیفہ بروایت حصکفی کی نہایت شرح و بسط سے شرح کی ہے۔ مسند کی روایات کے لئے حدیث کی دوسری مشہور و معروف مسانید، جوامع اور سنن سے شواہد و متابعات پیش کی ہیں مشکل الفاظ کی شرح کی ہے، منقطع روایات کا وصل کیا ہے اور مرسل روایتوں کو مرفوع کر کے دکھایا ہے۔ خلافی مسائل پر بحث کر کے ان کے متعلق امام ابو حنیفہ کے دلائل بیان کئے ہیں۔ بہرحال کتاب قابل دید ہے۔ اس کا ایک نسخہ درگاہ شریف پیر جھنڈو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

طوالع الانوار شرح درمختار۔ فقہ کی مشہور کتاب درّ مختار کی شرح ہے۔ اس میں حنفی مذہب کے فروع، واقعات اور فتاویٰ کو انتہائی طور پر جمع کیا ہے۔ شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جو اس کتاب سے باہر ہو۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مدینہ منورہ میں شیخ الاسلام کے کتب خانہ میں اور ایک نسخہ لواری شریف کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

شرح تیسیر الوصول۔ یہ شرح بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھی تھی اور کتاب الحدود تک پہنچے تھے کہ یمن کے بعض بزرگوں نے ان سے یہ مانگی تو ان کو دے دی اور اس کتاب کو کوئی نہ دیکھ سکا

حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب "بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام" کی شرح بھی شروع کی تھی لیکن مکمل نہ کر سکے۔

آپ کے پاس ایک بڑا اچھا کتب خانہ تھا، جس میں تفسیر حدیث اور چاروں فقہی مذاہب کی

عمدہ کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ آپ نے یہ پورا کتب خانہ مدینہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام کے لئے وقف کر دیا۔ مجھے ۱۹۵۲ء میں میرے بزرگ استاد شیخ مالکی مکی نے بتایا کہ مذکورہ بالا کتب خانہ میں شیخ عابد سندھی کا ایک بیاض ہے جو بڑی نادر چیز ہے اور اس پر ان کے دستخط ہیں۔ میں نے اس کے دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن چونکہ مکتبہ شیخ الاسلام مسجد نبوی کی توسیع کے کام کی وجہ سے بند تھا اس لئے میں یہ بیاض نہ دیکھ سکا۔

شیخ محمد عابد مدینہ منورہ میں ۱۹ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ پیر کے دن اس دار فنا کو چھوڑ کر دار بقا کو روانہ ہوئے۔

شیخ محمد عابد کا سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملے گی سندوں کی کتاب ثبت "ہے اس ثبت سے زیادہ صحیح اور جامع آج تک کوئی ثبت نہیں لکھی گئی ہے۔ شیخ نے یہ کتاب ایک ضخیم جلد میں لکھی ہے اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ قسم اول میں تفسیر، حدیث فقہ، معانی، بیان، صرف، نحو، منطق اور طب وغیرہ کی کتابوں کی سندیں لکھی ہیں۔ قسم ثانی میں مسلسل حدیثوں کا ذکر کیا ہے۔ قسم ثالث میں تصوف کے سلسلوں کا بیان ہے۔ یہ کتاب درگاہ شریف پیر جھنڈو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

شیخ کے شاگردوں کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں ان کے شاگرد موجود ہیں۔ آج کل کے مکہ شریف اور مدینہ شریف کے علماء ان کے خوشہ چیں ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں سے چند بزرگوں کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

سید ہاشم بن شیخ حبشی باعلوی مدنی، شیخ حسن حلوانی مدنی۔ عبداللہ بن ادریس سنوسی شیخ جمال بن شیخ عمر مکی مفتی الحنیفہ۔ سید داؤد بن سلیمان بغدادی۔ ابوالمحاسن محمد بن خلیل قاؤقجی طرابلسی۔ شیخ برہان الحق بن شیخ نورالحق انصاری لکھنوی فرنگی محل۔ شیخ علیم الدین بن شیخ رفیع الدین عمری قندھاری حیدرآبادی، علامہ محمد حیدر بن ملا مبین انصاری حیدرآبادی۔ خواجہ محمد زماں لواروی سندھی۔ قاضی ارتضیٰ علی خاں عمری صفوی مدراسی۔ شیخ محمد بن عمر

جامی زادہ مدنی مفتی الحنفیہ بالمدینۃ، استنبول کے شیخ الاسلام شیخ عارف اللہ بن حکمۃ اللہ ترکی اور شیخ عبدالغنی دہلوی عمری وغیرہم۔[1]

اب ہم ان محدثین کا ذکر کرتے ہیں جو سندھ میں پیدا ہوئے۔ سندھ میں تعلیم حاصل کی اور سندھ میں فوت ہوئے ایسے بزرگوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی جا سکتی ہے لیکن ہم مضمون کی تنگ دامانی کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف چند بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں۔

مخدوم بلال ٹلٹی

آپ موضع ٹلٹی ضلع دادو میں سکونت رکھتے تھے، تفسیر اور حدیث میں ماہر تھے۔ زہد و تقویٰ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ لوگوں کو پند و نصیحت کرنا آپ کا وظیفہ تھا۔

ایک بار وہ ٹلٹی سے سلطان العارفین مخدوم شہباز قلندر کے اشارہ پران کی زیارت کے لئے آرہے تھے کہ راستہ میں دریا پار کرنے کے لئے کشتی میں سوار ہو گئے اس اثناء میں جیسا کہ ملاحوں کا دستور ہوتا ہے ایک ملاح نے بعض سواروں کے حق میں فحش اور بیہودہ کلمات استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ یہ آواز مخدوم صاحب کے گوش گزار ہوئی تو انہوں نے اپنی ٹوپی اپنے خادم کو دی جس نے اسے لیکر ملاح کے سر پر رکھ دیا۔ ملاح فی الفور وعظ نصیحت اور آیات قرآنی کی تفسیر بیان کرنے لگا۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ حیران رہ گئے۔ قاضی دِتہ سیوہانی اور مخدوم رکن الدین عرف متو آپ کے شاگردوں میں سے ہیں، آپ کی وفات ۹۲۹ھ میں واقع ہوئی۔

مخدوم بلال بڑے محب وطن تھے جب مرزا شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر حملہ کرکے جام فیروز سے ٹھٹھہ فتح کیا اور جام فیروز نے اس کی اطاعت قبول کرلی تھی اس وقت سندھ کے باشندوں نے دریا خاں کے بیٹے محمود کی قیادت میں ٹلٹی میں شاہ بیگ سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک زبردست لشکر جمع کیا تھا سہتہ اور سوڈھا قبائل کے لوگوں نے کہ جو وہاں موجود تھے

---

[1] فہرس الفہارس ص ۴۵ ص ۲۷۶، الیانع الجنی طبع جید پریس دہلی ص ۹۹ - ۳ ے ۴، حصر الشارد

طے کیا تھا کہ جب تک جان باقی رہے گی جنگ سے ہاتھ نہ اٹھائیں گے، اس وقت کے دوسرے بڑے عالم قاضی قاضن نے جو شاہ بیگ کے طرفدار ہو گئے تھے۔ شاہ بیگ کے کہنے پر چاہا کہ محمود کو اچھی نصیحتوں اور سود مند ہدایتوں سے مخالفت کرنے سے باز رکھ کر اطاعت اور فرمانبرداری کی راہ پر لگائیں لیکن قاضی صاحب کے وہاں پہنچنے پر ان لوگوں نے ان سے ملنا تک گوارا نہ کیا۔ آخرکار شاہ بیگ ٹلٹی کے سامنے آکر خیمہ زن ہوا۔ تین دن بعد ٹلٹی کا ایک شخص شاہ بیگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے حریفوں کے افواج کی حقیقت سے واقف کر کے یہ بھی بتایا کہ لشکر کے قائدین میاں محمود، متن خاں جام سارنگ اور نمل سوڈھا وغیرہ خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آمادہ ہوئے تھے لیکن مخدوم بلال جو اس ملک کے علمائے مشائخ میں سے ہیں انہیں روکے ہوئے ہیں اور آنے نہیں دیتے بلکہ جنگ کی ترغیب دے کر جوش دلا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ فتح حاصل کرنے کے بعد شاہ بیگ نے مخدوم بلال پر سختی کی اور ان پر جرمانہ عائد کیا۔

(میں کہتا ہوں کہ سندھ میں یہ بات مشہور بلکہ متواتر ہے کہ مرزا شاہ بیگ نے مخدوم بلال کو کولھو میں ڈلوا کر سرسوں کی طرح پیڑا تھا۔ اس مجاہد نے یہ عذاب ہنستے ہوئے برداشت کیا اور زبان سے اُف نہیں کی اور جاں جان آفریں کے حوالہ کر دی۔ لیکن یہ روایت کسی تاریخ میں نہیں ملتی)

ان کی وفات ۹۲۹ھ میں واقع ہوئی [1] آپ کا مزار قصبہ باغبان ضلع دادو میں زیارتگاہ خاص و عام ہے

قاضی دتہ سیوھانی

والد کی جانب سے ان کا سلسلہ نسب پانچویں پشت پر قاضی صدرالدین سے جا ملتا ہے، جو پرگنہ خطہ میں قضا کے عہدہ پر مامور تھے۔ کئی بزرگوں کی خدمت میں رہ کر انہوں نے

---

[1] تاریخ معصومی ص۱۱۷ و ۱۱۷ و ۱۹۸ و ۱۹۹ و تحفۃ الکرام ص۱۸۱

تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی مطول تک انہوں نے اپنے والد قاضی شرف الدین عرف مخدوم راہو کی خدمت میں رہ کر استفادہ کیا تھا۔ تفسیر اور حدیث کی تحصیل مخدوم بلال کی خدمت میں رہ کر کی۔ ان کے علاوہ انہوں نے مخدوم فخر بلوتہ اور مخدوم عبدالعزیز ابہری ہروی کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہوکر علوم و فنون کی تکمیل کی تھی۔ ان کو اٹھارہ تفسیریں یاد تھیں جن میں سے بعض انہوں نے درس میں پڑھی تھیں اور بعض کا خود مطالعہ کیا تھا۔ خط ترکی بڑی آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔ علم جفر اور نجوم میں بھی انہیں بڑا دخل تھا۔ سندھ کے حاکم مرزا شاہ حسن اور سندھ کے مورخ میر معصوم بھکری ان کے شاگردوں میں سے تھے مرزا شاہ حسن انہیں اپنے وقت کا امام جاراللہ (زمخشری) کہا کرتے تھے۔

آپ کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں آپ قصبۂ باغبان میں مدفون ہیں۔ ؎۱

مخدوم رکن الدین عرف مخدوم متو ٹھٹوی

حضرت صدیق اکبر کی اولاد اور مخدوم بلال کے خلفا میں سے تھے۔ اکثر اوقات وظائف و عبادات میں مشغول رہتے۔ زہد و تقویٰ کے سالک اور ہدایت و ارشاد کے طالب ان سے انتہائی عقیدہ رکھتے تھے۔ وہ علم حدیث میں اپنے دور میں یگانہ تھے ان کی تصنیفات میں شرح اربعین شرح کیدانی اور بعض دوسرے رسائل مشہور ہیں۔

۹۴۹ھ میں ہمایوں کے عین فترہ کے زمانہ میں ٹھٹھہ میں فوت ہوئے۔ مکلی کے قبرستان میں مدفون ہیں ؎۲

قاضی قاضن بن قاضی ابوسعید بن زین الدین بھکری

ان کے بزرگ سیوھن شہر کے باشندے تھے۔ ان کے جدامجد (نگڑ دادا) ابوالخیر نے

؎۱۔ تحفتہ الکرام ص۱۳۷، تاریخ معصومی ص۱۹۸، ۱۹۹

؎۲۔ تحفتہ الکرام ص۲۱۸، تاریخ معصومی ص۲۰۰

جو صاحب حال و فضیلت تھے، ٹھٹھہ میں آکر سکونت اختیار کی۔

قاضی صاحب زہد و تقویٰ سے آراستہ اور صاحب کشف بزرگ تھے۔ انہیں بہتیرے بزرگوں کی صحبت حاصل تھی۔ قرآن مجید انہیں پورا حفظ تھا۔ اور اس کے ساتھ قرأت اور تجوید بھی بہت خوب جانتے تھے۔ علم حدیث، تفسیر، اصول و فقہ، تصوف اور علوم آلیہ میں کمال دسترس رکھتے تھے۔ انشا میں بھی اپنے عہد میں یگانہ تھے۔ حرمین شریفین کی زیارتوں سے بھی مشرف تھے علاوہ بریں وہ سید محمد جونپوری کے، جو کہ میران مہدی کے لقب سے مشہور ہیں مریدوں اور عقیدتمندوں کے سلسلہ میں داخل تھے۔ اسی وجہ سے عالمانِ شریعت ان پر طنز کیا کرتے تھے۔

وقت کے حاکم مرزا شاہ بیگ و مرزا شاہ حسن ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مرزا شاہ حسن کے دنوں میں وہ بھکر کی قضا کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور شرعی مقدمات کا فیصلہ انتہائی احتیاط اور دیانتداری سے کرتے تھے۔ آخر میں انہوں نے اس عہدہ سے استعفےٰ دیدیا تھا جس کے بعد یہ عہدہ ان کے بھائی قاضی نصر اللہ کے حوالہ ہوا۔

قاضی صاحب کی وفات ۹۵۸ھ میں ہوئی [1]

مخدوم میراں بن مولانا یعقوب ٹھٹوی

صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ میں مشہور اور علم معقول و منقول کے جامع تھے ان کی خدمت میں رہ کر طلبا کے ایک مجمع کثیر نے علم حاصل کیا۔ سندھ کے حاکم مرزا شاہ حسن نے بھی کچھ عرصہ مخدوم کی خدمت میں حاضر رہ کر تعلیم حاصل کی تھی۔

تاریخ وفات ۹۴۹ھ ہے۔

مادہ تاریخ وارث الانبیاء ہے [2]

---

[1] تحفۃ الکرام ص۱۳۷ - ۱۳۸، تاریخ معصومی ص۲، ۲۰۱، ۲۰۲

[2] تاریخ معصومی ص۲۲، تحفۃ الکرام ص۲۱۵

مخدوم جعفر بن مخدوم میراں بوبکائی

سندھ کے مشہور شہر بوبک ضلع دادو میں سکونت رکھتے تھے آپ وقت کے جید عالم اور صاحب تصانیف کے ساتھ ساتھ باطنی کمالات کے جامع بھی تھے۔ سندھ کے مشہور ولی اللہ سہروردی طریقہ کے پیر طریقت مخدوم نوح رحمتہ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے ایک دفعہ مخدوم نوح رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں ان ظاہری آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہوں! اس پر مخدوم جعفر رحمتہ اللہ علیہ نے ان کو کہا کہ جس وقت آپ پر اس قسم کی حالت طاری ہو' اس وقت آپ کسی خادم کو حکم دیں کہ آپ کی ان ظاہری آنکھوں کو بند کردے اگر پھر بھی مشاہدہ کی حالت باقی رہے تو یقیناً آپ کا یہ مشاہدہ ظاہر آنکھ سے نہیں بلکہ باطنی آنکھ سے ہے۔ مخدوم نوح رحمتہ اللہ علیہ نے ایسا کیا اور جب تجربہ کیا کہ ظاہری آنکھ بند ہونے کے بعد مشاہدہ کی حالت قائم رہتی ہے تو فرمایا "اگر جعفر نہ ہوتا تو نوح کافر ہو جاتا۔"

مخدوم جعفر کی تصانیف میں حل العقود فی طلاق المسنود۔ المتانتہ فی مرمتہ الخزانتہ عجالتہ الطالبین مشہور ہیں۔ آپ نے ایک رسالۂ تعلیم' پر لکھا تھا جس کے اکثر نظریے آج بھی قابل عمل ہیں۔

علامہ محمد معین ٹھٹوی

مخدوم محمد معین بن مخدوم محمد امین بن مخدوم طالب اللہ ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے اپنے وقت کے مشہور استاد مخدوم عنایت اللہ ٹھٹوی کی خدمت میں تحصیل علم کی، ابن عربی کی کتاب الفصوص علی رضا درویش سے پڑھی۔ امام الوقت شاہ ولی اللہ دہلی سے بھی استفادہ کیا۔ مکہ شریف کے مفتی عبدالقادر صدیقی سے بھی روایت حدیث کی اجازت حاصل تھی۔ اپنے وقت کے مرشد شیخ ابوالقاسم نقشبندی سے بیعت تھے۔

مخدوم معین کسی معین امام کی تقلید کے قائل نہ تھے انہوں نے تقلید کے ردّ میں ایک معرکتہ الآرا کتاب دراسات اللبیب کے نام سے تصنیف کی تھی۔ آپ نے فقہ، حدیث

منطق، فلسفہ اور تصوف میں کئی چھوٹے چھوٹے رسائل بھی لکھے ہیں لیکن آپ کا صحیح کمال دراسات اللبیب سے ہی ظاہر ہوتا ہے،

مخدوم محمد معین کی وفات ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ ٹھٹھہ کے مشہور مقام مکلی میں مدفون ہیں [۱]

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی

سرگروہ کاملینِ وقت وقدوہ محدثین زماں مجدداداں مخدوم محمد ہاشم بن عبدالغفور بن عبدالرحمٰن ٹھٹوی ۱۱۰۴ھ میں بٹورہ ضلع ٹھٹہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد مخدوم عبدالغفور سے حاصل کی اس کے بعد ٹھٹھ جاکر وہاں کے مشہور عالم مخدوم ضیاءالدین ٹھٹوی کی خدمت میں حدیث و فقہ و دیگر علوم وفنون کی تکمیل کی۔ بعدہٗ حرمین شریفین جاکر مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور مکہ شریف کے مشہور علما اور محدثین مثلاً شیخ عبدالقادر صدیقی۔ شیخ عبد بن علی مصری، شیخ محمد ابی طاہر مدنی اور شیخ علی بن عبدالملک دراوی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ طریقت کا خرقہ سید سعداللہ سورتی سے پہنا جو اپنے وقت کے مرشد کامل تھے۔

آپ نے تین سو سے زائد کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، تجوید، حساب، فلسفہ وغیرہ علوم وفنون پر عربی فارسی اور سندھی میں لکھی ہیں۔ جس میں اکثر ضائع ہوچکی ہیں جو موجود ہیں وہ آپ کی جلالت شان اور تبحر علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں سے حیاۃ القاری باطراف البخاری، فرائض الاسلام، تحفۃ القاری۔ مجمع المقاری ایسی کتابیں ہیں جن کی نظیر شاید ہی کہیں مل سکے۔ آپ کا ایک ثبت بنام اتحاف الاکابر اور اس کا ذیل موجود ہے۔

---

[۱] - مقدمہ علی بذل القوہ فی حوادث سنی النبوہ و مقدمہ دراسات اللبیب و تحفۃ الکرام ص ۱۲۴ و مقالات الشعراء ص ۱۲۱ - ۱۲۹ و ۳۸۴ و ۶۳۶

مخدوم ابوالحسن صغیر ٹھٹوی ثم مدنی، حاجی فقیر اللہ علوی شکارپوری، مخدوم عبداللطیف بن مخدوم محمد ہاشم نامور علما آپ کے شاگرد تھے۔

مخدوم ہاشم کی رحلت ۱۱۷۴ھ میں ہوئی ٹھٹھ شہر میں مکلی کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے راقم الحروف نے آپ کے حالات زندگی آپ کی مصنفہ کتاب بذل القوہ فی حوادث سنی النبوہ کے مقدمہ میں بالتفصیل ذکر کئے ہیں۔

سید حاجی فقیر اللہ علوی شکارپوری

عارف کامل عالم باعمل غوث وقت روتاس ضلع جلال آباد میں پیدا ہوئے افغانستان اور ہندوستان کے علماء سے کسب علم کیا۔ حدیث مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی رحمۃ اللہ علیہ مخدوم محمد حیات ٹھٹوی اور علمائے حرمین سے حاصل کی آپ نے بھی کافی کتابیں تصنیف کیں جن میں قطب الارشاد، براہین النجاۃ، الفتوحات الغیبیہ، الازھار فی ثبوت الآثار وغیرہ مشہور ہیں۔ آپ کی علمی شان صحیح معنوں میں آپ کے مکتوبات سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو آپ کی اولاد میں سے ایک جید عالم سید مہر علی نواز علوی کی سعی و کوشش سے لاہور میں چھپ کر شائع ہوئے تھے۔ اس مجموعہ میں آپ کے ۵۸ مکتوبات ہیں جن میں حدیث تفسیر، فقہ، سیاست، تصوف وغیرہ پر نادر معلومات اور عجیب و غریب تحقیقات مندرج ہے حدیث کے اسناد کے متعلق آپ کا ایک ثبت بھی ہے جس کا نام وثیقۃ الاکابر ہے۔ آپ عربی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔

سید حاجی فقیر اللہ علوی کی وفات ۱۱۹۵ھ میں ہوئی شکارپور کے محلہ ہزاری در میں آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ [1]

خواجہ محمد زماں ولد حاجی عبداللطیف لواری

آپ سندھ کے مشہور پیر اور طریقۂ نقشبندیہ کے شیخ ہیں۔ سندھ پنجاب اور

[1] مقدمہ بذل القوہ فی حوادث سنی النبوہ

راجپوتانہ میں آپ کے ہزاروں مرید ہیں۔

آپ رمضان ۱۱۲۵ھ میں ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے ظاہری علوم کی تکمیل ٹھٹھہ کے مشہور عالم مخدوم محمد صادق کی خدمت میں کی اور تصوف میں خلافت کا خرقہ مخدوم ابوالقاسم نقشبندی ٹھٹوی سے پہنا۔ عام طور پر ان کو پیر طریقت کی حیثیت میں پہچانا جاتا ہے لیکن آپ بڑے پایہ کے محدث بھی تھے۔

مخدوم محمد عابد انصاری جیسے جلیل القدر محدثین آپ کے شاگردوں میں سے ہیں عرب کے علماء تک آپ سے حدیث کی روایت کرتے ہیں۔

ان کی وفات ۴ ذوالقعدہ ۱۱۸۸ھ میں ہوئی اور لواری ضلع حیدرآباد میں آپ کا مزار زیارت گاہ خلائق ہے۔

اس مختصر مقالہ میں ان چند بزرگوں کے مختصر تعارف پر اکتفا کی جاتی ہے اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے برصغیر ہند و پاک میں حدیث کے پہلے علمبردار سندھی بزرگ ہیں



اس ضمن میں تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ شریعتوں کے احکام و قواعد کی تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے اب جو عادتیں بُری ہوتی ہیں ان کو ترک کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور جو عادتیں اچھی ہوتی ہیں، ان کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے، یہی کیفیت "وحی متلو" کی ہے۔ یہ وحی ان الفاظ، کلمات اور اسالیب میں جو خود صاحبِ وحی کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہوتے ہیں، صورت پذیر ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں وحی کی، اور سریانی بولنے والوں کے لئے سریانی میں اور اسی قبیل سے رویائے صالحہ اور سچے خواب ہیں۔ (فیوض الحرمین)

علوم کشفیہ اور شاہ ولی اللہؒ

مولانا محمد عبداللہ عمرپوری[1]

علوم عقلیہ کی طرح علوم کشفیہ و وجدانیہ میں بھی حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کا طریقہ بڑی احتیاط، بہایت سلامت روی، حکیمانہ استنباط و استخراج اور استقامت علی الدین القویم کا پورا حامل ہے، حضرت شاہ صاحب کے نزدیک علوم کشفیہ وہی معتبر ہیں، جو کہ نقل صحیح سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ اور نقل صحیح وہ ہے، جس کا سلسلۂ روایت مخبر صادق و مصدوق اور احسن عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک تک بلا غبار و بلا ریب و شک پہنچتا ہے آپ کے نزدیک نقل صحیح ہی علوم کشفیہ کا اصل مرکز و منبع ہے اور علوم کشفیہ میں سے جو چیز اس کے مخالف ہو، یا اس سے متصادم ہوتی ہو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اسی نقل صحیح کی روشنی میں حضرات صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے اقوال کی تنقیح کی جاتی ہے، اور تحقیق کے بعد ان کے ارشادات نبوی کے مطابق ہونے پر علوم فقہ، تفسیر، تاریخ، معارف، آثار، فتاویٰ اور اقضیہ قابل اعتبار قرار پاتے ہیں، اور ان کا شمار علوم نقلیہ میں کیا جاتا ہے

---

[1] اس سلسلے کا پہلا مضمون "علوم عقلیہ اور خانوادہ ولی اللہی" جولائی کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

مکشوفات اور وجدانیات کے علاوہ مرتبت کے درجات کا تعین صاحبِ کشف کی پاکیزگیِ طبع، صحتِ شعور و وجدان اور بلندیِ فکر سے ہوتا ہے، اور یہ چیز انبیائے علیہم السلام کے بتلائے ہوئے راستے پر چلے اور ان کی ہدایت سے مستفید ہوئے بغیر میسّر نہیں ہوتی، اسی لئے ہمارے نزدیک مکاشفہ و مشاہدہ وہی معتبر ہوگا۔ جو شریعت حقہ کے نقیض نہ ہو۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

بذاتِ خود کشف صحیح ایک حقیقت ثابتہ ہے، جس کا انکار کوئی سلیم الفطرت انسان نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں رویائے صادقہ بھی آتا ہے جو روحانی مشاہدے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس کی اصلیت، واقعیت اور اس سے مترتب ہونے والے آثار کسی سے پوشیدہ نہیں خود انبیا علیہم السلام کی نبوت بھی اس سلسلے کی ایک نہایت کامل اور ترقی یافتہ صلاحیت ہے، جو عالم بالا سے تعلق پیدا کرنے کے بعد وہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کرکے اس عالم اسفل کو نورِ ہدایت سے منور کر دیتی ہے۔ رویائے صادقہ اور روحانی مشاہدہ کے واقعات بکثرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا یہ فیض قیامت تک جاری رہے گا۔ خصوصیت کے ساتھ اس صلاحیتِ روحانی سے اکابر اولیاء اللہ اور صالحین امت کو حصہ وافر عطا ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی ذات سے اس کی ہمت اور قوت کے مطابق عملی زندگی میں اس کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے

شاہ ولی اللہ کا گھرانا ایسے ہی پاکیزہ نفوس بزرگانِ دین اور صالحین امت کا تھا اور اس میں روحانی کمالات نسلاً بعد نسل چلے آتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کو اپنے والد بزرگوار کے واسطے سے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد و اکابر خلفاء حضرت سید آدم بنوری اور حضرت خواجہ عبد اللہ بن حضرت خواجہ باقی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے مزید فیوض روحانی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مزید یہ کہ آپ نے اپنی ان بہم کردہ روحانی صلاحیتوں کو اہل حرمین شریفین کی خدمت عالیہ میں پہنچکر اور تقویت پہنچائی۔ اور حرمین شریفین کی برکات، انوار، فیوضات

اور حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح پُرفتوح سے آپ بلا واسطہ استفادہ کرتے رہے جس کا بیان شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب فیوض الحرمین میں کیا ہے۔ نیز آپ تمام سلاسل ولایت و بیعت کے خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان سب کے اذکار و اشغال کے مراحل طے فرما چکے تھے۔ ان سب امور کا ذکر آپ نے اپنی تصانیف قول جمیل۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ اور ہمعات میں کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے معارفِ تصوف و ولایت کے متبحرین اور اکابر واصلین باللہ کی بلند پایہ کتابوں کا بڑی غائر نظر اور دقّتِ فکر سے مطالعہ کیا تھا۔ اور شیخ محی الدین ابن عربی امام غزالی اور دوسرے اہل سنت کی تصنیفات سے کافی استفادہ فرمایا آپ نے شیخ ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کی طرز پر حضرات انبیاء علیہم السلام کے لطائف روحانیہ عارفانہ انداز میں اپنی کتاب تاویل الاحادیث میں قلم بند کئے ہیں۔ اور اسی قسم کی دوسری کیفیات خصوصی عنوانات کے تحت خیر کثیر، بدور بازغہ، تفہیمات الٰہیہ، اور کلمات طیبات میں بھی ذکر کی ہیں حضرت امام ابو حامد الغزالی کی ایک کتاب معارج القدس ہے شاہ صاحب نے اسی موضوع پر کہ انسان کے روحانی قوائے اور جسمانی لطائف کی کیا کیفیات اور خصوصیات ہیں ان کی تربیت اور تہذیب کے کیا طریقے ہیں اور اس کی تکمیل کے بعد ان کا انسان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اپنی کتاب الطاف القدس لکھی۔ اور بعض دوسری کتابوں میں بھی ان پر روشنی ڈالی ہے۔

الطاف القدس کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان روحانی کمالات کے جھوٹے مدعیوں کے دھوکے سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کے فریب میں نہیں آسکتا۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سنئے ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے راقم السطور مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد علاج کے لئے کراچی میں مقیم تھا کہ حیدرآباد دکن سے ایک ماہر روحانیت کی آمد کا بڑا شہرہ ہوا۔ حکیم علی محمد قادری مرحوم کے دولت کدے پر میری اس شخص سے ملاقات ہوئی اس کا کمال یہ تھا کہ اگرچہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہوتی، لیکن وہ کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر فرفر

پڑھ ڈالتا۔ اور اس میں کوئی غلطی نہ ہوتی۔ لوگوں کا اس شخص کی طرف بے پناہ رجوع تھا اور وہ بڑی فرطِ عقیدت سے اس کے ہاتھ چومتے تھے۔ حالانکہ یہ شخص مطلق دین دار نہ تھا اور اس کے اخلاق بھی اچھے نہ تھے۔ اس قسم کی شعبدہ بازی سے بچنا بہت ضروری ہے۔

حضرت امام غزالی کا ایک رسالہ مشکوٰۃ الانوار ہے۔ اس کے موضوع معارف آیۃ النور (اللہ نور السموات والارض) پر حضرت شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے، آپ کا رسالہ السطعات اسی موضوع پر ہے۔ امام غزالی کے رسالہ ہدایۃ الہدایہ کی طرز پر شاہ صاحب نے قول جمیل اور رسالہ الوصیتہ لکھا۔ نیز آپ نے تصوف وسلوک کے تمام معارف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اس راہ کے ہر مقام کی صحیح قدر وقیمت معین کی اور اپنی کتابوں میں ان امور کی توضیح فرمائی۔ آپ کو فیضان قدرت سے ابداع اور معرفتِ استعدادِ نفوس کے نئے علوم عطا ہوئے۔ ہاں تجلّی، تدلّی، خلق وتدبیر کے معارف میں آپ دوسرے اہل عرفان کے ساتھ مساوی الاقدام ہیں۔ نیز آپ کو تاثیر واجابت دعا کے اسباب الہام کئے گئے نیز آپ پر تاثیراتِ اسمار اللہ تعالیٰ منکشف کی گئیں لمحات، ہوامع، خیر کثیر، تفہیمات الہیہ اور بدور بازغہ میں انہی معارف فائقہ کو قلم بند کیا گیا ہے۔ پھر ان مطالب عالیہ کو قابل فہم بنانے کے لئے قرۃ العینین میں خلاصہ کے طور پر ایک متن مرتب فرمایا۔ جسے ہم الحکمتہ الفائقہ کہہ سکتے ہیں اب اس متن کو آپ مرکز تصور کریں اور علوم ولی اللہیہ کو اس کے گرد پیدا ہونے والے وسیع دائرہ کی قوسیں اور معارف ولی اللہیہ کی مرکزی کتاب حجتہ اللہ البالغہ کو اس مرکز کا قریب ترین دائرہ۔

شکر للہ کہ کند بندۂ خود را تعلیم
گہ بوحی وگہ بالہام گہ بطریق تفہیم
ہر کہ جانش نشود معدنِ اسرار الٰہ
اُو نہ صوفی است نہ ملّا نہ محقق نہ حکیم

(حضرت شاہ عبدالعزیز)

شاہ عبدالعزیز کے ایک شاگرد مولوی عبدالرحیم

ابو سلمان شاہجہاں پوری

مولانا ابوالکلام آزاد بچپن ہی سے ذہین و طباع تھے۔ ان کے اساتذہ ان کی ذہانت پر حیرت زدہ تھے اور مولانا کے اعتراضات سے گھبراتے اور جوابات سے کتراتے تھے۔ ان کی تعلیم کسی درس گاہ میں نہیں ہوئی۔ بلکہ انہوں نے اپنے مکان پر مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ ایک استاد جو حافظ رمضان کے مدرسہ میں مدرس تھے اپنے ساتھ مدرسہ کے چند طلباء کو لے آتے تھے لیکن ہنگام درس جب مولانا آزاد کی ذہانت و طباعی کے مظاہر دیکھے اور ان کے اعتراضات کے سامنے خود کو عاجز و درماندہ پایا تو مدرسہ کے طلباء کو ساتھ لانا چھوڑ دیا۔

مولانا کی ذہانت کا احساس ان کے والد مولانا خیرالدین کو بھی تھا۔ اور اس کی وجہ سے وہ نہ صرف حیران بلکہ پریشان بھی تھے۔ چنانچہ مولانا آزاد کی روایت کے مطابق انہوں نے کئی بار فرمایا تھا۔

"مجھے اس کے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ بہت زیادہ ذہانت انسان کے لئے بسا اوقات گمراہی کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ میں اس کی ذہانت سے ڈرتا ہوں"

اس سلسلے میں وہ بعض اشخاص کے حالات سنایا کرتے تھے جو ذہانت و طباعی کی وجہ سے ہر طرف خیال دوڑانے لگے تھے اور بالآخر دین و دنیا سے کھوئے گئے۔ اس سلسلے میں ایک دن انہوں نے شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک شاگرد مولوی عبدالرحیم گورکھپوری کے حالات سنائے۔ مولوی

عبدالرحیم شاہ اسمعیل شہید کے شریک درس رہ چکے تھے مولانا خیرالدین (مولانا آزاد کے والد) کے نانا مولانا منورالدین جب حضرت شاہ صاحب سے پڑھنا ختم کر چکے تھے تو یہ نئے نئے درس میں شریک ہوئے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنے والد کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے۔

"اُن کی (مولوی عبدالرحیم کی) ذہانت و طباعی کا یہ حال تھا کہ شاہ صاحب کے حلقہ تلامذہ میں جو اس وقت علمی جماعتوں کا خلاصہ و عطر تھا، کوئی شخص ان کی ٹکر کا نہ تھا۔ معقولات کے حافظ تھے اور ہنگام درس ایسے ایسے اعتراضات اور ایسے ایسے نکتے اور پہلو تراشتے تھے کہ شاہ صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

"یہ حال دیکھ کر شاہ صاحب کہا کرتے تھے، مجھے تمہاری ذہانت و طباعی کے پیچھے دہریت کھڑی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دہلی سے کلکتہ آئے اور انگریزوں کی نوکری کرلی۔ پھر ان کو زبان اور علوم کا شوق ہوا، اور چند دنوں کے بعد کھلم کھلا ملحد و دہری ہو گئے۔ خدا کے وجود پر ایک سو سترہ اعتراضات ایسے کئے تھے، جن کی نسبت دعویٰ تھا کہ تمام دنیا کے عقلا بھی اکٹھے ہو جائیں، تو بھی جواب نہیں دے سکتے۔ غرض کہ ذہانت و دانشمندی موجب ہلاکت ہوئی۔ اور سرے سے ایمان و یقین ہی کھو بیٹھے" (آزاد کی کہانی خود اس کی زبانی ص ۳۸۷ مطبوعہ دہلی)

مولانا آزاد نے اپنے والد کی زبانی یہ روایت بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔"

"میں نے بہت جستجو کی، بجز شہرت عام کے کوئی تحریری ثبوت ان کی دہریت کا نہیں ملا۔"

(بحوالہ مذکورۂ بالا ص ۳۸۸)

مولانا آزاد نے اپنے حالات کے سلسلہ بیان میں مولوی عبدالرحیم گورکھپوری المعروف بہ دہری کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ ہم یہاں مولانا ہی کے الفاظ میں ان کی کہانی بیان کئے دیتے ہیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جو آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے راوی ہیں "غدر سے پہلے کی ایک عجیب ہستی" کے زیر عنوان، مولانا کے الفاظ نقل فرماتے ہیں۔

مولوی عبدالرحیم ...... ان لوگوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے غدر سے بہت پہلے محض اپنی رسائی ذہن و فکر سے دنیا کا علمی انقلاب محسوس کیا، اور نئے علوم سے آشنا ہوئے، نیز یورپ کی زبانیں سیکھیں اور اس حد تک قابلیت حاصل کی، جو آج باوجود نئی تعلیم کے عموم و رواج کے کم یاب ہے، عام طور پر یہ "عبدالرحیم دہری" کے نام سے مشہور ہیں، لیکن میں نے بہت جستجو کی، بجز شہرت عام کے کوئی تحریری ثبوت ان کی دہریت کا نہیں ملا۔ معلوم نہیں، صحیح معنوں میں دہری بھی تھے یا یہ بھی لوگوں کی اختراع ہے سلہ مُلّا عبدالقادر بدایونی کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو ابوالفضل، فیضی اور نہیں معلوم اور کتنے عہد اکبری میں بھی دہری تھے، لیکن وہ جیسے دہری تھے،

سلہ۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر صاحب نے ٹیپو سلطان کے خاندان کے بعض افراد کی گمرہی اور خیالات بگڑنے کا ذمہ دار مولوی عبدالرحیم کو قرار دیا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ حقیقت کچھ نہ کچھ ہوگی۔ ممکن ہے ان کی کتابوں میں دہریت کا سراغ نہ لگایا جاسکے لیکن ان کے آزادانہ خیالات اور مذہبی عقائد کے باب میں ان کے استدلال و احتجاج کی نئی شکل سے لوگ واقف ہوں گے۔ پھر سلطان ٹیپو کے خاندان کے بعض بگڑے ہوئے افراد جن کی مولوی عبدالرحیم سے صحبت رہی ہوگی، ان کی آزادانہ روش اور گمراہ کُن خیالات نے مولوی صاحب مرحوم کی بُری شہرت کو اور بھی چمکا دیا ہوگا۔

لیکن خاندان ٹیپو کی گمراہی اور ان کے بگڑنے کی ساری ذمہ داری مولوی عبدالرحیم پر عائد ہوتی ہے۔ اس بارے میں مجھے تردّد ہے۔ مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں۔

ٹیپو سلطان کے خاندان کے بعض افراد کلکتے ہی میں رہتے تھے۔ ان میں سے بعض شہزادوں کے عقائد مولوی عبدالرحیم فلسفی کی صحبت میں بگڑ چکے تھے۔ مولوی عبدالرحیم گورکھپور کے رہنے والے تھے، والد کا نام مصاحب علی تھا۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، اور شاہ رفیع الدین سے تعلیم پائی تھی، پھر فلسفہ و منطق میں توغل کے باعث "دہری" مشہور ہو گئے۔

(سید احمد شہید ص ۲۱۷)

اس کا حال ہمیں معلوم ہے۔

عموماً ایسا ہوا ہے کہ جہاں ایک شخص نے شاہ راہ عام سے باہر قدم اٹھایا، یا مذہبی عقائد کے باب میں استدلال و احتجاج کی کوئی نئی شکل اختیار کی یا اس طرح کا مشرب، جیسا سرسید وغیرہ کا تھا، تو عام طور پر اسے دہریت ہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ معتزلہ کی نسبت بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کئے گئے تھے۔ پس عجب نہیں کہ مولوی عبدالرحیم کا بھی یہی حال ہو، اور عقلیات کے اشتغال و انہماک کی وجہ سے "دہری" مشہور ہو گئے ہوں، یا ممکن ہے اس کی کچھ اصلیت ہو بہر حال ان کی جو تصنیفات پائی جاتی ہیں، ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ [۱]

(مولوی عبدالرحیم دہری) شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں سے ہیں اور مولانا اسمٰعیل شہید کے ہم درس۔ کلکتے میں نیا نیا فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تھا۔ اس میں بحیثیت مدرس کے ملازم ہو گئے، اور ڈاکٹر مارٹن وغیرہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ہندوستان کے یورپین علماء میں بہت ممتاز لوگ تھے اور فارسی کی بھی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے، ان کی صحبت رہی اسی وجہ سے نئے علوم کا بھی شوق ہوا، اور انگریزی اور لاطینی (جو اس وقت یورپ کی کلاسیکل زبان ہونے کی وجہ سے ضروری سمجھی جاتی تھی) سیکھی۔

انگریزی میں ایسی عمدہ استعداد پیدا کر لی تھی کہ مشہور ہے، پردے کی دوسری جانب وہ بٹھا دیئے جاتے تھے اور انگریزی میں تقریر کرتے تھے، اور اس طرف بڑے بڑے قابل انگریز بیٹھے تھے، اور مقرر کی شخصیت کی نسبت دھوکا کھا جاتے۔ سب کہتے کہ یہ یقیناً کوئی انگریز بول رہا ہے ان کا لب و لہجہ اس درجہ فصیح اور مثل اہل زبان کے تھا۔ ساتھ ہی لیٹن بھی ایسی ہی فصاحت سے بولتے تھے۔ عربی، فارسی، ترکی، پشتو اور ہندوستان کی زبانوں میں بھی یہی حال تھا۔

ایک مجلس میں کئی عرب، ایرانی، انگریز، افغانی جمع ہو گئے تھے۔ اس کا حال صاحب

---

[۱] مولانا مہر صاحب نے بھی فلسفہ و منطق میں توغل کے باعث دہری ہونے کی صرف "شہرت" کا ذکر کیا ہے

"تحفۃ العالم" نے لکھا ہے۔ وہ ایک ہی مجلس میں عرب سے بالکل عرب کی طرح، ایرانی سے (یعنی مصنف تحفۃ العالم سے) بالکل ایرانی لب و لہجہ میں، انگریز سے ٹھیک ایک انگریز کی طرح اور افغانی سے ایک افغانی کی طرح باتیں کرتے تھے اور تمام مجلس کا یہ حال تھا کہ نقش تصویر تھی! والد مرحوم (مولانا خیرالدین) بھی نقل کرتے تھے کہ ان کی عربی و فارسی تقریر ایسی فصیح ہوتی تھی کہ شاید ہی کسی ہندوستانی کی ہوگی۔

ریاضی و ہندسے کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ایک بہت ضخیم کتاب ریاضیات میں جدید تقسیم و اضافات کے ساتھ عربی میں لکھی ہے، جو فورٹ ولیم کالج پریس میں چھپی اور میرے پاس موجود ہے، جامع العلوم جامع العلوم اس لئے کہ اس طرح تمام علوم کے ضبط کا ارادہ تھا اور شروع ریاضی سے کیا تھا۔

پرنس اعظم شاہ ابن ٹیپو سلطان کی فرمائش سے جان مارش کلاک کی ہسٹری آف انڈیا کا نہایت ہی فصیح اور بامحاورہ فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور بپٹسٹ مشن پریس میں بڑے اہتمام سے نستعلیق ٹائپ میں چھپی۔ باوجود عربی الفاظ سے اجتناب کے اور انگریزی ترجمے کے، عبارت بڑی چست اور شگفتہ ہے۔ ایک فارسی میں پندنامہ ہے، جس میں گلستاں کے طرز پر چھوٹے چھوٹے بند لکھے ہیں اور عربی الفاظ سے اجتناب کا التزام کیا ہے، یہ بھی چھپ گیا ہے۔

ایک رسالہ عربی میں جر ثقیل پر ہے اور اس میں جدید علم میکانکس کے اصول ضبط کئے ہیں۔ میکانک کی جگہ منجنیق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ ہم نے عبارت کی صحت قرآۃ کے لئے انگریزی کی علامات قرأۃ استعمال کی ہیں۔ پھر پورے پنکچوایشن کو نقل کیا ہے اور میں نے "کاما" کا الٹا استعمال سب سے پہلے اس میں دیکھا۔ بعد کو بمبئی میں منشی غلام محمد نے ایک رسالہ میں یہ صلاح دی اور لکھا کہ واؤ کے اشتباہ سے بچنے کے لئے اسے منقلب کر دینا چاہیئے۔ پھر سر سید مرحوم بھی اس طرح تہذیب الاخلاق میں استعمال کرنے لگے۔

علوم جدیدہ کے داعی

لوگ یہ سنکر تعجب کریں گے کہ سر سید سے بہت پہلے مسلمان علماء میں انگریزی اور

نئے علوم کی ترویج کے کتنے ہی حامی و دُعات گذر چکے ہیں۔ مولوی عبدالرحیم ان سب میں مقدم ہیں۔ ان کا زمانہ تو لارڈ میکالے کا زمانہ ہوگا۔ تقریباً اسی زمانے میں لارڈ میکالے نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی قدیم پالیسی سے اختلاف کیا، اور اپنی مشہور تاریخی یادداشت پیش کی۔ جس میں قدیم شرقی السنہ و علوم کی جگہ انگریزی زبان اور نئے علوم کی ترویج پر زور دیا۔

مجھے ایک رسالہ مولوی عبدالرحیم کا فارسی میں ملا "عرض داشت درباب ترویج زبان انگریزی و علوم فرنگ"۔ یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے۔ جو اس وقت حکام نے تعلیم کے باب میں شائع کیا تھا۔ مقصود اس سے یہ ہوگا کہ جہاں تک ممکن ہو، اہل ہند کی خواہشیں بھی اس باب میں معلوم کی جائیں۔ اس وقت ان مسائل کو کون محسوس کرنے والا تھا؟ لیکن ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں مولوی عبدالرحیم دو شخص کلکتے میں تھے، جنہوں نے اس پر توجہ کی۔ راجہ رام موہن رائے کی عرضداشت بنام لارڈ وارن ہسٹنگز مشہور ہے، لیکن مولوی عبدالرحیم کا حال لوگوں کو معلوم نہیں۔

انہوں نے انگریزی زبان اور نئے علوم کی تحصیل و ترویج کے موضوع پر ایسی جامع بحث کی ہے جیسی کہ اب کی جا سکتی ہے۔ تمام وجوہ و دلائل، جو بعد کی بحث میں آئے، وہ سب اس میں موجود ہیں۔ یہ امید بھی ظاہر کی ہے کہ اب ہندوستان کی قسمت انگریزوں سے وابستہ ہو چکی ہے، اور وہ وقت دور نہیں کہ تمام بقیہ حصص بھی کابل تک انگریزوں کے قبضے میں آجائیں گے۔

ایک عمدہ بات یہ ہے کہ انگریزی کی ضرورت پر صرف علمی حیثیت سے نظر ڈالی ہے اور صرف اس لئے وہ ہندوستانیوں کے لئے اسے ضروری سمجھتے ہیں کہ علوم میں انقلاب ہو چکا ہے۔ علوم قدیمہ اب تحقیقاتِ جدیدہ کے مقابلے میں تقویم پارینہ کا حکم رکھتے ہیں، اور ہندوستانیوں کے لئے بھی ترقی و تقدم کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ ان علوم کی تحصیل کریں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں نے یونانی علوم اپنی زبان میں منتقل کر لئے تھے، لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ اول تو اُس وقت حکومت تھی، جو اب مفقود ہے۔ ثانیاً یونانی علوم

ایک خاص حدتک پہنچ کر اور مدون ہو کر ختم ہو چکے تھے، جن کا انتقال ممکن تھا۔ لیکن یورپ کی تحقیقات جاری ہیں اور محدود ذخیرہ نہیں، جو منتقل کر لیا جا سکے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے بعد سر سید کی یہی سب سے بڑی دلیل انگریزی زبان کی تحصیل و ترویج کے لئے بھی تھی رسالے میں خطاب لارڈ وارن ہسٹنگز سے ہے۔

ان تمام کتابوں میں ایسے ہی حمد و نعت طرح طرح کے اسلوب میں موجود ہیں۔ جیسے کہ قدیم کتابوں کی رسم رہی ہے۔

ایک فارسی مثنوی پرنس اعظم شاہ کی فرمائش پر لکھی ہے، شاہ نامہ کے وزن پر ٹیپو سلطان کا معرکہ نظم کیا ہے۔ اس کا نام "صولت ضیغم" ہے۔ ضیغم اس مناسبت سے کہ لارڈ ڈلہوزی نے ٹیپو سلطان کو دکن کا شیر کہا تھا۔ ایک اور نثر میں بھی خاندان میسور کی تاریخ ملی جس میں حیدر علی کے حالات تفصیل کے ساتھ جمع کئے ہیں اور نہایت اہتمام سے تصاویر تیار کر کے کتاب میں شامل کی گئی ہیں[1]

عجیب لطیفہ

مشہور ہے کہ جب مدراس جاتے ہوئے مولانا اسمٰعیل شہید اور سید صاحب کلکتہ آئے تو مولانا اسمٰعیل نے مولوی عبدالرحیم سے ملنا چاہا۔ اس لئے کہ ان کی "دہریت" کا بڑا غلغلہ

---

[1] مولوی عبدالرحیم کی غالباً یہ وہی کتاب ہے جس کی جانب مولانا آزاد نے مولانا مہر صاحب کے نام ایک خط میں ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"فارسی میں تین کتابیں قابل اعتناء ہیں، لالہ کھیم نرائن کی "فتوحات حیدری" حسین علی کرمانی کی نشان حیدری" اور مولوی عبدالرحیم کی "کارنامہ حیدری"

(نقش آزاد ص ۱۴۴ مکتوب مورخہ ۷ر ستمبر ۱۹۳۷ء)

تھا اور شاہ صاحب کے درس میں یہ مولانا اسمٰعیل کے ہم درس رہ چکے تھے، لیکن باوجود بڑی کوشش واہتمام کے یہ منہ چھپاتے رہے وہ ایک دروازے سے مکان میں داخل ہوں تو یہ پچھواڑے سے فرار کر جائیں۔ معلوم نہیں کہاں تک یہ بات صحیح ہے؟ ڈاکٹر محمد جعفر نے سید صاحب کے حالات میں ایسا ہی لکھا ہے [1]

---

[1] مولانا مہر صاحب کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ شاہ صاحب اور مولوی عبدالرحیم میں گفتگو ہوئی تھی۔ ٹیپو سلطان کے شہزادے" کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"شہزادوں نے محمد قاسم خواجہ سرا کو بھیج کر سید صاحب کو اپنے ہاں بلایا۔ شاہ اسمٰعیل مولوی عبدالرحیم کو جانتے تھے۔ انہوں نے بات چیت کر کے فلسفی (مولوی عبدالرحیم) کا ناطقہ بند کر دیا۔

(سید احمد شہید ص ۲۱۷)

مولانا آزاد نے ڈاکٹر محمد جعفر کے بیان پر نقد و تبصرہ نہیں کیا۔ حقیقتاً مولانا آزاد نے مولوی عبدالرحیم کے بارے میں جو کہا وہ سلسلہ بیان کی ایک چیز تھی۔ اس کی جانب بھی چند الفاظ میں اشارہ کر دیا۔ تحقیق مقصود نہ تھی لیکن یہ بات بھی ایسی ہی ہے جیسا کہ ان کی دہریت کا افسانہ ہے۔ میرے خیال میں اس باب میں مولانا مہر صاحب کا بیان زیادہ مستند ہے۔

میں پچاس سال سے حجۃ اللہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ شروع شروع میں اس کا کچھ حصہ سمجھا تھا اور کچھ حصہ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن جو چیزیں سمجھ گیا تھا، وہ میرے نزدیک محقق تھیں۔ اور جو چیزیں نہیں سمجھ سکا تھا اسے میں نے چھوڑ دیا۔ جوں جوں میری استعداد ترقی کرتی گئی۔ اور میرا مطالعہ بڑھتا گیا، حجۃ اللہ کے جو مشکل مباحث تھے، وہ صاف ہوتے گئے۔ آخر میں جب میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں، تو میں نے حجۃ اللہ کے اصولوں پر سارے قرآن کو حل کیا۔

(فرمودات مولانا عبیداللہ سندھی)

دنیائے اسلام میں تجدید و اصلاح کی تحریکیں

محمد سرور

ہنگری کا مشہور مستشرق، جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس لکھتا ہے۔ "اگر مسلمان علما کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے، تو یورپ ابھی تک جہالت اور نکبت میں پڑا سڑتا۔ کئی طویل صدیوں تک دنیا کی روحانی روشنی اسلامی ممالک ہی سے پھوٹتی رہی اس کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ جہاں یورپ مادی اور معنوی دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا، وہاں مشرق قدیم مذہبی کتابوں کی خشک تاویلات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی اور اس کی قدیم روایات کے حوالے کر دیا کہ وہ گویا اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا۔"

گذشتہ صدیوں میں مشرق کے مقابلے میں یورپ کی اس مادی و معنوی سربلندی میں اگرچہ اُن تاریخی اسباب کا بھی بڑا دخل ہے، جو اہل یورپ کے حق میں پیدا ہو گئے تھے، اور جن کی بدولت انہیں تمام دنیا پر چھا جانے کا موقع مل گیا، مثلاً امریکہ کا انکشاف، مشرق اور مغرب کی تجارت کا مشرق قریب کے خشکی کے راستے کے بجائے سمندری راستوں سے ہونا، اور مشین کی ایجاد۔ لیکن مصنف مذکور کے نزدیک اس کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی اقوام کی فرسودہ ذہنیت بھی ان کے جمود اور معاشی افلاس کا بہت حد تک سبب ہے۔
"...ویں صدی کے بعد سے مشرقی ذہنیت اپنی روائتی قسم کی تربیت کے زیر اثر جامد بن کر رہ گئی"

اس جمود کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دفعہ مصر کے مشہور اہل قلم محمد حسین ہیکل نے لکھا تھا: "جب خلافت اسلامیہ کا نظام شوریٰ سے وراثت میں، مسلمانوں کی نمائندگی کے بجائے ان پر امیر بننے میں، اور ان کے نام سے بات کرنے کے بجائے ان پر استبداد کرنے میں بدل گیا، اور اسے ایسا حق سمجھ لیا گیا، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے، تو وہ دن تھا جب مسلمان فقہا نے افراد کی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے اور اس نظام کی مخالفت کے لئے سزائیں تجویز کیں، اور ان سب کو دین سے منسوب کیا جب انہیں یہ ڈر پیدا ہوا کہ مبادا احساسِ ذات اور شعورِ انسانیت لوگوں کے دلوں میں کہیں ان پابندیوں کے خلاف کوئی حرکت نہ پیدا کرے۔ انہوں نے اجتہاد کا دروازہ ہی سرے سے بند کر دیا اور اپنے مقرر کردہ احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کافر قرار دیا اس کے بعد مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو پر یہ فکری جمود اور ذہنی استبداد مسلّط ہو گیا۔ اور ان کے اکثر علماء ایسی فرضی بحثوں میں الجھ گئے، جن کا عملی زندگی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔[1]"

ہیکل صاحب اپنے اس مضمون میں، جس کا عنوان "الاجتہاد والتقلید" ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں کہ علماء کی ان بحثوں کا سارا زور الفاظ پر ہوتا۔ اور وہ روح سے بالکل خالی ہوتیں اس نے ان میں سے اکثر کو الفاظ کا پرستش کرنے والا بنا دیا۔ اور وہ دین پر ایمان لانے والے نہ رہے وہ مادی صورتوں کے پرستار ہو گئے، اور اللہ کے پرستار نہ رہے، جو مادہ، زمان اور مکان سے منزّہ اور ماورائی ہے، اور یہ نتیجہ تھا تقلید کا، جس نے ذہنوں کو بنجر بنا دیا، اور وہ اس قابل نہ رہے کہ ان بلندیوں تک پہنچ سکیں، جن کا دینِ اسلام متقاضی تھا۔ موصوف کے نزدیک اندھی تقلید خواہ وہ اپنے پہلوؤں کی ہو، یا یورپ کے نئے لوگوں کی، دونوں ایک سی ہیں اور دونوں سے ایک ہی سے نتیجے نکلتے ہیں، یعنی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور انسان میں آزادیٔ فکر

---

[1] ہفت روزہ السیاست ۷، جنوری ۱۹۳۳ء

نہیں رہتی اور آگے کے بجائے ہمیشہ پیچھے کو دیکھتا ہے۔

مسلمانوں کے فکری جمود اور اندھی تقلید کے اس رجحان نے، جس کا آغاز ان کے ہاں سیاسی استبداد سے ہوا تھا، آخر میں مسلمانوں کو اس درجے پر پہنچا دیا کہ جب اٹھارویں صدی میں یورپی اقوام نئے افکار و خیالات سے سرشار ہو کر مشرق کی طرف بڑھی ہیں تو پوری اسلامی دنیا ان کے قدموں میں تھی۔ اور اس کی معاشی لوٹ کھسوٹ میں کوئی بھی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ عین اسی زمانے میں یورپ کے اس سیاسی استیلاد تسلط اور معاشی استحصال کے خلاف دنیائے اسلام میں ردّ عمل ہوتا ہے، اور وہاں مختلف ناموں سے اصلاحی تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ اس ردّ عمل کی روداد ہنگری کے مستشرق جرمانوس کی زبان سے سنئے۔

"لیکن اسلامی دنیا میں یورپ کی یہی دخل اندازی تھی، جس نے آخر کار چیدہ اور منتخب مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے عوام اور مذہب کی خاطر اٹھیں۔ چنانچہ جہاں جہاں یورپی تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کو یورپی افکار سے سابقہ پڑا، وہاں ان کی بیداری نے سب سے زیادہ شورش انگیز صورت اختیار کی.... یہ سمجھتے ہوئے کہ مذہب ہی کے اختلاف نے مسلمان اقوام کو اتنا پیچھے ڈال دیا ہے، وہ اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرنے لگے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کی عظمت کا ذکر کرتے۔ اور اس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے۔"

عہد حاضر میں احیائے اسلام کی یہ تحریکیں تقریباً ایک ہی زمانے میں مختلف ملکوں میں اٹھیں اگرچہ اپنی ظاہری شکل میں یہ ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف تھیں لیکن ان سب کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ صحیح اور حقیقی اسلام کا احیاء ہو تاکہ اس طرح مسلمانوں کو پھر وہ عظمت و سربلندی حاصل ہو، جو تاریخ اسلام کے اوّلیں دور میں انہیں حاصل تھی۔

اِحیائے اسلام کی یہ تحریکیں اگرچہ جرمانوس صاحب کے الفاظ میں یورپ کی دخل اندازی کا نتیجہ تھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی سوتیں بہت پہلے سے عالم اسلام میں پھوٹ چکی تھیں۔

اور ان سے بہت سے ملکوں کے اہل علم کسی نہ کسی حد تک مستفید ہو چکے تھے آخری صدیوں میں اندھی تقلید اور جمود کے خلاف سب سے پہلی آواز امام ابن تیمیہؒ کی تھی ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ "امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں تقلید شخصی رائج ہو گئی تھی۔ ہر بات کا جواب اپنے مذہب اور مسلک کی کتابوں سے دیا جاتا تھا۔ فقہی امور میں تو یہ تقلید جامد ہو گئی تھی...... امام موصوف نے سب سے پہلے یہ طریقہ بدلا مختلف علوم و فنون کا کوئی جزئی سے جزئی مسئلہ کیوں نہ ہو سب سے پہلے وہ قرآن مجید میں اس کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے...... اس کے بعد بہ ترتیب حدیث اور فقہ کے حوالے دیتے تھے ان کے اس نئے طرز تحریر نے علماء کے اندر قرآن مجید اور حدیث نبوی میں تدبر و تفکر کرنے کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیا ان کی تصنیفات سے نہ صرف ان کے زمانے کے علماء کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہوئی بلکہ ان کے بعد سے ہر ایک دور کے علماء کے خیالات اور ان کی تحریروں پر ان کا اثر پڑنے لگا۔ امام ابن تیمیہؒ نے خود بھی قرآن و حدیث کے خوب چرچا کیا اور عام لوگوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلائی، جس سے عام مسلمانوں میں شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے کا ایک خاص احساس پیدا ہو گیا"[۱]

امام ابن تیمیہؒ کی دعوت ان کے قابل شاگردوں اور ان کی کتابوں کے ذریعہ دُور دُور تک پہنچی اور اس نے دنیائے اسلام میں جمود اور اندھی تقلید کے خلاف ایک لہر پیدا کر دی۔ جس سے بہت سے اہل علم متاثر ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی بارہویں صدی کے وسط میں جب مدینہ منورہ پہنچے، تو وہاں بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔ ابن تیمیہ اور ابن القیم دونوں کی کتابیں حضرت شیخ ابراہیم کورانی (متوفی ۱۱۰۱ھ والد شیخ ابوطاہر کردی استاد حدیث شاہ صاحب) کی وسعت نظر و بلندی مشرب کی وجہ سے ان کے مطالعہ

---

[۱] امام ابن تیمیہ از افضل العلماء محمد یوسف کوکنی عمری ایم اے۔ مدراس یونیورسٹی

میں رہ چکی تھیں "اس مطالعہ کی جھلک شاہ صاحب کی کتابوں میں کافی نظر آتی ہے ......" [۱]

اس ضمن میں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ بے شک شاہ صاحب امام ابن تیمیہؒ کی دعوت کتاب وسنت سے متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تصوف و معرفت میں ابن عربی اور مجدد الف ثانی سے بھی اثر لیا اور خاص طور سے اکبری دور میں سرزمین ہندوستان میں عقلیت اور حکمت عملی کو جو فروغ حاصل ہوا تھا انہوں نے اسے بھی ایک حد تک اپنایا۔ اور ان تینوں جہانات کو سمونے کی کوشش کی مصر شام اور جزیرۂ عرب کے مختلف حصوں میں امام ابن تیمیہؒ کے اثرات براہ راست پڑے، اور متشددین کا دائرہ وقت کے ساتھ ساتھ برابر وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پروفیسر محمد ابوزہرہ کے الفاظ میں نجد میں امام محمد بن عبدالوہاب کی دعوت تجدید و اصلاح کے نتیجے میں بارہویں صدی ہجری میں محمد بن سعود نے۔ ابن تیمیہؒ کے مسلک کی تبلیغ واشاعت اور تائید وحمایت کے لئے تلوار میان سے نکالی ... یہ چھوٹی سی مملکت "سعودیہ" افکار ابن تیمیہ پر عمل پیرا ہوگئی۔

چودہویں صدی ہجری کے اوائل میں سید جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید شیخ محمد عبدہ نے مصر میں اپنی اصلاحی تحریک شروع کی، جس کے اثرات ان کے شاگردوں کی بدولت دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں تک پہنچے۔ وہ جمود اور اندھی تقلید کے خلاف تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "اسلام نے علی الاعلان بیان کیا کہ انسان اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ کوئی اس کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچتا پھرے۔ بلکہ اس کی فطرت یہ ہے کہ علم سے کائنات کی نشانیوں سے اور واقعات وحوادث کے آثار سے ہدایت حاصل کرے اور حقیقی معلم وہی ہے جو لوگوں میں تحقیق کے ذوق کو پیدا کر کے انہیں رشد وہدایت کے راستے پر چلائیں۔ مشہور مستشرق گولڈ سیھر نے شیخ محمد عبدہ کی تحریک اصلاح کے تین عوامل بتائے

---

[۱] حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ از محمد ابوزہرہ (اردو ترجمہ)

ہیں۔ ایک امام غزالی کے اخلاقی و مذہبی تصورات۔ دوم تیرہویں صدی عیسوی کے دو موحدین ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ابن القیمؒ الجوزی کے حد سے زیادہ سلفی رجحانات اور سوم زمانۂ حاضر کی ترقی کے مطالبات سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت [۱]

اسی زمانے میں برصغیر پاک و ہند میں سرسیدؒ، دیوبند اور بعد میں مولانا شبلی اور ان کے ندوۃ العلماء کی اصلاحی، تعلیمی اور دینی تحریکیں اٹھیں۔ ترکی میں تنظیمات کے نام سے اصلاحی اقدامات ہوئے اور انڈونیشیا میں شیخ محمد عبدہ کے شاگرد شیخ رشید رضا کے رسالے "المنار" کا اثر پھیلا گویہ سب تحریکیں جمود اور اندھی تقلید کی مخالفت کرتی تھیں اور مسلمانوں کو نئے دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دیتی تھیں لیکن ان سب کا زور اسی پر تھا کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بنیں، اور اسلام میں اس کے طویل عہد زوال میں اِدھر اُدھر کی جو رطب و یابس چیزیں شامل ہو گئی ہیں، ان کا انکار کر کے وہ اصل اسلام کی طرف لوٹیں۔ قدرتی طور پر اس مذہب میں، جو یہ مانتا ہے کہ اس کے پاس ہدایت کا آخری اور مکمل سرچشمہ خدا کی کتاب کی شکل میں موجود ہے۔ اصلاح و تجدید کے معنی یہی ہوں گے کہ اس سرچشمۂ ہدایت کی طرف لوٹا جائے، اور اس سے استفادہ کیا جائے ان تمام اصلاحی تحریکوں میں جو کم و بیش بیسویں صدی کے ربع اوّل تک دنیائے اسلام میں مقبول رہیں۔ یہی رجحان غالب تھا کہ سب کی سب عہد نبوت اور خلافت راشدہ کو ایک مثالی دور سمجھتی تھی، اور ان کے پیش نظر اصلاح سے مراد اسی دور کا احیار تھا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم عوامی جلسوں میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اکثر اس رجحان کا اظہار اپنے اس تاریخی فقرے میں یوں کیا کرتے تھے "بس ایسی اُلٹی زقند لگاؤ کہ جہاں تم تیرہ سو سال پہلے تھے، وہاں پہنچ جاؤ۔"

یہ مختصر سا خاکہ ہے ان اصلاحی تحریکوں کا جو موجودہ تحریکوں سے، جو اِس وقت

---

[۱] اسلام اور تحریک تجدد مصر میں

عالم اسلام میں چل رہی ہیں، پہلے کی ہیں اب مختصراً موجودہ یعنی جدید اصلاحی تحریکوں کا ذکر کیا جاتا ہے ـــــــ آئندہ سطور میں زیادہ تر ایک لبنانی اہل قلم حسن صاب کے انگریزی مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے، جو حال ہی میں مجلہ "اسلامک سٹیڈیز" کراچی کے تازہ شمارے میں چھپا ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلام کو دور حاضر کے جس چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، وہ مغرب یعنی اکثر و بیشتر مغربی یورپ، مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے روس اور امریکہ کی طرف سے تھا۔ اور آج اسلام کو جس چیلنج سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہ کئی اطراف سے ہے۔ یعنی مغرب سے، کمیونسٹ مشرق سے اور کافی حد تک ہندوستان اور افریقہ کی قومیتوں اور ان کی ترقی پسندی (پروگریسیوازم) سے۔ موصوف کے الفاظ میں:۔ "بے شک اسلام ان تمام چیلنجوں پر غالب آیا، جن سے اسے اپنے ابتدائی ادوار میں سابقہ پڑا لیکن آج وہ جس چیلنج سے رُو در رُو ہے۔ وہ ان تمام سے مختلف ہے، جن سے وہ اس سے پہلے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ جہاں تک مغربی استعمار سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کا تعلق ہے۔ اسلام اس میں یقیناً کامیاب رہا ہے اور الجزائر کی جدوجہد آزادی اس کی روشن ترین مثال ہے۔ لیکن سیاسی آزادی کے حصول کے بعد عہد حاضر کے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کی جدوجہد آزاد اسلامی ملکوں میں اب شروع ہو رہی ہے۔ رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے موجودہ مسلمانوں کے اس مرحلے کو جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹنے کا ضرور نام دیا ہوتا۔ یعنی اب تک ان کی جدوجہد دوسروں کے خلاف تھی، اور اب انہیں خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

عہد حاضر کی شکل میں اسلام کو آج جس چیلنج سے سابقہ پڑ رہا ہے، وہ مختصراً مشتمل ہے ایک مختلف نوعیت کے علم کی بے اندازہ طاقت، ایک مختلف نوعیت کی تنظیم اور ایک مختلف طرز زندگی پر۔ اس چیلنج کے ردعمل کے طور پر مسلمانوں میں جو اصلاحی رجحانات پیدا ہوئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ہمارے ہاں جو کچھ تھا، وہ عہد حاضر نے جو کچھ ہمیں دیا ہے، اس سے بہتر ہے۔ اس لئے ہمیں اس مثالی دور کی تجدید کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر میں ٹیکنالوجی میں جو ایجادات ہوئی ہیں، انہیں اپنا لینا چاہیئے۔ یہ مسلک آج سعودی عرب کی ریاست، سنوسیوں، جماعت اسلامی، اخوان المسلمین، حزب التحریر اور دارالاسلام کا ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں جو کچھ تھا، اس میں بعض اچھائیاں ہیں اور عہد حاضر نے جو کچھ دیا ہے، اس میں بھی اچھائیاں ہیں، ہمارا طریقہ اصلاح یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے ہاں کی باقیات صالحات کی تجدید کریں اور اس میں عہد حاضر کی اچھائیاں بھی شامل کرلیں۔ یہ مسلک جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ رضا، علی عبدالرزاق، ابن بادیس اور ان کے متبعین کا ہے، جن میں علمائے دین بھی ہیں، مفکر بھی ہیں اور سیاسی لیڈر بھی۔ عرب دنیا، پاکستان، ایران اور انڈونیشیا کی زیادہ تر قومی جماعتیں کسی نہ کسی حد تک اسی مسلک سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔

۳۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا، خواہ وہ اچھا تھا یا برا، اس کا دور بیت گیا اور عہد حاضر نے جو کچھ دیا ہے، وہ اس پر سبقت لے گیا ہے۔ اس لئے اسے ہمیں آج کلیتہً اپنا لینا چاہیئے باقی رہا مذہب کا سوال، تو یہ ایک شخص کا نجی معاملہ ہے، اور اس میں اسے آزادی ہونی چاہیئے۔ اس مسلک کا سب سے نمایاں علم بردار ترکی شاعر ضیا گوکلپ تھا۔ جس کے افکار نے کمال ازم کی شکل اختیار کی۔ اگرچہ مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین بھی اسی راہ پر چلے، لیکن وہ ایک مقام پر جاکر رک گئے اور اب ان کا نقطۂ نظر کچھ درمیان درمیان ہے۔

اِس کے علاوہ دنیائے اسلام میں ایک اور رجحان بھی ابھر رہا ہے اور وہ مارکسزم کا ہے۔ اس کے پیش نظر اسلام اور قرآن سے قطع نظر کرکے مکمل طور پر تبدیلی لانا ہے۔ اس رجحان کے سوا اس وقت مسلمان ملکوں میں جو بھی اصلاحی تحریکیں چل رہی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی قرآن مجید سے انکار نہیں کیا جا رہا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض مصلحین اس کے

من مانے معنی کرتے ہیں اس کی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، اور جتنی اہمیت اسے دینی چاہیئے نہیں دیتے، لیکن قرآن کا انکار کوئی بھی نہیں کرتا۔

اوپر جن تین مسلکوں کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے پہلے مسلک پر آج پورے عالم اسلام میں صرف سعودی حکومت ہی عمل پیرا ہے۔ اس کے محکمۂ "أمر بالمعروف" کے سربراہ محمد شمل نے قومیت اور اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں ایک جگہ وہ اپنی حکومت کے طرز عمل کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :- اسلام دنیا کا بہترین اصول اور موزوں ترین طریقۂ حیات ہے ... اس ملک میں صرف ایک ہی اصول اور ایک ہی دعوت پیش کی جا سکتی ہے، اور وہ اسلام کا اصول اور دعوت ہے یہ واحد مملکت ہے جو اس زمانے میں خدا تعالیٰ کی توحید، قرآن کے احکام، رسول اکرمؐ کی سنت اور سلف صالح کے نظریات پر قائم ہوئی ہے" اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی مملکت میں کوئی نئی چیز اس وقت تک اختیار نہیں کی جا سکتی، جب تک کہ پہلے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں۔ سنت نبوی اور سلف صالح کے خلاف نہیں۔ یعنی ان کے نقطۂ نظر سے،

دوسرے مسلک والے جس کے علمبردار سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ مصر میں اور سرسید اور ان کے ہم خیال برصغیر میں تھے، اسلام کو دینِ عقل قرار دیتے ہیں، اور ان کے نزدیک جو چیز عقل کے معیار پر پوری اترتی ہے، وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ ان کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور آج سیاسی و انتظامی و معاشی نظم و نسق حکومت کے لئے جو تبدیلیاں ناگزیر ہیں وہ ان کے حق میں تھے، چنانچہ شیخ محمد عبدہ نے بنک کے منافع کو جائز قرار دیا تھا۔

اس مسلک پر چلتے ہوئے آج ایک مسلمان مملکت اپنے ضابطۂ قوانین میں فقہی قانون کے ساتھ ساتھ سیکولر قانون کو شامل کر سکتی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کا آئین اختیار کر سکتی ہے اور اسکے ساتھ یہ صراحت بھی کر دیتی ہے کہ اس کا سربراہ اور صدر مسلمان ہی ہو سکتا ہے آج اکثر عرب ملکوں، پاکستان اور ایران کا اس پر عمل ہے۔ اور اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہ بنے، جو قرآن کی روح کے خلاف ہو۔ اس مسلک کے حامیوں میں سے لبنان کے ایک پروفیسر المحمصانی ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب

"فلسفۂ اصول فقہ اسلامی" میں لکھا ہے "مسلمانوں میں ایسے خلفاء رہنما اور فقیہہ گزرے ہیں جنہوں نے قرآن کے مفہوم کی نئی تعبیر کرنے کی اجازت دی ہے ان کے نزدیک اس نئی تعبیر کے لئے ضروری ہے کہ پہلی تعبیر جن حالات واسباب کی بنا پر ہوئی وہ بدل چکے ہوں۔ اسی طرح مصلحت عامہ اور ضرورت عامہ کے ماتحت بھی قرآن کے مفہوم کی نئی تعبیر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ موصوف کے اس نقطۂ نظر کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان خود قانون ساز کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ کے پابند رہیں، صرف اس کی روح کی پابندی ہونی چاہیئے اسی مسلک کے تتبع میں مصر نے شرعی عدالتوں کو جواب تک وہاں چلی آرہی تھیں، جدید سول عدالتوں میں مدغم کر دیا ہے۔ اور پورے ضابطہ قوانین پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اور تیونس میں ایک نئے قانون کے ذریعہ تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

اب رہا تیسرے مسلک کا معاملہ جس پر کمالی ترک گامزن ہیں، وہ زیادہ سیدھا سادا اور جرأت مندانہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے اجتہاد کا حق جو اسلام کی رو سے مسلمانوں کو حاصل ہے، صحیح حق داروں یعنی عوام کے نمایندوں کو دے دیا ہے اور اب ان پر مشتمل قومی اسمبلی قانون بنانے کی مجاز ہے۔ بعض غیر ترک اہل الرائے نے بھی جن میں علامہ اقبال مرحوم شامل ہیں، اجتہاد کے بارے میں کمالی ترکوں کے اس نقطۂ نظر کی تائید کی ہے اس کے علاوہ انہوں نے اجماع کے یہ معنی لئے ہیں کہ جب ترک قوم کا اپنے ہاں سیکولر نظام حکومت قائم کرنے پر اجماع ہو جاتا ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے قرآن کو ترک کر دیا ہے الغرض آزاد مسلم مملکتوں کو جیسے جیسے اپنے مسلمان عوام کے لئے قانون سازی کرنی پڑ رہی ہے، ان کے ہاں دوسرا اور تیسرا مسلک جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، قریب آتے جا رہے ہیں اور ترکی جیسا سیکولر ملک بھی نئے قوانین اور نئی تبدیلیوں کے جواز کے لئے قرآن و سنت کی نئی تعبیرات سے استمداد کرتا ہے۔

لبنانی مضمون نگار کے الفاظ میں اگر پہلے مسلک کے حامی قدامت پسندوں اور سلفیین کا گروہ عقل واستدلال اور تاریخی تغیر و تبدل کے درمیان صحیح ربط پیدا کرنا سیکھ لے جس کی تلقین

خود قرآن مجید نے کی ہے، تو یہ تینوں مسلک :- ایک قدامت پسندوں کا، دوسرا اعتدال پسندوں کا، اور تیسرا انتہا پسندوں کا۔ ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور سب مل کر قرآن کے بتلائے ہوئے صحیح راستہ پر چل سکتے ہیں۔

دنیائے اسلام میں آج جتنی بھی اصلاحی کوششیں بروئے کار ہیں، سوائے مارکسزم کے متبعین کے، اپنے استدلال میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ ان میں بعض کے استدلال کو خواہ آپ کھُلی تحریف کا نام دیں۔ اور ان کے خلاف علمائے کرام کی غالب اکثریت کفر کا فتویٰ ہی کیوں نہ دے، اب تک کسی مسلمان ملک میں قرآن کے انکار کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اور سیکولر سے سیکولر مسلمان بھی تجدید و اصلاح کے حق میں قرآن ہی سے مدد لیتا ہے البتہ وہ اس کے مفہوم کی نئی تعبیر کرتا ہے۔ یہ رجحان بہت حد تک اسلام اور مسلمانوں کے لئے خوش آئند ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی ضمیر مسلمان رہتے ہوئے دور حاضر کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اور اس کے نزدیک آج کی معاشی اجتماعی اور سیاسی ضرورتیں اسلامی روح کو برقرار رکھتے ہوئے پوری کی جاسکتی ہیں۔ اور جدید بننے کے لئے ضروری نہیں کہ قدیم کا سرے سے انکار ہو۔ بلکہ قدیم اور جدید میں ہم آہنگی پیدا کر کے امت مسلمہ آگے بڑھ سکتی ہے۔

جہاں تک عقائد کا تعلق ہے، اسلام نے توحید، رسالت، انسانیت اور اخلاق عامہ کے بارے میں جو تصورات دیئے ہیں، جب بھی ان کا مقابلہ دوسرے مذاہب کے ان تصورات سے ہوا ہے اسلام ہمیشہ غالب رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بہت کم لوگ اسلام ترک کر کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کو اختیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں پر ایک بڑی ابتلا یورپی اقوام کی سیاسی غلامی تھی، خدا نے کیا اس سے انہیں نجات مل گئی ہے۔ اب ان کے سامنے اپنی معاشی و سماجی پس ماندگی کو دور کرنے کا مسئلہ ہے۔ اور یہ اتنا نظریاتی نہیں، جتنا عملی ہے اور اس صورت حالات نے کہ ایک طرف ان پر مشرق کی طرف سے کمیونسٹ ملکوں کی یلغار ہو رہی ہے اور دوسری طرف امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے ان پر ہلّہ بول دیا ہے۔ اس مسئلے کو اور بھی نازک، پیچیدہ، اہم

اور خطرناک بنا دیا ہے یہ اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے اور یہ چیلنج محض عقائد، نظریات اور ازم کی قسم کا سطحی نہیں، بلکہ یہ افراد اور قوموں کی مجموعی زندگی کو محیط ہے اور اس کا جواب مثبت عمل، نتیجہ خیز عمل اور مجموعی عمل سے ہی دیا جا سکتا ہے۔

لبنانی مضمون نگار کے الفاظ ہیں:۔ "سماج روحانیت سے بے تعلق ہو جائے تو اس کا کچھ بھی حشر ہو سکتا ہے اور اگر روحانیت کی جڑیں سماج میں نہ ہوں، تو وہ بجا طور سے مارکس کی افیون ہو سکتی ہے۔ ہم نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ اسلام ان دونوں کا جامع ہے اور دونوں کو باہم ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ اسلام کی منفرد اور امتیازی خصوصیت ہے، جو اس سے کسی حال میں چھٹنی نہیں چاہیئے۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سماج اور روحانیت کا باہمی تعلق حرکی اور نمو پذیر ہے نہ کہ جامد۔ دنیا کی مادی زبان میں روحانیت کا سرچشمہ انسان بحیثیت فرد کے ہے اور سماج کا سرچشمہ انسان بحیثیت جماعت کے۔"

اور آخر میں بقول مضمون نگار موصوف کے

"آج انسانیت کے روحانی مستقبل کا دارومدار اس پر ہے کہ اس ضمن میں اسلام کدھر جائیگا اور کیا کرے گا۔ اسلام نے اپنی ابتدائی صدیوں میں مغرب کی توحید پرستی اور مشرق کے کائنات ہی کو ذات الٰہ سمجھنے والے عقیدہ وحدت الوجود میں ایک تخلیقی رشتہ پیدا کیا تھا۔ آج ان دونوں اور مادی وحدانیت (MONISM) کے درمیان ایک تخلیقی رشتہ بننے کے لئے اسلام کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی ان صدیوں کی حرکی اور تغیر قبول کرنے والی روح کو آزادی، انصاف اور نظم وضبط کے تخلیقی دوائر میں کار فرما کرے۔"

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار — اقبال

اسرار المحبۃ

شاہ رفیع الدینؒ کی ایک نادر تصنیف

حضرت مصنف کتاب کی ابتدا اس تمہید سے فرماتے ہیں:۔

"سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کمال محبت کے ساتھ، اور درود و سلام پہنچے اس کے حبیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو تمام احباء میں سے سب سے زیادہ محبوب ہیں اور آپؐ کی آل کو اور جو آپؐ کے اصحاب تھے اور جنہوں نے کہ آپؐ کی پیروی کی اور آپؐ سے محبت رکھی۔ بندۂ مسکین محمد رفیع الدین، اللہ اسے اپنے سلف صالحین سے ہم کنار کرے، عرض کرتا ہے:۔

:۔ محبت ایک نیک وصف اور لطیف کیفیت ہے۔ یہ ایک انتہائی وجدانی لذت ہے۔ اس کی نشو و نما محبوب میں کسی ممتاز کمال کے وجود سے ہوتی ہے۔ اس کا اظہار محبّ عاشق کی ذات میں اس کمال کے پُر زور اثر کے امتزاج میں ہوتا ہے۔ اور یہ اس کمال کی معرفت کی بحیثیت اس کمال کے خبر دیتی ہے۔ اگر اسے اپنا صحیح محل و مقام ملے اور جو اس کے اہل و مستحق ہیں۔ وہاں یہ وارد اور اثر انداز ہو تو پھر وہ سبب بنتی ہے قربِ الٰہی کے متعدد مراتب

سلہ حضرت شاہ رفیع الدین کی یہ نادر کتاب پہلی دفعہ زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے، اور اس کا سہرا ادارۂ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ اور مولانا عبدالحمید صاحب سواتی کے سر ہے۔ اس مضمون میں کتاب مذکور پر ایک اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے۔ (مدیر)

ذہن کی صفائی اور تفکر کی عمدگی کا۔ نیز بہت سے اخلاق فاضلہ کے تزکیہ و تہذیب اور تمام اعمال صالح پر عمل پیرا ہونے کا اور اس کی وجہ سے دنیا اور آخرت کے جملہ نفع بخش روابط سے مضبوط رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اور جب اسے اپنا صحیح محل و مقام نہ ملے، اور جو اس کے اہل نہیں، وہاں یہ وارد ہو تو وہ دینی و دنیوی فتنوں کا باعث بنتی ہے۔ اسی بنا پر اس حدیث میں "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو دوست بناتے وقت اس کا خیال رکھنا چاہیئے"۔ متنبہ کیا گیا۔ محبت ہر کمال کے حصول کی شرط اور مقامات فنا و بقاء دارالآخرت میں وسیع و عریض مملکت اور عزت و مرتبے والے دنیوی مناصب تک ترقی کا ذریعہ ہے۔ محبت کے موضوع پر جس کے تسلط میں کہ تمام کے تمام لوگ آتے ہیں، جن گروہوں نے بحث کی ہے، ان میں سے چار گروہ حسب ذیل ہیں"

شاہ رفیع الدین صاحب نے محبت کی اس ابتدائی تعریف کے بعد ان چار گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ان میں سے سب سے مقدم ارباب شرائع ہیں۔ انجیل میں آیا ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسٰی رُوح اللہ سے امتحاناً پوچھا۔ تمہارے نزدیک توراۃ کے کون سے احکام سب سے بلند مرتبہ ہیں حضرت عیسٰیؑ نے جواب میں فرمایا:۔ یہ کہ تم اپنے خدا سے پورے دل کے ساتھ محبت کرو۔ اور جو تم اپنے لئے محبوب رکھتے ہو، وہی اپنے بھائی کے لئے بھی محبوب رکھو۔ اسی طرح حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے مختلف شعبوں، اس کے فوائد اور احکام کے بارے میں متواتر احادیث میں اتنا کچھ آیا ہے کہ اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا گروہ اصحاب تصوف کا ہے۔ اکابر صوفیہ، پہلوؤں اور بعد میں آنیوالے ہر دو سے محبت کے باریک رموز اور نازک معاملات روایت کئے گئے ہیں۔ اس کے احکام کے بیان میں شیخ احمد الغزالی نے "فوایح الجمال" اور شیخ فخرالدین عراقی نے "اللمعات" نام کی خاص طور سے کتابیں لکھیں۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی میں محبت کے دریا ہائے عظیم موجزن ہیں۔ اسی طرح سید علی ہمدانی کی "شرح الخمریہ" میں اسی کا بیان ہے۔ مولائے جامی نے بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ احیاء العلوم

آخر جین العلم میں اس کے متعلق ایک باب ہے۔ "فتوحات" میں محبت، دوستی اور اخوت پر کئی ابواب ہیں۔ "عوارف" میں محبت پر باب ہے، اور اسی طرح اتنا کچھ لوازمہ ہے کہ حد حساب میں نہیں آسکتا۔

"تیسرا گروہ حکما یعنی فلسفیوں کا ہے۔ ان میں سے بوعلی ابن سینا نے عشق پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ صدر شیرازی نے "الاسفار" میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں جو سودادی، دماغی بیماریاں ہو جاتی ہیں، تو وہ محبت کی ردّی اور خراب اقسام میں سے ہیں۔ اور چوتھا گروہ شعراء کا ہے۔ عرب عجم اور ہنود کا۔ ان شعراء نے محبت کے اسرار کی نشر و اشاعت کی اور اس کے متعلق منظوم حکایات لکھیں"

شاہ رفیع الدین صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک عرصہ سے اپنے اصدقاء و احباب سے اس کے متعلق بحث و گفتگو کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۲۱۴ھ میں ایک ایسی تقریب بہم ہوئی کہ مجھے ان بحثوں کو اس کتاب میں مدون کرنے کا موقع ملا۔

اس تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ جو تین اجزاء پر مشتمل ہے پہلے جزو کا عنوان "تحصیل" ہے۔ زیر نظر کتاب کے مقدمہ میں مولانا عبدالحمید سواتی اس کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں۔ "تحصیل" میں محبت کی حقیقت، اس کی اقسام اور اس کے مختلف شعبوں مثلاً محبتِ الٰہیہ، محبت بشریہ اور محبت جامعہ کا ذکر ہے۔ محبت الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں۔ محبت من اللہ اور محبت مع اللہ اسی طرح محبت بشریہ کی دو قسمیں ہیں محبت طبعیہ اور محبت عرضیہ اور تیسرے شعبے محبت جامعہ کی ایک ہی قسم ہے اور وہ محبت مرکبہ ہے اس کے بعد ہر شعبے کی پوری تفصیل و تشریح ہے۔

شاہ صاحب "تحصیل" کا باب یوں شروع کرتے ہیں:۔ ہم پورے یقین کے ساتھ یہ مانتے ہیں کہ محبت ایک قدسی اور غیبی راز ہے۔ یہ ایک عظیم الٰہی شان ہے اور اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی علم، حیات اور قدرت کی صفات کی طرح یہ ایک صفت ہے اور اس کا ظہور تمام مظاہر اور کل کون و مکان میں ہوا ہے۔ آخر یہ کیوں نہ ہو، یہ عالم خود اسی محبت کا ہی تو نتیجہ ہے جیسا کہ وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ پہچانا جاؤں، چنانچہ میں نے یہ کائنات پیدا کی

اب اس کائنات میں خدائے رحمان کی رحمت کے آثار بے شمار ہیں۔ اور قرآن مجید کی آیت "ورحمتی وسعت کل شئی" میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور رحمت محبت ہی کی ایک قسم ہے ایک اور روایت ہے۔ "اللہ تعالیٰ کے ہاں سو رحمتیں ہیں۔ اور اس نے دنیا میں اپنی صرف ایک رحمت نازل کی ہے جس کا اظہار مخلوقات کی آپس کی محبت میں ہوتا ہے اور باقی کی ۹۹ رحمتیں قیامت کے دن کے لئے مخصوص ہیں"۔

الغرض دین اور دنیا اور پوری کائنات میں محبت جس طرح کارفرما ہے اسے "تحصیل" میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایمان جو تمام فضائل کی اصل ہے، وہ بھی اسی کی شدت کا نام ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔ والذین آمنوا اشد حباً للہ۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اس کے ماں باپ، اولاد اور سب لوگوں سے عزیز نہ ہوں۔

"تحصیل" ہی میں ایک مقام پر شاہ صاحب لکھتے ہیں، "عقل کا خاصہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کی طرف پوری توجہ کرتی ہے، تو اس پر اس چیز کے احکام اور اس کی باریکیاں منکشف ہو جاتی ہیں اور قلب کا خاصہ یہ ہے کہ جب وہ سب سے کٹ کر کسی چیز کے لئے ہو جاتا ہے، تو وہ اسی کے رنگ میں رنگا جاتا ہے چنانچہ جب آدمی ذات حق کی طرف پوری ہمت سے متوجہ ہوتا ہے اور اسے تصفیہ میسر ہوتا ہے، تو اس کے ادراک میں قیومیت کی حقیقت جلوہ افروز ہوتی ہے۔ اور وہ قوت فعالہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس حالت میں اس سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے اور جس طرح قوت وہمی بدن میں موثر ہوتی ہے اسی طرح ہیولیٰ اس آدمی سے متاثر ہوتا ہے۔

کتاب کے دوسرے جزو کا عنوان "تذئیل" ہے۔ اس میں محبت کے حقوق کیا ہیں اور طرفین کے لئے محبت کن شرائط کے ساتھ مفید ہو سکتی ہے، ان کا ذکر ہے، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ کفار کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس میں نقص ہوتا ہے۔ اس لئے آخرت میں ان کے لئے زیادہ کارگر ثابت نہ ہوگی۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ جو شخص اولیاء اللہ

کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن ان کی اقتدا نہیں کرتا۔ ایسا شخص اپنے دعوے میں جھوٹا ہے
کتاب کے تیسرے جزو کا عنوان "تفصیل" ہے۔ اس میں "تحصیل" کی بعض مجمل اور مبہم باتوں کی وضاحت
کی گئی ہے۔ اور درجاتِ محبت کی تفصیل ہے۔

مولانا عبدالحمید صاحب نے "اسرار المحبۃ" کی تصحیح واشاعت کے لئے بڑی کاوش کی ہے شاہ صاحب
کی یہ کتاب اب تک غیر مطبوعہ تھی اس کا ایک نسخہ مولانا عبدالحمید صاحب کو مجلس علمی کراچی سے ملا۔
اس کا مقابلہ موصوف نے ایک اور نسخہ سے کیا۔ جو انہیں مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم سے ملا تھا
اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں "ہم سے جہاں تک ہو سکا، مجلس علمی کراچی کے نسخے اور مولوی محمد شفیع صاحب
مرحوم کے ذاتی نسخے کو سامنے رکھ کر دونوں کا تقابل کیا اور بعض مقامات پر اپنی دانست کے مطابق
اغلاط کی درستگی اور تصحیح کر دی ....." یہ کام بڑی محنت اور توجہ چاہتا تھا جس کے لئے غیر
معمولی خلوص و للّٰہیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ خانوادہ ولی اللہی کے افکار
تعلیمات اور ان کی تصنیفات سے مولانا عبدالحمید صاحب کو ذاتی لگن اور دلی شغف ہے اور ان کی
اشاعت میں کوئی تکلیف ان کے لئے تکلیف نہیں۔ اس سے پہلے ان کے اہتمام میں شاہ رفیع الدین صاحب
کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اسرار المحبۃ تیسری کتاب ہے اور شاہ صاحب کی تکمیل الاذہان
زیر طباعت ہے۔ اللّٰھم زد فزد

زیر نظر کتاب کے ناشرین اور خود مولانا عبدالحمید سے ہمیں ایک شکایت ہے اور یہی شکایت
ہم ان سے پہلے بھی کر چکے ہیں، شاہ رفیع الدین کی پہلی کتابوں کی طرح اسرار المحبۃ بھی نستعلیق میں چھپی
ہے۔ گو خط بڑا اچھا ہے، لیکن ناشرین جہاں اتنا خرچ برداشت کرتے ہیں، وہاں وہ تھوڑا سا اور
خرچ برداشت کر کے اگر انہیں نسخ میں چھاپیں تو ایک تو ان کا مطالعہ زیادہ آسان ہو اور دوسرے
ان کتابوں کو عربی ملکوں میں برآمد کیا جا سکتا ہے۔ خانوادہ ولی اللہی کی علمی وراثت کو عام کرنے کی
مدرسہ نصرۃ العلوم نے جو خدمت ذمے لے لی ہے، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اور اس
سلسلے میں مولانا عبدالحمید سواتی کی ہمت، کوشش اور لگن قابل داد ہے۔ خدا تعالیٰ اس ادارے

اور اس کے کارکنوں کے ارادوں کو برکت دے۔

کتاب کے آخر میں شیخ ابن سینا کا وہ مشہور قصیدہ بھی شامل کر دیا گیا ہے، جس کے جواب میں حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے قصیدہ لکھا تھا۔ نیز مصر کے مشہور شاعر امیر الشعراء شوقی نے ابن سینا کے اسی قصیدے پر ایک قصیدہ لکھا تھا وہ بھی کتاب میں درج کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ کتاب میں شاہ رفیع الدین کے دو قصیدے اور ہیں۔ ایک میں اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ کے ایک قصیدے کی جو "حقیقت النفس" کے متعلق ہے تخمیس ہے، اور دوسرا معراج النبیؐ پر ہے

ابن سینا کے قصیدے کے کل ۱۲۱ ابیات ہیں۔ ان میں وہ کہتا ہے کہ روح محل ارفع سے اتری اس دنیا میں آئی۔ اسے یہاں مختلف حالات سے گزرنا پڑا۔ اور اس دوران میں اسے برابر اس محل ارفع کی یاد ستاتی رہی۔ آخر وہ پھر واپس گئی یہاں ابن سینا سوال کرتا ہے۔

فلای شئ اهبطت من مرتفع — سام الی القعر الحضیض و ضع

آخر وہ مقام بلند سے اس ذلیل پستی میں اتری کیوں۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ اگر اللہ نے اسے کسی حکمت کی بنا پر اتارا تھا کہ وہ ذہین اور عقلمند آدمی سے بھی مخفی ہے۔ یا اس کا اترنا اس لئے ضروری تھا کہ جو کچھ اس نے نہیں سنا تھا، وہ اسے سن لے اور وہ عالم کی ہر خفیہ چیز سے باخبر ہو کر لوٹے، تو اس کی مراد پوری نہیں ہوئی۔

شاہ رفیع الدین صاحب نے ابن سینا کے اس قصیدے کا جواب اسی ردیف اور قافیے میں کوئی ۲۴۰ ابیات میں دیا ہے، جن میں اس "فیلسوف المعی" کو جس کی آنکھوں سے شریعت کا روشن راستہ مخفی تھا، روح کے اس دنیا میں آنے اور پھر واپس جانے کی حکمت بتائی ہے اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے دو تین ابیات کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

اگر تم نفس کی زندگی اور موت سے واقف ہوتے اور جس طرف یہ سرعت سے لوٹتا ہے وہ تمہیں معلوم ہوتا تو تم جانتے کہ نفس جسم میں داخل ہونے سے پہلے ایک ایسے بیج کی طرح ہے، جو ابھی بویا نہیں گیا۔ اور بیج کی مختلف قسمیں اور مختلف اوصاف ہوتے ہیں۔ اس کے

پھل جدا جدا ہوتے ہیں اور اس کی صنفیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس کی تمام قوتیں اس کے اندر مخفی ہوتی ہیں، اور اس کا شعور مجمل ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحمید سواتی صاحب کی یہ تصحیح شدہ کتاب ادارہ نشر و اشاعت نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے چھاپی ہے۔ دو روپے پچاس پیسے اس کی قیمت ہے۔ اور ادارہ مذکور کے ناظم یا ماسٹر الہ دین ناظم انجمن اسلامیہ گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ سے مل سکتی ہے۔



تنقید و تبصرہ

اسلامی نظریۂ حیات

مولفہ خورشید احمد لیکچرار کراچی یونیورسٹی
ناشر شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی

جہاں تک اسلام کی فکری و نظریاتی بنیادوں کا تعلق ہے کراچی یونیورسٹی مستحق مبارک باد ہے کہ اس نے اس موضوع پر یہ کتاب شائع کی، جو صرف جامعات اور کالجوں کے نوجوان طالب علموں کو اسلام کے ان پہلوؤں کے متعلق وہ سب معلومات فراہم کرے گی جن کی انہیں آج سخت ضرورت ہے، بلکہ ملک کے عام تعلیم یافتہ اردو داں حضرات بھی استفادہ کر سکیں گے مؤلف نے مضامین کے انتخاب میں غیر معمولی حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ اسلام کے بارے میں ان سب مباحث پر اصحاب علم و فکر کے آراء و افکار آجائیں۔ جو آج کل علمی و تعلیمی حلقوں کے موضوع بنے ہوئے ہیں اور ان کے متعلق اکثر بحثیں ہوتی ہیں۔

"اسلامی نظریۂ حیات" کے مندرجات دینی و علمی لحاظ سے تو ایمان افروز، خیال پرور اور مفید ہیں ہی، نیز ان میں تنوع اور جامعیت دونوں ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی اپنی ایک ادبی حیثیت بھی ہے اور قاری اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ گویا ایک ادبی کتاب پڑھ رہا ہے۔ تمام مندرجات کا اسلوب بیان اور زبان ادبی چاشنی لئے ہوئے ہے اور ان میں بڑی روانی ہے۔ غرض یہ کتاب دینی حس کی بھی تسکین کرتی ہے اور اس میں ادبی حس کی تسکین کا پورا اہتمام ہے۔

خورشید صاحب نے کتاب کا آغاز اسلام کی اس تعریف سے کیا ہے۔

> اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں ہے، جو صرف انسان کی نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو۔ اور جس کا کل سرمایۂ حیات کچھ عبادات، چند افکار اور چند رسوم پر مشتمل ہو بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو خدا اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی صورت گری کرتا ہے۔ اور زندگی کے ہر پہلو کو خدا کے نور سے منور کرتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو

یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو سیاسی اور ملکی ہو یا بین الاقوامی۔ اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری وساری ہو اور دل کی دنیا سے لیکر تہذیب و تمدن کے ہر گوشے تک خالق حقیقی کی مرضی پوری ہو۔"

مرتب نے مذکورہ بالا الفاظ میں اسلام کی جو تعریف کی ہے، کتاب کے تمام مندرجات دراصل اسی جامع تعریف کی تفسیر ہیں اور ہر صاحب قلم نے اسی نقطۂ نظر سے اسلام کے کسی نہ کسی پہلو پر بحث کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بحث کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں جن جن شکوک و شبہات کا ان دنوں اظہار ہوتا ہے۔ ان کا جواب دیا ہے۔

جہاں تک مذہب کی ضرورت' مذاہب عالم میں اسلام کی برتری۔ اور اس ضمن میں اسلام کے تصور زندگی۔ "اسلامی نظریۂ حیات کی بنیادی خصوصیات"۔ اسلام کے بنیادی عقائد" توحید" رسالت" اسوۂ حسنہ" عقیدۂ آخرت" اور اسلامی تصور عبادت" اور اسلامی عبادات کے مباحث کا تعلق ہے، کوئی منصف مزاج غیر مسلم اور تعصب سے خالی مسلمان ان کے مندرجات کی افادیت اور حقانیت سے انکار نہیں کر سکے گا۔ اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے "دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب" کے باب میں تہذیب جدید اور اس کے معانی و مقاصد و مظاہر پر جس عالمانہ و محققانہ اور موثر طریقے سے کڑی تنقید کی ہے اسے پڑھنے کے بعد اگر کسی کے ذہن میں اشتمالیت یا مغربی جمہوریت کے لئے کوئی وجہ کشش ہوگی، تو اسے لامحالہ اپنے مزعومات پر نظر ثانی کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ "اسلامی نظریۂ حیات" کی برتری کو مانے۔

مرتب کے الفاظ میں یہ سب تھی "اسلام کی علمی اور فکری بنیادوں اور دور حاضر کے پیدا کردہ مسائل پر گفتگو" جس کا ماحصل موصوف کے الفاظ میں یہ ہے "کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت صحت مند نظریۂ حیات ہے۔ مذہب سے انحراف کی جتنی راہیں بھی انسان نے اختیار کی ہیں، بالآخر وہ سب غلط اور تباہ کن ثابت ہوئی ہیں عقلی تجزیہ اور تاریخی تجربہ دونوں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ مذہب کے بغیر زندگی حقیقی کامیابی، سکون و اطمینان اور امن و امان سے مالا مال نہیں ہو سکتی۔ اور وہ مذہب جو اپنی حقیقی شکل میں محفوظ ہے اور جو زندگی کے تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے اسلام ہے" اس کے بعد مسئلہ آتا ہے "اسلامی نظام حیات" کا جس پر کتاب کے حصہ سوم میں بحث ہے۔ اس کی تمہید میں خورشید صاحب لکھتے ہیں "اسلام زندگی کا جو نقشہ تجویز کرتا ہے، وہ محض انسانی عقل اور تجربہ کی روشنی میں ترتیب نہیں پاتا، بلکہ ابتدائی اور اصلی رہنمائی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور ان کی روشنی میں عقل اور تجربہ کی مدد سے زندگی کا تمام نظام قائم کیا جاتا ہے۔"

غرض اسلام کی روسے زندگی کا جو نقشہ تجویز ہوگا، گو اس کے لئے ابتدائی اور اولین رہنمائی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ہی حاصل کرنا ہوگی، لیکن جیسا کہ خورشید صاحب نے لکھا ہے اس میں انسانی عقل اور تجربہ سے مدد لینا پڑے گی اور وہ اس لئے کہ

> قرآن جزئیات کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اصول اور کلیات کی کتاب ہے، اس کا اصل کام یہ ہے کہ بنیادی چیزوں کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرے، لیکن وہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے مطابق تفصیلی ضابطے اور قوانین نہیں بناتا۔ بلکہ وہ ہر شعبہ زندگی کے حدود اربعہ بنا دیتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۹)

"قرآن کے بعد سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے۔۔۔ سنت اپنی اصل حیثیت سے قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی توضیح و تفسیر ہے" لیکن اسلامی زندگی کے نقشے کی تجویز کے سلسلے میں "اجتہاد" کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جس کے ماتحت براہ راست کتاب و سنت کے نصوص سے حکم معلوم کرنے کے بجائے کوشش کر کے کتاب و سنت کے اشارات سے ایک حکم معین کرنا پڑتا ہے اس ضمن میں مولف کے نزدیک "اجتہاد" کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ کتاب کے اس اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

"اجتہاد کی ضرورت انسانی زندگی میں مسلّم ہے۔ کیونکہ زندگی برابر نت نئے مسائل سے دوچار رہتی ہے۔ ان مسائل کا حل اگر شریعت سے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی جائے، تو ہماری زندگی کا ربط شریعت سے ٹوٹ جائیگا۔ اور اس کو کوئی مسلمان اسلام پر قائم رہتے ہوئے گوارا نہیں کرسکتا۔ ہماری روحانی و ایمانی زندگی کے لئے اس سے کہیں زیادہ ضرورت "اجتہاد" کی ہے جتنی ہماری مادی زندگی کے قیام و بقا کے لئے ہوا اور پانی کی ہے۔"

زیر نظر کتاب میں خورشید صاحب نے مثال کے طور سے "اسلام کا جو سیاسی نظام" پیش کیا ہے ظاہر ہے وہ اجتہاد ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ سیاسی زندگی کے یہ مسائل اس دور کے ہیں اور ان کے بارے میں "عقل اور تجربہ کی روشنی" ہی میں احکام معین کئے گئے ہیں، گو اس ضمن میں یہ مان لیا جاسکتا ہے "ابتدائی اور اولین رہنمائی ضرور خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت" سے حاصل کی گئی ہوگی۔ لیکن احکام کی یہ معین صورت اجتہاد ہی کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا یہی باب ہمارے نزدیک محل نظر ہے اور اس میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی دینی حیثیت کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مرتب کا اپنے اس مجوزہ سیاسی نظام کو "اسلام کا سیاسی نظام" کہنا ٹھیک نہیں مثلاً صفحہ ۴۰۶ پر ارشاد ہوتا ہے "اسلامی ریاست کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے اس ریاست کی بنیاد نہ نسل پر ہے اور نہ رنگ پر، نہ زبان پر ہے اور نہ وطن پر۔ نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی الحاق" یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ آیا اس عالم آب وگل میں اس طرح کی ریاست عملاً وجود پذیر ہو سکتی ہے؟ اور خود مؤلف نے اسی باب کے شروع میں جس سے یہ عبارت لی گئی ہے، ریاست کی تعریف یوں کی ہے۔ "ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے، جس کے ذریعہ ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے مؤلف کو شاید خود یہ تضاد کھٹکا ہے چنانچہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد ہی وہ فرماتے ہیں کہ "ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لئے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے۔" غرض یہ ہے کہ اسی کو تو عام اصطلاح میں وطن کہتے ہیں ایک ملک یا وطن کے بغیر ایک ریاست کا تصور ایسا ہی ہے، جیسے کہ ایک انسان کا جسم کے بغیر تصور ہو۔ بے شک ایک ریاست ایک معین ملک اور وطن رکھتے ہوئے ایک نظریاتی و اصولی ریاست ہو سکتی ہے، جیسے ایک شخص ایک شہر، ایک صوبے اور ایک ملک کا باشندہ ہوتے ہوئے بین الاقوامیت اور انسانیت عامہ کا حامل ہو سکتا ہے اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اور ہم بیک وقت پاکستانی بھی ہو سکتے ہیں اور مسلمان بھی۔

آگے چل کر مؤلف "سیکولرزم" کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ "یہ اس نظام کو کہتے ہیں، جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو، لیکن اگر مزید تجزیہ کیا جائے تو بات یہاں آجاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کا داعی ہے۔" اس پر بڑی تفصیل سے بحث کرنے کے بعد ٹیپ کا بند یہ آتا ہے۔

"آج کی دنیا میں سیکولرزم کے لئے کوئی گنجائش نہیں، تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو سیکولرزم کی عین ضد ہے، اور جسے اسلام قائم کرنے کا داعی ہے۔"

شاید خورشید صاحب کو معلوم ہو کہ کیتھولک اسپین کی طرح آج کئی مسلمان ملک بھی ایسے ہیں، جہاں سیاسی اور ریاستی معاملات میں "مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری" نہیں۔ اور اس نام سے ایک مخصوص مذہبی فرقے کے عقائد کے مطابق کاروبارِ حکومت چلایا جاتا ہے۔ اِس دور میں اگر موصوف "مذہبی اور نظریاتی جانب داری" کو حکومت میں کارفرما کریں گے تو عملاً وہی ہوگا، جو ان مسلمان ملکوں میں ہو رہا ہے۔ کہیں "اثنا عشریہ" نظریۂ اسلام کی حکومت ہوگی، اور کہیں حنبلی طریقۂ فقہ کی۔ اسی طرح صفحہ ۲۱۴ پر ارشاد ہوتا ہے:۔ "اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ موروثی شہنشاہیت کو۔ اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نیز اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ، نسل، نسب کسی کی بنیاد پر کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں" گویا خیال، نظریہ اور عقیدہ کی بنا پر تفوق حاصل

ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ایسی ریاست کو کوئی جمہوری نہیں کہے گا۔ اس قسم کا نظام آمرانہ ہی ہوتا ہے۔ جسے آپ نظریاتی آمریت کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ اس نظام میں تمام انسان برابر ہوتے ہیں "

آج اس دور میں قومیت کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ کیونکہ زندگی کے ہر موڑ پر، سرکاری ملازمت کے سلسلے میں، کوئی کاروبار شروع کرتے وقت، یا پاسپورٹ لے کر اپنے ملک سے باہر دوسرے ملکوں میں جاتے ہوئے قومیت کا سوال پوچھا جاتا ہے۔ اور عام طور سے ایک شخص کی قومیت کا تعین اس کے وطن سے ہوتا ہے۔ ایک انڈونیشی خواہ وہ لاکھ مارکس، لینن اور اشتمالیت کو ماننے والا ہو، اس کی قومیت انڈونیشی ہی رہے گی۔ وہ اشتمالی ہونے کی بنا پر روسی یا چینی یا اشتمالی قومیت کا حامل نہیں ہو سکے گا۔ یہ زندگی کی عملی ضرورتوں کا تقاضا ہے اور ہمیشہ سے اسے ملحوظ رکھا جا رہا ہے لیکن خورشید صاحب کے نزدیک نسل، رنگ، زبان یا وطن کو قومیت کی اساس بنانا غیر عقلی اور غیر فطری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

" اسلام ان سب کے مقابلے میں ایک انقلابی پیغام دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے اور اپنی قومیت کی بنیاد خود اسلام پر رکھتا ہے جو ایک عالمگیر نظریہ ہے "

اسلام بے شک ایک عالمگیر نظریہ ہے، لیکن جب اسے ایک ایک وطن اور علاقے کے مسلمان اپنائیں گے تو یہاں کی رجہ سے ان کی ایک مخصوص اور معین قومیت وجود میں نہیں آئے گی، اور وہ مسلمان ہوتے ہوئے پاکستانی ترکی ایرانی قومیت کے افراد نہیں ہوں گے۔ اور کیا ایک شخص کے مسلمان ہونے پر اس کی قومیت کی نفی ہو جاتی ہے ؟

مرتب نے اسلام کے اصول و مبادی اور افکار و تصورات پر اتنا مفید اور روح پرور مواد فراہم کرنے کے بعد اس سے عملی زندگی کے لئے جو نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان سے سوائے اس کے کہ تخیل کی تسکین ہو جائے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسلام کے نام سے ایک فرضی ریاست، ایک فرضی سیاسی نظام اور ایک فرضی قومیت کی دعوت سے موجودہ انتشار بڑھے گا، کم نہیں ہوگا۔ اور جس مقصد سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس سے یقیناً الٹا نتیجہ نکلے گا۔

ہمارے ائمہ اور فقہا نے مسائل مذہبی میں اجتہاد کے لئے بڑی کڑی شرطیں لگائی تھیں لیکن اس زمانے میں اسلام کے سیاسی، معاشی و معاشرتی نظام کے متعلق اجتہاد کے دروازے جو پہلے کھلے ہیں چنانچہ جس کا جی چاہتا ہے، وہ اسلام کے نام سے کبھی جمہوریت کو کفر، کبھی اسے عین اسلام اور کبھی غیر محدود ملکیت کو خدا اور رسول کا حکم اور کبھی اس کی تحدید کو جائز قرار دے دیتا ہے۔ بدقسمتی سے کراچی یونیورسٹی کی اس کتاب میں جو بحیثیت

مجموعی ایک مفید کتاب ہے "اسلام کا سیاسی نظام" کے باب میں اس قسم کے اجتہاد کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ جو ایک درسی کتاب میں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ تعلیمی اداروں اور بالخصوص یونیورسٹیوں میں ان مسائل پر ایک خاص مکتب خیال کے افکار کی اشاعت جو وقتی اور حزبی سیاست اور مخصوص جماعتی اغراض سے متعلق ہوں ہمارے نزدیک زیادہ سود مند نہیں۔ اور یوں بھی خیال آرائیاں شعر و شاعری کا حسن ہے سیاسی و معاشی نظاموں کی بنیاد ٹھوس حقائق ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں

(م۔ س)

شاہ ولی اللہ صاحب کے دلائل میں مابعد الطبیعاتی رجحانات کے ساتھ ساتھ مشاہدات اور تجربات کو بھی خاص دخل ہے۔ ان کی دلیلیں استقرائی اور استخراجی دونوں ہیں۔ گویا کہ وہ مشائی اور اشراقی مکاتیب فکر کے سنگم ہیں مثلاً وہ انسانی اجتماعی اداروں کے متعلق غور و خوض کرنے کے لئے استقرائی دلائل دیتے ہیں۔ اور اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ ان اداروں کے قیام کے محرکات کیا تھے۔ پھر ازمنہ قدیم کی تاریخ کو سامنے رکھ کر اس امر کا جائزہ بھی لیتے ہیں کہ یہ اجتماعی ادارے کب وجود میں آئے۔ اور انہوں نے وقتاً فوقتاً کیا کیا روپ دھارے گویا کہ وہ زمانہ گزشتہ کے تجربات اور اپنے مشاہدات کو بروئے کار لاکر اجتماعِ انسانی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے دلائل میں عینیت پسندی (IDEALISM) اور حقیقت پسندی (REALISM) کا عجیب و غریب امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ کامل وہ ہے جو جزو سے کل تک پہنچے اور کل سے جزو پر آئے۔ اور دونوں کے تضاد کو دور کرے۔"

مسلمانوں کے سیاسی افکار

مصنف پروفیسر رشید احمد

افکار وآراء

چند خطوط

محترمی !۔۔۔

آپ نے میری کتاب "خانوادہ قاضی بدرالدولہ" کی جو قدر فرمائی ہے اس کے لئے حد درجہ شکر گزار ہوں۔ مجھ جیسے ایک دور افتادہ خادم علم کے لئے رسالہ "الرحیم" کا زریں تحفہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ انشاءاللہ اس سے ضرور علمی استفادہ کرونگا اور اس کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات ظاہر کرسکوں گا۔ رسالہ ابھی تک نہیں ملا۔ ایک دو دن کے اندر مل جائیگا۔

یہ معلوم کرکے اور بھی مسرت ہوئی کہ صیغہ اوقاف کے چیف ایڈمنسٹریٹر ہمارے مشہور و معروف اور مقبول اہل قلم مولانا اکرام صاحب ہیں جنہوں نے شبلی نامہ موج کوثر۔ آب کوثر وغیرہ لکھ کر ہند و پاک کے اہل قلم سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ہمیں پوری امید ہے کہ ان کی رہنمائی میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ارباب علم و قلم نمایاں علمی اور ثقافتی خدمت انجام دیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف کتابوں کے اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض کی زبان صاف اور واضح نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تمام تصنیفات کے ترجموں پر نظر ثانی کی جائے اور جن کتابوں کا ترجمہ نہیں ہے ان کا ترجمہ اچھی کتابت اور طباعت کے ساتھ کیا جائے۔ آجکل پاکستان سے بہت سی عمدہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مگر معلوم نہیں ان میں جدید طباعت کے اصول کیوں ملحوظ نہیں ہوتے مثلاً ہر کتاب کے صفحہ پر کتاب کا نام اور زیر تذکرہ مضمون کا ذکر ہونا چاہیئے۔ اگر اس کا ایک کاغذ بھی علیحدہ کر دیا جائے تو فوراً معلوم کیا جاسکے کہ یہ کس کتاب کا ہے

محمد یوسف کوکن عمری (نائب صدر دارالتصنیف) ہیڈ شعبہ عربی وفارسی و اردو مدراس یونیورسٹی مدراس ۵

محبی فی اللہ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ شاہ صاحب کی ہستی عجیب و غریب ہستی تھی۔ مفسر سمجھتاہے مفسر ہیں۔ فقیہ سمجھتا ہے فقیہ ہیں متکلم سمجھتاہے متکلم ہیں۔ محدث سمجھتاہے محدث ہیں۔ صوفی سمجھتاہے صوفی ہیں۔ سیاسی آدمی سمجھتاہے شاہ صاحب سیاسی آدمی ہیں فلسفی سمجھتاہے فلسفی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ سب کچھ تھے اور طریق سلف پر گامزن تھے۔ مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند نے کیا اچھے جملے اس اعجوبۂ دہر کے متعلق استعمال کئے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں: "اگر صرف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سرزمین ہند میں پیدا ہوتے تو یہ فخر ہندوستان کے لئے کافی ہے" نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اور دیگر حضرات نے بھی شاہ صاحب کی تعریف لکھی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے ھو کذلك کما قالوا۔ امام ولی اللہ کی سیرت پر ایک رسالہ لکھ چکا ہوں۔ جس کو مولانا محمد سورتی صاحب قرول باغ دہلی سے شائع کرچکے ہیں۔ اس کے بعد امام ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ شائع ہوگیا۔۔۔۔ ابھی حال ہی میں امام ولی اللہ کی المسوّیٰ کا ترجمہ ہورہا ہے۔ پہلی جلد کا ترجمہ مکمل ہے۔ دوسری جلد کا ترجمہ ہورہا ہے۔ یہ نصف کے قریب ہوگیا ہے۔

ابوالعلاء محمد اسمٰعیل کان اللہ لہٗ

گودھرہ، گجرات کاٹھیاواڑ

۔۔۔۔۔۔۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی تاسیس کی خبر ملی۔ عرصہ سے امام صاحب علیہ الرحمۃ کے افکار اور مشن پر ایک مستقل ادارہ ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ وجود میں آگیا۔ اب امید بندھی ہے کہ ان کے علمی کارناموں اور ان کے فلسفۂ حکمت اشاعت کا کام اعلیٰ پیمانہ پر انجام پائے گا۔ اور یہ علوم کا خزینہ نہ صرف مشرقی زبانوں کے حدود میں محیط رہے گا۔ بلکہ مغربی زبانوں میں بھی اس کی تبلیغ و اشاعت ہوگی ۔۔۔ توقع ہوئی ہے کہ مجوزہ پروگرام جلد عملی جامہ پہنے گا اور علمی مرکز ان مقاصد کی تکمیل کرے گا، جو اس کے پیش نظر ہیں ۔۔۔۔ شیخ صاحب نے اس کی نگرانی قبول کی ہے امید افزا بات ہے۔ خدا کامیابیوں سے نوازے۔

سید احتشام بن حسن ریسرچ اسسٹنٹ

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹیڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

افکار و آراء

چند خطوط

محترمی! ...

آپ نے میری کتاب "خانوادہ قاضی بدرالدولہ" کی جو قدر فرمائی ہے اس کے لئے صد درجہ شکر گزار ہوں۔ مجھ جیسے ایک دورافتادہ خادم علم کے لئے رسالہ "الرحیم" کا زریں تحفہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ انشاء اللہ اس سے ضرور علمی استفادہ کرونگا اور اس کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات ظاہر کرسکوں گا۔ رسالہ ابھی تک نہیں ملا۔ ایک دو دن کے اندر مل جائیگا۔

یہ معلوم کرکے اور بھی مسرت ہوئی کہ صیغہ اوقاف کے چیف ایڈمنسٹریٹر ہمارے مشہور و معروف اور مقبول اہل قلم مولانا اکرام صاحب ہیں جنہوں نے شبلی نامہ، موج کوثر، آب کوثر وغیرہ لکھکر ہندو پاک کے اہل قلم سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ہمیں پوری امید ہے کہ ان کی رہنمائی میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ارباب علم و قلم نمایاں علمی اور ثقافتی خدمت انجام دیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف کتابوں کے اردو ترجمے شائع ہوچکے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض کی زبان صاف اور واضح نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تمام تصنیفات کے ترجموں پر نظر ثانی کی جائے اور جن کتابوں کا ترجمہ نہیں ہے ان کا ترجمہ اچھی کتابت اور طباعت کے ساتھ کیا جائے۔ آجکل پاکستان سے بہت سی عمدہ کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ مگر معلوم نہیں ان میں جدید طباعت کے اصول کیوں ملحوظ نہیں ہوتے مثلاً ہر کتاب کے صفحہ پر کتاب کا نام اور زیر تذکرہ مضمون کا ذکر ہونا چاہیئے۔ اگر اس کا ایک کاغذ بھی علیحدہ کردیا جائے تو فوراً معلوم کیا جاسکے کہ یہ کس کتاب کا ہے۔

محمد یوسف کوکن عمری (نائب صدر دارالتصنیف) ہیڈ شعبہ عربی و فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی

محبیٔ فی اللہ......

...... شاہ صاحب کی ہستی عجیب وغریب ہستی تھی۔ مفسر سمجھتا ہے مفسر ہیں۔ فقیہہ سمجھتا ہے فقیہہ ہیں متکلم سمجھتا ہے متکلم ہیں۔ محدث سمجھتا ہے محدث ہیں۔ صوفی سمجھتا ہے صوفی ہیں۔ سیاسی آدمی سمجھتا ہے شاہ صاحب سیاسی آدمی ہیں فلسفی سمجھتا ہے فلسفی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ سب کچھ تھے اور طریق سلف پر گامزن تھے۔ مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیو بند نے کیا اچھے جملے اس اعجوبۂ دہر کے متعلق استعمال کئے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں: "اگر صرف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سرزمین ہند میں پیدا ہوتے تو یہ فخر ہندوستان کے لئے کافی ہے" نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اور دیگر حضرات نے بھی شاہ صاحب کی تعریف لکھی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے ھو کذلک کما قالوا۔ امام ولی اللہ کی سیر پر ایک رسالہ لکھ چکا ہوں جس کو مولانا محمد صدیق صاحب قرول باغ دہلی سے شائع کر چکے ہیں۔ اس کے بعد امام ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ شائع ہو گیا.... ابھی حال ہی میں امام ولی اللہ کی المسوّیٰ کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ پہلی جلد کا ترجمہ مکمل ہے۔ دوسری جلد کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ یہ نصف کے قریب ہو گیا ہے۔

ابوالعلاء محمد اسمٰعیل کان اللہ لہٗ
گودھرہ، گجرات کاٹھیاواڑ

....

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی تاسیس کی خبر ملی۔ عرصہ سے امام صاحب علیہ الرحمۃ کے افکار اور مشن پر ایک مستقل ادارہ کی ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ وجود میں آ گیا۔ اب امید بندھی ہے کہ ان کے علمی کارناموں اور ان کے فلسفۂ حکمت کی اشاعت کا کام اعلیٰ پیمانہ پر انجام پائے گا۔ اور یہ علوم کا خزینہ نہ صرف مشرقی زبانوں کے حدود میں محیط رہے گا۔ بلکہ مغربی زبانوں میں بھی اس کی تبلیغ و اشاعت ہو گی ... توقع ہوئی ہے کہ مجوزہ پروگرام جلد عملی جامہ پہنے گا اور یہ علمی مرکز ان مقاصد کی تکمیل کرے گا، جو اس کے پیش نظر ہیں..... شیخ صاحب نے اس کی نگرانی قبول کی ہے یہ امید افزا بات ہے۔ خدا کامیابیوں سے نوازے۔

سید احتشام بن حسن ریسرچ اسسٹنٹ
انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جناب محترم......

...... یہ ایک پایدار کام ہے۔ اور انشاءاللہ اس میں بنی نوع انسان کی ترقی ہوگی، روحانی ومعاشی دون
رسالے میں خوب کھلے کہ اعجاز قرآن صرف فصاحت نہیں بلکہ وہ حکمت عملی ہے جو فلاح دنیوی بھی پیش نظر رکھتی ہے۔
بشرط استطاعت آپ کے رسالے کے لئے کچھ پیش کروں گا۔

اجمل

۷، شیر شاہ میس نئی دہلی

محترم......

...... بندہ کو شاہ صاحب کی تعلیمات اور ان کے فلسفے سے پرانی دلچسپی ہے۔ اور ان کی شخصیت سے خاص
شغف ہے۔ میں نے انفرادی طور پر اس سلسلے میں جزوی تحقیق کا کام شروع کر رکھا ہے۔ اور بہ انشاءاللہ جاری ر
گا۔ حسب ذیل امور زیر تحقیق ہیں۔

۱۔ شاہ صاحب اور تراجم قرآن (۲) شاہ صاحب اور علوم قرآن (الفوز الکبیر زیر بحث ہے) (۳) عالمگیر
اور شاہ عبدالرحیم (۴) شاہ صاحب کا سلسلۂ تلمذ (۵) نیز شاہ صاحب کا رسالہ "الارشاد الی مہمات الاسناد" دوبارہ
صحت کے ساتھ مرتب کر رہا ہوں۔ جن علماء کے تراجم پہلے ایڈیشن میں درج نہیں ہو سکے، اس میں ان کا اضا
کر رہا ہوں۔

محمد عبدہ

جامعہ محمدیہ اوکاڑہ

باسمہ تعالیٰ

مکرمی!

سلام مسنون۔ "الرحیم" کا پہلا پرچہ موصول ہوا۔ ممنون ہوں۔ شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی کا قیام اور "الرحی
کا اجراء یقیناً ایک نیک فال ہے۔ دعا ہے کہ یہ اقدام امت مسلمہ کے لئے باعث خیر و برکت ہو۔ خدا کرے کہ "الرحیم
کے ذریعہ مسلمانوں کو از سر نو فکر و عمل کے صحیح قالب نصیب ہوں اور اکیڈمی کے ارباب بست و کشاد اور ان کے ہم

حضرات کو یہ توفیق میسر آئے کہ وہ معیاری اسلامی زندگی کا عملی نمونہ خود بھی پیش کر سکیں۔ خدا نہ کرے کہ یہ عزیز ادارہ "علمیات" کے گراں بار و گراں خیز حجابات میں دب کر رہ جائے۔

چند سال قبل جب میں کراچی میں تھا تو مولانا طاسین صاحب کی عنایت سے میں نے لمحات عربی مولانا قاسمی صاحب کے قلمی نسخہ سے نقل کی تھی۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ یہ نایاب کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو گئی ہے مہربانی فرما کر لمحات کا ایک نسخہ فوری طور پر بذریعہ وی پی پی ارسال فرمائیں۔

دعاگو

محمد ایوب راولپنڈی

محترمی

...... سوا چھ بجے شام گوٹھ پیر جھنڈا پہنچا .... صبح بدھ کے روز کام شروع کر دیا۔ اور جمعرات کے روز تو لائحہ عمل پر پورے زور سے کام شروع ہوا۔ کل جمعہ بھی پوری ہمت سے کام ہوا۔ امید ہے کہ آج فہرست قسم علوم القرآن کے سیکشن ہائے (۱) مصحف شریف (متن کلام الہی) (۲) تجوید و قراءۃ۔ وقوف وغیرہ (۳) اصول تفسیر و ناسخ و منسوخ۔ لغات القرآن۔ تلاش آیات۔ احکام قرآن۔ (۴) تفسیر ہر قسم کی فہرست مکمل ہو جائیگی۔ اس قسم میں کتب مطلقاً منقش۔ قلمی مطبوعہ۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی۔ اردو۔ سندھی سبھی شامل ہیں۔ اصل فہرست قدیم و جدید سے بے نیاز ہو کر یہ فہرست مرتب کی جارہی ہے۔ اور علوم کی کلاسی فیکیشن (جماعت بندی) اور تفصیلات اس بسط کے ساتھ مہیا کی جارہی ہیں۔ کہ ماہرین علوم جدیدہ و قدیمہ اس فہرست کو طرز جدید و قدیم کا مجمع البحرین تسلیم فرمائیں گے۔ اس قسم میں اگرچہ فہرست قدیم ترین ملاحظہ کرنے سے تحقیقی اور معیاری شاہکار کتابوں کا بحر ذخار معلوم ہوتا تھا لیکن اب اس نئی فہرست مرتب کرنے کے دوران صرف ایک ایسی کتاب قدیم ترین مطبوع مکاشفات الاخیار معروف بہ تفسیر حضرت شاہی مؤلفہ جناب حکیم مولوی محمد حسن امروہی دستیاب ہوئی۔ جو کہ تمام تحریکات علمی کے لئے بمنزلہ اساس و خشت اول ہے۔ اور اکثر و بیشتر مرکزی علمی خزائن کتب اس جوہر جدید جہانتاب اور مدعیان اصلاح کے متاع حیات سے خالی ہیں حکیم صاحب موصوف علوم قدیمہ کی مہارت کے ساتھ ساتھ اسرائیلیات اور کتب سماویہ و ادیان قدیمہ کے تمام تر لٹریچر پر نظر غائر اور فکر صائب کے مالک ہیں۔ موصوف نے اس کتاب میں اجمالاً اور اپنی دوسری مایۂ ناز تصنیف تفسیر و تاویل البرہان میں تفصیلاً آیات قرآنیہ

کو کتب سماویہ کی عبارتوں سے تطبیق دینے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اور اسی طرز کو احادیث صحیحہ و آثار ثابتہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اصلی تفسیر قرآن کریم قرار دیا۔ پھر یہی فکر نو جدید اسلام کا خالق بنا۔

ہر بوالہوس نے طرز سخن اختیار کی اس دور میں اب قدر فکر و نظر کہاں

انگریزی دور حکومت اور امروہی طرز فکر نے نیچریت کو جنم دیا۔ جس کی تردید مفکر اسلام حضرت سید جمال الدین افغانی رح نے رسالہ "ردِ نیچریت" میں فرمائی اور اسی دور انقلاب کی دوسری مصیبت تحریف القرآن بصورت "تفسیر قرآن" کی تردید تفسیر فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی میں ہوئی تیسری آفت جو کہ ان دونوں نوزائیدہ فتنوں کو پرورش دینے پروان چڑھانے کے لئے سامنے لائی گئی۔ وہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت اور اس پوری جماعت جدید اسلام کا قلمی جہاد ہے جس کے جواب میں دیوبند سے رسالہ "تصفیہ العقائد" "قاسم العلوم" اور لکھنؤ سے "نور الآفاق" وغیرہ کا سلسلہ جاری ہوا۔

(مولانا) محمد عبد اللہ عمر پوری

محترمی.....

......شاہ عبدالرحیم رح کا ایک مختصر سا رسالہ "انفاس رحیمیہ" کوئی پچاس برس ہوئے شائع ہو چکا ہے۔ یہ تصوف پر مختصر ہدایات ہیں جو ان کے مکتوبات پر مشتمل ہیں اور جن کو ان کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ رح کے بھائی شاہ اہل اللہ نے ترتیب دیا اس میں انقلاب کی زمین تیار کی گئی ہے اور اس کی اولین خشت فلسفۂ اخلاق ہے، جو اس وقت ہماری قوم میں ناپید ہے تو می اخلاق کے بغیر انقلاب پیدا نہیں ہوا کرتے یہاں آجکل یہ حال ہے کہ اخلاق کے معنی ہی کوئی نہیں سمجھتا اس کے دونوں پہلو داخلی اور خارجی تعمیری ہیں۔ مگر ہمارے ہاں تو ہر طرف تخریب ہی تخریب نظر آتی ہے اور ہر مسلمان کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ مجھے کچھ نہ کہو۔ مجھ سے بہتر مہذب قوم ہی دنیا میں پیدا نہیں ہوئی میں ہی دنیا کو تہذیب سکھا سکتا ہوں۔ شاہ عبدالرحیم نے توحید کا سبق سکھا کر قوم کو بیدار کرنا چاہا تاکہ ان کا ایک ضابطۂ اخلاق ترتیب پا جائے اس پر حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی بنیاد کھڑی ہوئی ہے۔ اس رسالے میں چھوٹے چھوٹے نکتے بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کئے ہیں چند ایک یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

"اے طالب مولا! بنگر کہ از راحت رسانیدن حیوانے بہشتے را جنتی کرد۔ اگر از راحت رسانیدن انسان حضرت رحمان ترا بقرب جمال باکمال خویش رساند و سعید ابدی گرداند بعید نیست، و از اذیت حیوانے بہشتی دوزخی گشت۔

ازادیت دلی کہ حرم انوار حق تعالیٰ و محل اسرار جل و علی است با سفل سافلین افتد چہ دوا است"

اس کے بعد ایک رباعی نقل کی ہے۔ ع

روزے آں تو بودم و نمیدانستم | شب با تو غنودم و نمیدانستم
ظن بردہ بودم و دش کہ من جملہ منم | من جملہ تو بودم و نمیدانستم

اور پھر تلقین یادِ الٰہی یوں کرتے ہیں۔

"بے یار خدا ہو ستن بصورت مرگ ست بلکہ بدتر از مرگ" سعادت در عبادت و شقاوت در فراغت"

پر سیکڑے توڑ دیتے ہیں! سبحان اللہ۔ ان چند فقروں میں دریا بھر کر رکھ دیا ہے۔ کیا پُر خلوص تعلیم ہے اور اخلاق کی بنیاد۔ آج کل یہ کہاں نصیب۔ یہ یادِ خداہی تو ذکرِ الٰہی ہے جس سے قلب صفا ہوتا ہے اور جو انقلاب کی اولین خشت ہے۔ ذرّہ یاد آگاہی بہ از ہزار بادشاہی! اور طالب مولا از ہمہ اولیٰ۔ یہی چیز ہے جو تفصیلاً حضرت شاہ ولی اللہ نے ہم تک پہنچائی۔

انفاس رحیمیہ تو تیس پینتیس صفحہ کا رسالہ ہے مگر جب اسکی تعلیم شاہ محمد کے ذہن میں اتری تو سمندر بنکر ٹھاٹھیں مارنے لگی۔

مخلص عبدالرشید عفی عنہ کراچی

مکرم و محترم ....۔

...... شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے متعلق آپ کا پمفلٹ ملا۔ از حد خوشی ہوئی۔ کیونکہ بندہ بھی حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات و فلسفہ کا عاشق ہے۔ بندہ کے بھی عزائم تھے کہ اس حکیم الامتؒ کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ اور عالم اسلام کو ان کی جلیل القدر خدمات سے روشناس کیا جائے میں نے آپ کے علوم کو نشر کرنے کے چند ارادے کر رکھے ہیں، جو اس توقع میں پیش خدمت ہیں کہ اس عاجز کو بھی اس کارِ خیر میں شریک کیا جائے۔

۱۔ آپ کے فارسی ترجمے معہ مختصر حاشیے کو جو فتح الرحمان کے نام سے موسوم ہے، اردو میں منتقل کیا جائے۔ اگرچہ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ اسی ترجمے سے ماخوذ ہے۔ لیکن وہ دلی کی پرانی زبان میں ہے۔ اور اردو میں جدید محاورے اور الفاظ کافی آچکے ہیں۔ اس لئے اس ترجمے کی اشد ضرورت ہے اس کا نام اردو ترجمہ

شاہ ولی اللہ رکھا جائے تاکہ اردو داں حضرات شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمے سے مستفید ہو سکیں بندہ اس خدمت کے لئے تیار ہے

۲۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس مختصر سی تفسیر اور علم تفسیر پر الفوز الکبیر تصنیف کرنے کے علاوہ قرآن مجید کی بعض اور آیات کی بھی محققانہ تفسیر کی ہے۔ جو ان کی مختلف تصانیف میں کہیں کہیں مذکور ہے جیسے کہ ازالۃ الخفا اور تفہیمات میں ان تفسیر کو جمع کیا جائے اور اس مجموعے کا نام تفسیر شاہ ولی اللہ رکھا جائے۔ اس میں فوز الکبیر اور فتح الخبیر بھی شامل ہو۔

۳۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات میں جگہ جگہ علم کلام پر بحثیں کی ہیں اور اس ضمن میں عقائد کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش فرمایا ہے۔ میں انہیں جمع کر کے ان کا اردو ترجمہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ علم کلام میں شاہ صاحب نے جو تجدید کی ہے وہ سامنے آجائے

۴۔ حضرت شاہ صاحب کی بعض عبارتوں پر بعض اہل علم نے اعتراض کئے ہیں، جیسے کہ بعض تصوف کی عبارتیں ہیں۔ چونکہ یہ اعتراض کرنے والے اس طریقے کے راہرو نہ تھے اس لئے انہوں نے خواہ مخواہ حضرت شاہ صاحب کو مورد طعن بنایا ہے ان اعتراضات کا جواب دیا جائے۔

۵۔ آپ کی جملہ تصانیف سے مختلف مسائل کا استنباط کر کے ان کے متعلق مستقل رسائل شائع ہوں۔

۶۔ آپ کی ایک جامع سیرت مدون کی جائے۔

محمد ابوالخیر اسدی

مخدوم رشید (ملتان)

مکرمی۔۔

۔۔۔۔۔ مجلہ "الرحیم" بابت ماہ جون ۱۹۶۳ء نظر سے گذرا۔ مجھے یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ سندھ میں بھی ایسے اچھے اہل علم حضرات موجود ہیں۔ جو شمع علم کو فروزاں کرنے کی اہلیت تامہ رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے تحت مذکورہ مجلہ اپنے قارئین کو مطمئن رکھنے میں کامیاب ہوگا۔ لیکن اس شمارہ میں زیادہ تر ایسے نظریاتی مسائل پر زور دیا گیا ہے جو نہ تو موجودہ فلسفہ کی سطح کے ہم پایہ میں اور نہ ہی علمی دنیا میں عمل صالح کے محرک ہو کر سود مند ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بیشتر مقالہ نویسوں نے شاہ صاحب ممدوح کے نظریہ (وحدت الوجود) اور وحدت الشہود کو اپنا مطمح نظر بنایا حالانکہ یہ نظریہ چاہے صحیح ہو یا غلط، محض ایک خیال ہی خیال ہے اور اس سے موجودہ زوال زدہ تہذیب مسلم کا اچھا نہیں ہوگا! اس نظریہ کو غالب نے ایک ہی شعر میں جس خوبی سے ادا کیا وہ ان طویل مقالوں سے بلند تر ہے

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے!
حیران ہوں پھر مشاہدے کس حساب میں؟

اقبالؔ نے اور عام فہم الفاظ میں اس کی یوں وضاحت کی ؂

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرے کا دل چیریں!

محترم ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا نے شاہ صاحب کے "اصول حکمت" بیان کرنے کی اچھی کوشش کی ہے مگر انہوں نے بھی ان کی بعض ایسی باتوں کو پیش فرمایا جو نہ تو قرآن کے مطابق ہیں اور نہ عملی دنیا میں بکار ہو سکتی ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ھیں۔

"الغرض ولی اللہ اس محدود مادی کائنات کو تخلیق کا حرف آخر نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک اس سے ماوراء "عالم مثال" ہے اور "عالم مثال" سے ماوراء دوسرے عالم ہیں۔ ان سب کو وہ "عالم غیب" کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ "عالم شہادت" سے بالاتر "عالم مثال" ہے اور اس سے بالاتر "عالم ارواح" ہے۔"

جہاں تک تخلیق کے عمل جاری اور لامتناہی کا تعلق ہے اس میں نہ تو شک کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی قرآنی حکم کے خلاف ہے۔ مگر یہ "عالم مثال" اور "عالم ارواح" خیالی اصطلاحات ہیں جو نہ تو قرآن حکیم میں ہیں اور نہ ہی ان کی حقیقت ثابت ہے اس لئے میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ ایسی بعید از حقیقت باتوں سے "الرحیم" کی افادیت کو نقصان نہ پہنچایا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ اسباب زوال امت کی قرآن سے نشان دہی کر کے قرآن ہی کے اٹل و منبدل اصولوں کے مطابق ملت مرحومہ کی باز آفرینی کی کوشش کی جائے۔ شاہ صاحب موصوف نے اس بارے میں بہت کچھ پیش فرمایا ہے۔ اگر ان کے خیالات کو اس جہت میں حرف آخر ماننا ہی ہے تو بھی ان ہی کو با لوضاحت پیش کیا جائے تاکہ ملت کے احیاء و باز آفرینی کی کوئی صورت بن پڑے۔

فقیر بخش بجگٹ۔ از زیارت (کوئٹہ ڈویژن)

محترم۔۔۔

۔۔۔۔ آپ کا رسالہ "الرحیم" صفر موافق جولائی ۱۹۶۳ء موصول ہوا۔ شذرات پڑھے۔ آپ نے موجودہ دور کا نقشہ

جس خوش فہمی سے کھینچا ہے۔ اس سے حیرت ہوئی۔ اصل میں اسلامی تعلیمات کی طرف جس اہمیت سے توجہ کی ضرورت تھی اور ہے اس کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جا رہا ہے۔ اور اسلامی مملکت کے لئے اس سے بڑھ کر المیہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

عربی مدارس کے متعلق آپ نے عمومی تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ دین و دنیا کی تعلیمات کو جمع کیا جا رہا ہے۔ اگر اس حقیقت کا اظہار فرما سکتے تو بہتر ہوتا کہ اس ضمن میں جامعہ محمدی کی خدمات کس درجہ اثر انداز ہوئی ہیں تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ جامعہ کا مختصر سا تعارفی لٹریچر ارسال خدمت کیا جا رہا ہے۔ اسے بغور مطالعہ فرمایا جائے۔

گذشتہ چٹھی میں آپ کو نظریاتی اتحاد اور اشتراک عمل کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن آپ کے مکتوب پہنچنے پر میں اس کے بارے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ امید ہے اس چٹھی کو سامنے رکھکر رائے سے مطلع فرمایا جائے گا۔

جامعہ کے بلند تعلیمی منصوبہ کے لئے چند ایسے بلند فکر رفقار کی ضرورت ہے جو اعلیٰ علمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ جامعہ کے عزائم و مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں اور اس عظیم مقصد کی خاطر زندگی وقف فرما سکیں۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی ہونے کے ساتھ اگر عربی علوم میں دسترس رکھتے ہوں تو زیادہ قابل ترجیح ہوں گے۔ وظیفہ حسب استعداد پیش کیا جائیگا۔ ایسے افراد کی تلاش فرما کر مطلع فرما سکیں تو جامعہ کی خصوصی اعانت ہوگی۔ اگر کوئی مشہور شخصیت اس مقصد کے لئے تیار ہو سکے بہت بہتر ہوگا۔ والسلام

صادق جامعہ

جامعہ محمدی شریف جھنگ

مکرمی ..

..... گرامی قدر! الرحیم نظر نواز ہوا۔ ایک ہی نشست میں از اوّل تا آخر پڑھ ڈالا۔ میں مفصل طور پر اپنی رائے لکھنا چاہتا ہوں اور فرصت کا منتظر ہوں خصوصاً ایک استفسار کا جواب۔ لیکن اس وقت چند لفظ آپ کے شذرات کے بارے میں عرض کرنا کی اجازت چاہتا ہوں۔

عام مولویوں اور ان کے انقلابی اقدامات کے بارے میں آپ کی رائے، میں سمجھتا ہوں خوش فہمی پر مبنی ہے آپ ان کے لئے حسن ظن رکھتے ہیں یہ بات اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور اس لئے آپ نے اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن میں اپنے علم مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ ان کے اخلاق و کردار اور علم و فضل کے لئے بہت زیادہ اچھے

الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ نصاب تعلیم کے بارے میں انہوں نے اس سے زیادہ تیر ابھی تک نہیں مارا کہ تعلیمی مدت میں ایک آدھ سال کی کمی ہو جائے۔ حالانکہ سوال تعلیمی مدت کا نہ تھا، سوال اس فرسودہ نصاب تعلیم کا تھا جسے پڑھ کر بھی حقیقتاً انہیں کچھ یاد نہیں آتا۔ پھر کیا اسے تبدیل کیا گیا؟ بعض تبدیلیاں جو ہوئی ہیں ان کی حیثیت اور ان کی نتیجہ خیزی ایسی ہی ہے جیسے کسی مشن اسکول میں یا یہاں کے ایک مشنری اسکول "گرامر اسکول" میں اسلامیات کی ہو سکتی ہے کیا آپ یقین فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ بالعموم یہ مولوی عام مسلمانوں سے علم میں ضرور ایک درجہ فضیلت رکھتے ہیں لیکن عام اخلاق و کردار میں وہ کوئی درجہ فضیلت انہیں حاصل نہیں۔ حقیقت یہی ہے ہم اسے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ یہ بکی ہوئی نسلیں ہیں جنہیں صفر کاٹ ڈالنا چاہیئے اور بس!

ان عربی مدارس میں، ان کے اساتذہ میں، تلامذہ میں کچھ نہیں دھرا ان پر آپ اپنا وقت ضائع کیوں کریں؟ آپ ان سے کسی انقلاب لانے کے متوقع ہیں۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ یہ حالات سمجھنے اور تجزیہ کرنے اور اس سے نتیجہ نکالنے کی ادنیٰ صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ کس مجمع، کس آبادی اور کن دنوں میں کس کے نام اور کس کے ذکر سے عوام کی توجہات کا مرکز بنا جا سکتا ہے۔ اور ان کی خوشنودی طبع حاصل کی جا سکتی ہے۔ وہ خلاف عقیدہ غلاف کعبہ کی زیارت کا مشرکانہ ڈھونگ بھی ہو سکتا ہے اور شاہ ولی اللہ کا نام اور ان کا ذکر خیر بھی ہو سکتا ہے اور مولانا عبیداللہ سندھی کے کفر پر اصرار بھی ہو سکتا ہے۔ میں یہ بلا خوف تردید اور مع الثبوت کہہ سکتا ہوں کہ جو ان کی زبانوں پر ہوتا ہے وہ دلوں میں نہیں ہوتا۔ اور جو دلوں میں ہوتا ہے اس پر خود یہ پختہ ایمان و یقین نہیں رکھتے۔ آج یہ مولوی حضرات زوال امت کے اسباب ڈھونڈتے ہیں اور عوام کی جہالت اور بے دینی کو اس کا اصل قرار دیتے ہیں حالانکہ میرا پختہ یقین ہے کہ زوال امت کا اصلی سبب ان مولویوں کا وجود اور ان کا علم اور ان کی دینداری ہے۔ ان مولویوں کو درست کر دیجئے ساری امت سدھر جائے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب اور خانوادہ ولی اللہی کی کتنی بیش قیمت کڑیاں ان مولویوں اور صوفیوں نے ضائع کر دیں! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجاہدین نے انگریزوں اور سکھوں سے شکست کھائی تھی؟ اور اس کے بعد ہر دور میں علمائے حق کی ابتلاؤں اور مصیبتوں کا باعث کفار و مشرکین ثابت ہوئے؟ دنیا کا سب سے بڑا فتنہ انہیں علماء سُو کا وجود رہا ہے اور میں پختہ یقین رکھتا ہوں کہ آئندہ بھی اگر اسلامی تحریک، اسلامی تصورات اور مسلمانوں کو کسی سے خطرہ ہے تو وہ یہی ہیں۔

لیکن یہ جو کچھ عرض کیا ایک عام حالت ہے، مجھے تسلیم کر لینا چاہیئے کہ علمائے حق کے وجود مقدس سے دنیا کا کوئی دور خالی نہیں رہا۔ نہ یہ دور خالی ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے پیش نظر ایسے ہی علمائے کرام دامت فیوضہم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو وہ بصیرت عطا فرماتا ہے کہ ان کی شہادت کے لئے بارش کا وجود ضروری نہیں، وہ ہواؤں میں بو سونگھ لیتے ہیں۔ اور بارش کی پیش گوئی کرتے ہیں وہ عام حالات و واقعات کو دیکھ کر سالوں بعد پیش آنے والے حالات و واقعات کی نشاندہی کر سکتے ہیں، وہ وجود مقدس ہوتے ہیں کہ اگر بے خودی میں بھی ان کے منہ سے کوئی بات نکل جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو شرمسار نہیں ہونے دیتا وہ ان کی بات کی لاج رکھ لیتا ہے۔

....

علی گڈھ سوسائٹی کراچی

محترمی .....

..... ہمارے برصغیر میں احیار کی تحریکیں بے شمار رہی ہیں۔ شاہ صاحبؒ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں احیاء (REVIVALISM) کی ان تحریکوں کی بدولت ہی ہماری اینٹ سے اینٹ بج گئی سائنس اور صنعت کے اس دور میں یہ سارے نسخے کس طرح مرض کا علاج کر پائیں گے مجھ جیسے ان پڑھ آدمی کی سمجھ سے بالاتر بات ہے۔

مخدوم امیر احمد صاحب کا مضمون دوسرے شمارے میں کافی دلچسپ ہے۔

قریشی۔ ناظم آباد کراچی

عقل و مذہب کو سمویا تو نے اس انداز سے
صبح میں جیسے نمایاں ہو دھندلکا رات کا
تیرے ارشادات میں سامان تسکین ضمیر
روح ایمان نقطہ نقطہ تیرے ملفوظات کا

ماہر القادری

[illegible]

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی



لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی - مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اُس کا ایک پرانا نسخہ، جو اغلاط سے پُر تھا، ملا - موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا - اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے - کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے -

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ''وجود'' اور اُس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اُس پر بحث کی ہے، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں - قیمت دو روپے

—— : o : ——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے، اور اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں - اُردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے -

کتاب مجلد ہے - قیمت ۷ء۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدر آباد - پاکستان

onthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

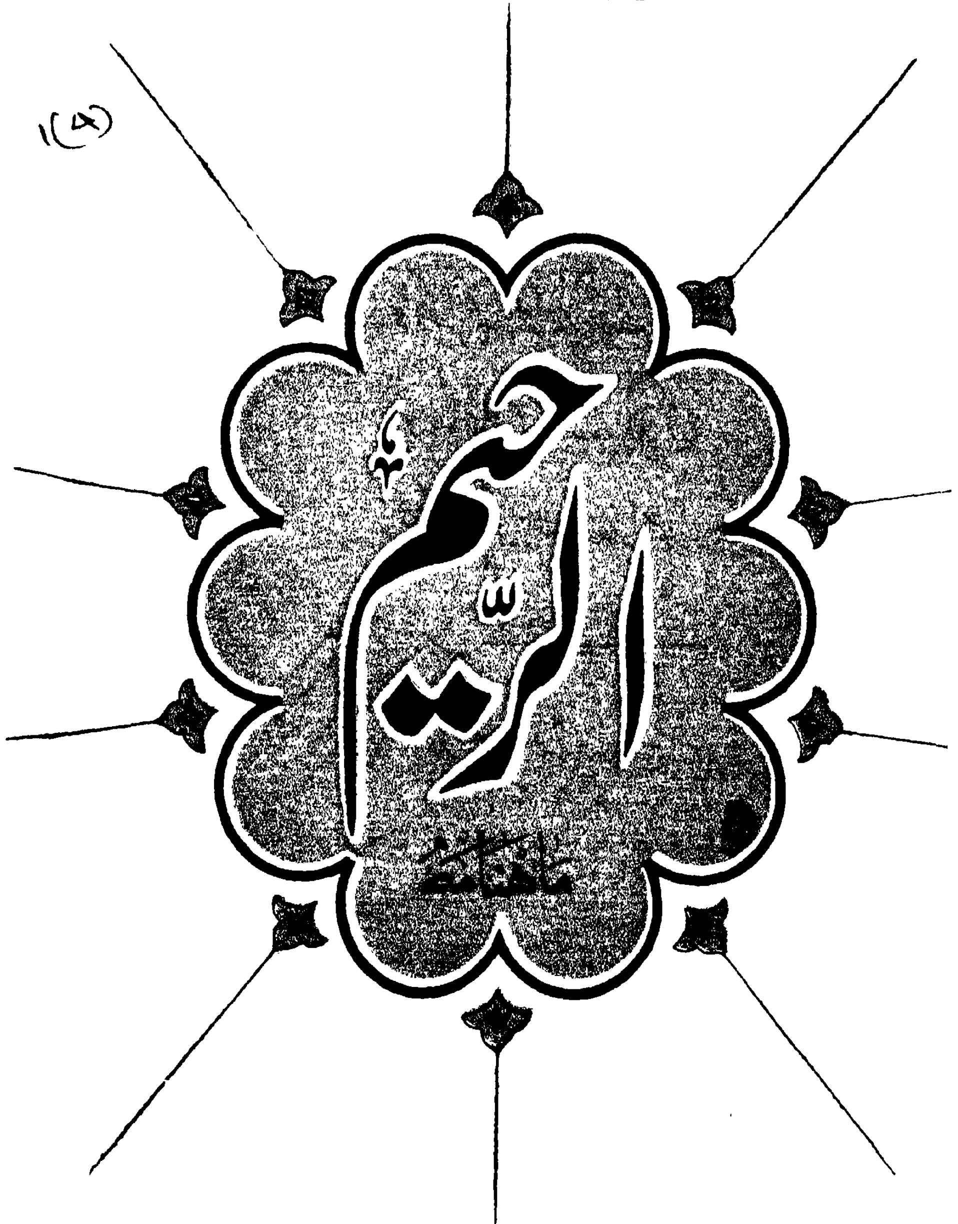
۶۔ حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا



محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ



شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ○ صدر حیدرآباد

ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ ستمبر ۱۹۶۳ء

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،
مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی،
مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

محمد سرور،

قیمت سالانہ : آٹھ روپے قیمت فی پرچہ پچھتر پیسے

الرحیم

جلد ۱ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۳ء نمبر ۴

فہرست مضامین

کتبہ :- عبدالمجید

شذرات

۱۲ر جولائی کو شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کا اجلاس تھا۔ جناب سید باقر شاہ صاحب ایڈوکیٹ اس میں شرکت کے لئے کراچی سے تشریف لائے تھے۔ گو آپ کی طبیعت کچھ عرصے سے ناساز تھی، لیکن اس کے باوجود آپ اکیڈمی کے اجلاس میں تشریف لائے اور اس کے مشوروں اور فیصلوں میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ بلکہ اجلاس میں جو بھی فیصلہ ہوئے۔ آپ ہی انہیں قلم بند فرماتے رہے۔ یہ ۱۲ر جولائی کا واقعہ ہے۔ ۱۴ر اگست کو یک بارگی کراچی سے خبر آتی ہے کہ جناب سید باقر شاہ صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔ وہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اور آپ انتقال فرما گئے۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

مرحوم و مغفور کی اچانک اور بے وقت موت کا جس نے بھی سنا، اسے انتہائی دلی صدمہ ہوا، اور خاص طور سے وہ لوگ جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے سید صاحب سے زندگی میں واسطہ رہا تھا۔ ان کے لئے تو یہ صدمہ بڑا ہی جانکاہ تھا۔ لیکن شاہ ولی اللہ اکیڈمی اور اس کے ہمدردوں کے لئے یہ سانحہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اکیڈمی جس "وقف سید محمد رحیم" کی بدولت وجود میں آئی اس کے قیام میں سید عبدالرحیم شاہ مرحوم، اور محترمہ بی بی زیب النساء مرحومہ کے بعد سب سے زیادہ

سید باقر شاہ کی کوششوں کا دخل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "واقفین" حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہ کے عقیدت مند تھے۔ اور انہوں نے دین اسلام کی جو حکیمانہ تعبیر فرمائی ہے، اسے وہ مسلمانوں اور تمام انسانیت کے لئے فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، لیکن "وقف سید محمد رحیم" کو موجودہ قانونی شکل دینے کا تمام خاکہ سید باقر شاہ مرحوم نے تیار کیا تھا۔ اور وہی اس کارخیر اور صدقہ جاریہ کے سب سے بڑے محرک تھے، اور وقف مذکور کے شرائط بھی انہوں نے مرتب فرمائے تھے۔

۱۹۵۷ء میں محترمہ بی بی زیب النساء صاحبہ کا انتقال ہوا، اس سے پہلے ان کے خاوند جناب سید عبدالرحیم شاہ اپنے رب کو پیارے ہو چکے تھے۔ بعدازاں جب تک کہ چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف مغربی پاکستان شیخ محمد اکرام صاحب کے عملی اقدام کے نتیجے میں حیدرآباد سندھ میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی وجود میں نہیں آگئی، اور اس نے اپنا کام نہیں شروع کر دیا، سید باقر شاہ مرحوم کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جن اہل علم سے انہیں یہ توقع ہوتی کہ وہ شاہ ولی اللہ کے علوم اور ان کی حکمت اسلامی کی نشر و اشاعت میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ ان کے پاس جاتے، اور انہیں آمادہ کرتے کہ وہ اس کام کو شروع کریں۔ اور "وقف سید محمد عبدالرحیمؒ" جس بلند مقصد کے لئے قائم ہوا تھا، اس کو پورا کرنے میں ساعی ہوں۔ مرحوم کو حضرت شاہ ولی اللہ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے غیر معمولی عقیدت تھی، اور وہ اٹھتے بیٹھتے، اور دوست احباب کے حلقوں میں اکثر انہی بزرگوں کا ذکر کرتے رہتے۔ جب فروری ۱۹۶۳ء میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کے نظام کار کا تعین ہوا، اور اکیڈمی کے نگراں ڈائریکٹر چنے گئے تو یہ دن جناب سید باقر شاہ مرحوم کے لئے ان کی زندگی کا سب سے مسرت بخش دن تھا۔ اور وہ اتنے خوش تھے کہ گویا انہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی متاع حاصل ہو گئی۔

اس دنیا میں کسی انسان کے لئے دوام نہیں، اور ہر ایک کو ایک نہ ایک دن اپنے رب کے حضور

میں جانا ہے؛ اور جو دن قبر میں لکھا ہے، وہ قبر کے باہر نہیں آسکتا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، تو جو کام ان کے ہاتھوں سرانجام پاتے ہیں، یا ان کاموں کی تکمیل میں ان مرنے والوں کی کوششوں کا کچھ دخل ہوتا ہے، تو ان کے بعد بھی ان کی اچھی یادیں باقی رہتی ہیں اور اس طرح انہیں دوام بخشتی ہیں۔ آخر اس حیاتِ ناپایدار کا اس کے سوا اور کیا حاصل ہے کہ ہم مرنے والوں کو اس طرح ان کے نیک اور اچھے کاموں کی وجہ سے بعد میں یاد رکھیں۔

جناب سید باقر شاہ صاحب انہی خوش نصیب لوگوں میں سے تھے، جو موت کے بعد اپنی اچھی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔

آج سے ۱۹ سال قبل اسی اگست کے مہینے کی بائیس تاریخ کو مولانا عبیداللہ سندھی ہم سے رخصت ہوئے تھے، مولانا سندھیؒ کی عملی سیاست سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح اپنی ساری زندگی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادہ علمی کے علوم اور ان کی حکمت کے مطالعہ، ان پر عمیق و پیہم غور و فکر کرنے اور ان کی مسلسل تعلیم و تلقین اور نشر و اشاعت میں صرف کردی، تو حکمت ولی اللہی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس موقع پر ہمارے دل ان کی یاد کے لئے سرتاپا وقف ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ عہد حاضر کے شارحین حکمت ولی اللہی میں سب سے بلند مقام انہیں دیں، ان کی تحقیقات کو اپنے مطالعہ کے لئے دلیل راہ بنائیں، اور ان سے استفادہ کریں۔ ہر سال ماہ اگست میں مولانا عبیداللہ سندھی کے یوم وفات پر بعض جگہوں میں مولانا مرحوم کی یاد میں تذکاری جلسے ہوتے ہیں، جن میں مولانا کے نیازمند اور عقیدتمند جمع ہوتے ہیں، اور ان کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔ نیز بعض اخبارات مولانا مرحوم کے متعلق مقالات شائع کرتے ہیں اور اس طرح سال بہ سال حکمت ولی اللہی کے اس عظیم مبلغ و شارح کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔

مولانا سندھیؒ نے خود اپنے قلم سے نسبتاً بہت کم لکھا، ان کی تمام تر توجہ اکثر پڑھانے ہی کی طرف

رہی۔ لیکن ان کی چند ایک تحریری باقیات میں سے ایک کتاب کا مسودہ بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ عربی زبان میں ہے اور مولاناؒ نے زمانۂ قیام حجاز میں اسے مرتب فرمایا۔ اس میں آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کی تحریک تجدید اسلام کا تعارف کرایا ہے۔ یہ کافی مبسوط کتاب ہے۔ اور اس کا نام ہے "التمہید لتعریف ائمۃ التجدید"۔ حضرت مولانا سندھیؒ کے عزیز شاگرد اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ریسرچ پروفیسر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے پاس "التمہید" کا مسودہ ہے۔ وہ اس کی نظر ثانی کر چکے ہیں خوش قسمتی سے مولانا سندھی کی اس اہم تاریخی کتاب کے چھپوانے کا انتظام بھی ہو گیا ہے، امید ہے وہ چند ماہ تک شائع ہو جائے گی۔

روس کے مشہور ترک عالم جناب موسیٰ جاراللہ مرحوم کچھ عرصہ مکہ معظمہ میں مولانا سندھیؒ کے ساتھ رہے تھے۔ اور آپ سے قرآن مجید کی تفسیر سنی تھی، مرحوم نے اسے قلم بند بھی کر لیا تھا۔ مولانا کی یہ تفسیر بروایت موسیٰ جاراللہ عربی میں ہے، اگر اسے بھی مرتب کر کے شائع کر دیا جائے تو یہ اور "التمہید" ولی اللہی مکتب فکر کو دنیائے اسلام میں بالعموم اور عرب ملکوں میں بالخصوص متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ ہو سکتی ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے زیر اہتمام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے دو رسالوں "الفوز الکبیر" اور "القول الجمیل" کا سندھی میں ترجمہ ہو رہا ہے، جیسے ہی ترجمہ مکمل ہوا، یہ دونوں رسالے شائع کر دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ کی کتاب "سطعات" پریس میں ہے اور مولانا قاسمی کی زیر نگرانی چھپ رہی ہے۔ "لمحات" کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ دوسری کتاب ہے، جو اکیڈمی کی طرف سے اپنی اصل زبان میں شائع ہوگی۔ اس کے بعد "ہمعات" کے چھاپنے کا پروگرام ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شروع شروع میں یہ جو شکایت تھی کہ پاکستان میں اعلیٰ معیار کی علمی، دینی اور تاریخی کتابیں کم چھپ رہی ہیں، جیسے جیسے دن گزر رہے ہیں، بحمداللہ کم ہوتی جا رہی ہے اب ملک کے کئی ایک ادارے علوم دینیہ اور تاریخ اسلام پر معیاری کتابیں چھاپنے لگے ہیں، لیکن اپنی تمام ہمتوں اور کوششوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ان اداروں کا دائرۂ کار آخر محدود ہے اور انہیں اکثر و بیشتر اپنے کاروباری مصالح کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے اور ان کے لئے

یہ بڑا مشکل ہے کہ وہ ایسی پرانی اور نئی کتابیں چھاپ سکیں، جن پر ایک طرف تصحیح، ایڈیٹنگ، تصنیف و تالیف اور ترجمے میں زیادہ مصارف اٹھتے ہیں، اور دوسری طرف وہ کاروباری لحاظ سے زیادہ نفع مند نہیں ہوتیں، لیکن وہ کتابیں قومی ذہن کی صحت مند نشوونما اور اسے صحیح راہوں پر ڈالنے کے لئے ہیں بہت ضروری۔ کتابوں کی نشر و اشاعت کے اداروں کا ان کے اس مفید اور اہم کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے محکمہ اوقاف مغربی پاکستان نے "بیورو آف ریسرچ اینڈ پبلیکیشن" قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مذہبی مدارس اور اسلامیات کے طلبار کے لئے موجودہ دینی و قومی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں تیار کرنا۔

۲۔ مغربی پاکستان کی مذہبی تاریخ اور خاص طور سے وہ صوفیہ اور بزرگ جن کے مزارات محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہیں، ان پر تصنیف و تالیف کی کوششوں کی حوصلہ افزائی۔

۳۔ اسلامی علوم پر معیاری اور نادر کتابوں کی اشاعت اور مساجد کے ائمہ اور خطبار حضرات کے مطالعہ کے لئے موزوں تصنیفات کی تیاری۔

۴۔ اسلامی علوم کی جو اہم اور مشہور کتابیں ہیں، ان کے تراجم طالب علموں اور اہل علم کے عام استفادے کے لئے مناسب صورت میں شائع کرنا۔

۵۔ یورپ کے مستشرقین نے اسلامی علوم پر جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے مفید اور اہم کتابوں کے تراجم کرانا۔

اس کے علاوہ محکمہ اوقاف کا قائم کردہ "یہ بیورو" موجودہ اسلامی ملکوں کی مذہبی، فقہی اور فکری تحریکات کے متعلق کتابیں شائع کرے گا۔ اور اسلامی تصوف کی معیاری کتابوں یا ان کے انتخابات کے سستے ایڈیشن شائع کرنے میں مدد دے گا۔

ان کتابوں کی طباعت و اشاعت تمام تر تاجران و ناشران کتب کے ذریعہ ہوگی۔ "بیورو"

کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ ان کتابوں کی تصحیح، تالیف اور ترجمہ کرا کے قابل اشاعت شکل میں ناشرین کے حوالے کر دے۔ اور انہیں اس مفید اور تعمیری ادب کی اشاعت میں ہر ممکن مدد دے۔

آج کے دور میں جب کہ نشر و اشاعت کے ذرائع روز بروز وسیع تر اور اسی حساب سے موثر ہوتے جا رہے ہیں، اور تعلیم کے ساتھ ساتھ مطالعۂ کتب کا شوق روز افزوں ہے، اسلامی علوم و فنون کی مشہور کتابوں کی اشاعت اور اسلاف کے بارے میں آج کی ضرورتوں کے مطابق دینی و تاریخی ادب فراہم کرنا قوم کی اصلاح و تعمیر کا ایک لازمی جزو ہے۔ مستقبل کی قومی عمارت ماضی کے ان آثار پر اٹھائی جانی چاہیئے، جو مرور زمانہ کے باوجود باقی رہنے والے ہوتے ہیں اور یہ قوم کا دینی و تاریخی ادب ہی ہے، جو ان آثار کی صحیح نشان دہی کر سکتا ہے۔ اگر "بورڈ" اس ادب کو نئی زندگی دینے اور اسے عوام و خواص یعنی قوم کے ہر دو طبقوں کے لئے قابل استفادہ بنانے میں ممد و معاون ہو سکے تو یہ اس کی بہت بڑی ملی اور دینی خدمت ہوگی، اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اسلامیت کی صحیح تربیت حاصل کرنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

یہی دینی و تاریخی ادب ہے، جو بقول علامہ اقبال مرحوم کے، ہمیں اپنے آپ سے آگاہ کرتا اور آشنائے کار اور مرد راہ بناتا ہے۔ یہ روح کے لئے سرمایۂ تاب ہے اور ملت کے جسم کے لئے اس کی حیثیت اعصاب کی ہے اس کی شمع بخت امم کے لئے کوکب ہے اور اس سے اس کا آج اور کل روشن ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ارشاد ہے۔

چشم پُر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را
بادۂ صد سالہ در مینائے او
مستی پارینہ در صہبائے او

صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستانِ ما پرید

اور آخر میں فرماتے ہیں :۔

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

اگر محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان کی ملی تاریخ کے تابناک اوراق اور پائیدار نقوشِ عظمت سے متعارف کرانے میں اس طرح کامیاب ہو جائے تو یہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا، اور قومی تعمیر میں اس کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ہم بڑی مسرت سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ پروفیسر غلام حسین جلبانی صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے اور اب وہ اس کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ امید ہے ہم بہت جلد حضرت شاہ ولی اللہ پر انگریزی زبان میں ایک ایسی کتاب جو اجمالی طور سے ان کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگی، شائع کر سکیں گے۔ پروفیسر جلبانی صاحب کی یہ کتاب سندھی اور اردو میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان حضرات کے لئے جو ان دونوں زبانوں سے ناواقف ہیں، حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس منعقدہ ۵ اگست میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اکیڈمی کے زیر اہتمام الرحیم کا سندھی میں ایک سہ ماہی ایڈیشن نکالا جائے، جس میں اردو ایڈیشن کی طرح حکمت ولی اللہی اور دوسرے اسلامی مسائل پر مضامین ہوں گے۔

شاہ ولی اللہؒ — تاریخی پس منظر

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ اپنے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں: "یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اجداد میں سب سے پیشتر حضرت شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے۔ اور انہوں نے قصبہ رہتک میں سکونت اختیار کی۔" رہتک دہلی سے کوئی تیس میل دور ہے۔ اور اس زمانے میں یہ بڑا آباد شہر تھا۔ شیخ شمس الدین ایک بزرگ شیر ملک کے بیٹے اور محمد عطا ملک کے پوتے تھے۔ جن کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رہتک میں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کے پرپوتے شیخ عبدالملک کے عہد میں قضاء احتساب اور افتاء کے عہدے اس خاندان میں موروثی کر دیئے گئے۔ چنانچہ شیخ عبدالملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں قاضی بدھا کی اولاد میں سے شیخ محمود تھے جنہوں نے منصبِ قضا ترک کر کے "اعمال سلطانیہ" اختیار کر لئے۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ "موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے سے سپاہیانہ زندگی اچھی اور انسب و اولیٰ ہے۔" شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد تھے۔ جن کی تربیت شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم نے کی، جو رہتک میں نہیں بلکہ سونی پت میں رہتے تھے۔ شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور کی شادی بھی اپنے ننہیال میں ہوئی اور اسی طرح ان دونوں خاندانوں کا سلسلہ اکٹھا ہو گیا۔

یہ شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم جلال الدین اکبر کے دور میں تھے، اور بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ آپ نے راجپوتانہ کے قلعہ چتوڑ کی فتح کی پیش گوئی کی تھی چنانچہ تھوڑے ہی روز گزرے تھے کہ چتوڑ کی فتح اسی اسلوب و طریقہ پر بادشاہ کی

۱۔ اس حصہ مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر حیات ولی از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی سے مدد لی گئی ہے۔ مدیر

خدمت میں معروض ہوئی، جیسا کہ جناب شیخ عبدالغنی صاحب نے بیان فرمایا تھا، اس پر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور اپنی فیاضانہ ہمت سے بارہ وسیع گاؤں جناب امام ناصرالدین شہید کے مزار کی نذر کر دیئے اور شیخ عبدالغنی کے نام ایک شاہی فرمان جاری ہوا۔ کہ ان قصبات کی سالانہ آمدنی آپ کی تفویض میں ہمیشہ رہے گی"

انہیں شیخ عبدالغنی صاحب کے متعلق "حیات ولی" میں ایک اور واقعہ منقول ہے:۔

"خواجہ محمد ہاشم کشمی شیخ مجدد یعنی حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی قدس سرہ سے ناقل ہے کہ شیخ مجدد فرماتے ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار ایک مدت تک جناب شیخ عبدالغنی صاحب کی ملاقات کے جویاں رہے جو شہر سونی پت کے ایک کامل درویش اور مشہور و معروف بزرگ تھے۔ ہمارے والد بزرگوار کو آپ سے نیاز حاصل کرنے اور خدمت میں حاضر ہونے کا اس لحاظ سے اور بھی بے تابانہ شوق تھا کہ انہیں کسی معتبر ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ شیخ عبدالغنی صاحب اپنے بزرگ و محترم پیر کا ایک خاص راز مضمر رکھتے ہیں"۔

شیخ منصور جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان کے ہاں شیخ عبدالغنی صاحب کی پوتی سے دو صاحبزادے ہوئے ایک شیخ معظم اور دوسرے شیخ اعظم شیخ معظم کے بیٹے شیخ وجیہہ الدین تھے، جو شیخ عبدالرحیم کے والد بزرگوار ہیں، جن کے ہاں ۱۱۱۴ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے تھے۔ شیخ معظم کے حالات میں صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں:۔

"جب شیخ معظم علمی تحصیل سے فارغ ہوئے تو آپ کی طبیعت بے اختیارانہ جوش کے ساتھ سپاہیانہ فنون کی تحصیل اور تحصیل کے ساتھ تکمیل کی طرف دوڑی۔ گو آپ کی طرز معاشرت بالکل درویشانہ اور عالمانہ تھی لیکن آپ کی پرشوق اور تیز نظریں اس لاجواب اور عدیم المثال شجاعت کی طرف بڑی شتابی کے ساتھ اٹھ رہی تھیں، جو زمانہ سابق میں اسلام اور بانیان اسلام کے حق میں فطرت کی عام بخششیں سمجھی گئی تھیں۔۔۔"

"شیخ معظم کے والد بزرگوار شیخ منصور بھی بہت بڑے شجاع اور دلیر تھے۔"

شیخ عبدالرحیم (والد شاہ ولی اللہ) نے اپنے دادا شیخ معظم اور پردادا شیخ منصور کی بہادری کے بہت سے واقعات ذکر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے والد شیخ وجیہہ الدین کا ذکر کرتے ہیں فرماتے ہیں۔ میرے واجب الاحترام والد نہایت محتاط اور متورع آدمی ہیں۔ چونکہ آپ کا قالب بالکل سپاہیانہ تھا اور آپ فطرتاً جاق و چوبند تھے، اس لئے شمشیر زنی اور اپنی بے خوف شجاعت کے جوہر ظاہر کرنے کا آپ کو زیادہ شوق تھا

یہی وجہ تھی کہ آپ ابتدائی زمانے سے سلطنت مغلیہ کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ اور اپنے کارہائے نمایاں کے صلے میں کوئی بڑا اور معزز فوجی عہدہ رکھتے تھے... اس وقت شاہجہاں بادشاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ شیخ عبدالرحیم نے بعض ان معرکوں کا ذکر کیا ہے جن میں شیخ وجیہہ الدین نے اپنی شجاعت و جرأت کے جوہر دکھائے تھے۔

عالمگیر کی تخت نشینی پر جب اس میں اور اس کے بھائی شاہ شجاع میں موضع کھجوہ پر خونریز جنگ ہوئی تھی، تو اس میں شیخ وجیہہ الدین اورنگ زیب عالمگیر کی طرف تھے ان کی بہادری کی بدولت جنگ کا ایک اہم مورچہ سر ہوا تھا، جس کی تفصیل "حیات ولی" میں یوں ہے۔

لڑائی کے دوسرے دن شاہ شجاع نے دو تین کوہ پیکر مست ہاتھی عالمگیر کے لشکر کی طرف دھکیل دیئے۔ جن کے پیچھے زرہ پوش سپاہی تھے۔ شاہ شجاع کا یہ حملہ بڑا کامیاب رہا اور عالمگیر کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیخ وجیہہ الدین نے اپنے مورچے پر کھڑے جو یہ صورت حال دیکھی۔ تو اپنے ساتھیوں کو لے کر ہاتھیوں کی طرف بڑھے اور سب سے پہلے اس ہاتھی پر حملہ کیا، جو سب سے سرکش تھا، ہاتھی نے سونڈ بڑھا کر آپ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا آپ نے تلوار کا ایک وار کیا، جس سے اس کی سونڈ کٹ گئی اور وہ چنگھاڑتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگا۔ اس کا بھاگنا تھا کہ زرہ پوشوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور شاہ شجاع کے لشکر کو شکست ہو گئی۔

عالمگیر نے اس فتح کی خوشی میں ایک شاندار جلسہ کیا اور چونکہ وہ عین معرکہ میں جناب شیخ وجیہہ الدین صاحب کی بہادرانہ کوشش اور وفادارانہ جوش کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکا تھا اس لئے اس نے آپ کو بہت انعامات دیئے اور خود اپنے ہاتھ سے آپ کی کمر میں تلوار باندھی۔

شاید سیواجی کا زمانہ تھا، شیخ وجیہہ الدین دکن جا رہے تھے کہ راستے میں راہزنوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جس میں آپ شہید ہو گئے۔

شیخ وجیہہ الدین کی شادی شیخ رفیع الدین محمدؒ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو ایک مشہور خانوادۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد شیخ قطب العالم اور دادا شیخ عبدالعزیز دہلوی البحرالمواج عرف شکر بار تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم "امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف" میں لکھتے ہیں :- "چشتی طریقے میں حضرت

شیخ عبدالعزیز دہلوی متوفی ۹۷۵ھ ایک بہت بڑے عالم، عارف اور متشرع بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں ایک رسالہ "عینیہ" ہے جو موصوف نے شیخ امان پانی پتی کے رسالہ "غیریہ" کے جواب میں لکھا تھا۔ اور اس میں آپ نے وحدت الوجود کے بعض عمیق مسائل کو اپنے کشفی رنگ میں پیش فرمایا ہے حضرت شیخ عبدالعزیز البحر المواج کے والد شیخ حسن[1] بن طاہر متوفی ۹۰۹ھ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں دہلی آ بسے تھے۔ آپ کے پوتے شیخ رفیع الدین بن قطب العالم خواجہ باقی باللہ کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ آپ شیخ وجیہ الدین کے خسر اور شیخ عبدالرحیم کے نانا تھے ۔۔۔۔ مشہور ہے کہ جس طرح مغلیہ خاندان میں سلطنت سلسلہ بہ سلسلہ چلتی رہی، اسی طرح علم و عرفان شیخ عبدالعزیز کی اولاد میں شاہ ولی اللہ تک اور شاہ ولی اللہ سے ان کی اولاد تک جاری رہا۔

شیخ عبدالرحیم جنہیں ہم آئندہ شاہ عبدالرحیم لکھیں گے، شیخ وجیہ الدین کے صاحبزادے اور شیخ رفیع الدین بن قطب العالم کے نواسے تھے۔ ان کی شادی ایک صاحب کرامات بزرگ حضرت شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی سے ہوئی شیخ محمد کا بڑا پرانا نامور خاندان تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک شیخ احمد تھے جو سلطان سکندر کے دربار میں پہنچے اور چند ہی روز میں اپنی بے نظیر قابلیت سے شاہی دربار میں وہ اعزاز و اعتبار پیدا کر لیا کہ سلطنت کی طرف سے چند قریے آپ کو مدد معاش کے لئے نسلاً بعد نسل عنایت ہوگئے۔ اور یہ خاندان دہلی کے نواح پھلت میں آباد ہو گیا۔

شاہ عبدالرحیم سے بڑے ان کے بھائی شاہ ابوالرضا محمد تھے۔ ایک بھائی اور بھی تھے لیکن ان کے حالات نہیں ملتے۔ شاہ عبدالرحیم تقریباً ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷ برس کی عمر پا کر ۱۱۳۱ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ جب آپ پیدا ہوئے، تو آپ کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین سلطنت کے ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔

---

[1] [illegible] طاہر ملتان میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں آپ کا خاندان بڑا واجب الاحترام تھا تحصیل علم کے لئے آپ [illegible] آئے اور وہاں سے بہار کا رخ کیا۔ بہار کے [illegible] نے اپنی لڑکی آپ کے عقد میں دی۔ آخر میں آپ مع خاندان جونپور آگئے۔ آپ صاحبزادے شیخ [illegible] جو بہت بلند پایہ عالم تھے۔ دہلی لے گئے سلطان سکندر آپ کا بڑا معتقد تھا۔ علم سلوک میں آپ کی کتاب "[illegible] الیقین" بڑی مشہور ہے۔ (ملخص از حیات ولی)

اور ظاہر ہے دولت وثروت کی فراوانی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے ماموں شیخ عبدالحی ایک نہایت صالح اور خداترس بزرگ تھے اور اہل دنیا سے طبعی نفرت رکھتے تھے بد قسمتی سے اپنی اولاد ان کی توقعات کے مطابق نہ نکلی ایک دفعہ انہوں نے بھی مجھے بچپن میں پورے سُنن وآداب کے ساتھ وضو کرتے دیکھا۔ تو بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ "میں ہمیشہ ڈرتا تھا کہ ہمارے اسلاف کا سِرّ ہماری اولاد سے منقطع ہو جائے گا، لیکن اب مجھے قطعی طور سے معلوم ہو گیا کہ اس سِرّ کا حامل ہمارے خاندان میں موجود ہے گو اپنی نسل میں نہ سہی بہن کی نسل میں موجود ہے"

صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں :۔ جب آپ کا نواں یا دسواں سال شروع تھا تو شرح عقائد اور حاشیہ خیالی پڑھتے تھے۔ اور معقول کی اکثر کتابیں نکال چکے تھے جس زمانے میں اورنگ زیب اکبر آباد (آگرہ) میں جلوس فرما تھا۔ آپ کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ اور اس تقریب سے آپ اکبر آباد میں مرزا محمد زاہد ہروی سے تعلیم پاتے رہے۔ ابتدائی رسائل سے شرح عقائد و حاشیہ خیالی تک تو آپ نے اپنے برادر کلاں شیخ ابوالرضا محمد سے نکالے اور شرح مواقف اور تمام کتب کلامیہ واصولیہ مرزا زاہد ہروی سے پڑھیں۔ شاہ ولی اللہ اپنے والد کے ذکر میں فرماتے ہیں "اس نیلگوں آسمان کے نیچے جناب شیخ عبدالرحیم سے زیادہ فن حدیث میں طاق اس عہد میں کوئی نہ تھا۔۔۔میں نے ان جیسا ایک شخص بھی نہیں دیکھا، جو تمام علوم میں عموماً اور حدیث اور فقہ میں خصوصاً تبحر رکھتا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد آپ جیسے محدث و مفسر، فقیہ کو ہندوستان کی گود میں پرورش پانا بہت کم نصیب ہوا ہوگا۔"

شاہ عبدالرحیم نے مرزا محمد زاہد ہروی اور خواجہ خرد بن خواجہ باقی اللہ کے علاوہ کئی اور بزرگوں سے بھی استفادہ کیا۔ جن میں خلیفہ ابوالقاسم اکبر آبادی خاص طور سے ممتاز ہیں۔ ان کی شہرت اگرچہ زیادہ تر تصوفی تحقیقات میں ہے لیکن حقیقت میں وہ تمام علوم میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ہندوستان میں مجتہدین فن تسلیم کئے جاتے تھے۔ شاہ صاحب کے ایک اور استاد عبداللہ تھے، جو اس قدر خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے کہ سننے والوں پر محویت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ عالم کے ساتھ بڑے عارف بھی تھے۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ جب خلیفہ ابوالقاسم صاحب نے مجھے تکمیل و ارشاد کی اجازت سے سرفراز فرمایا، تو ایک دعوت کا انتظام کیا۔ اور اس میں اپنے مریدوں اور جاننے والوں کو مدعو کیا

آپ نے فقیر کو طلب فرمایا۔ میرے سر پر دستار باندھی ایک اجازت نامہ لکھکر دیا۔ اور مجھے طالبان حق کی رہنمائی اور دینی علوم کی اشاعت ودرس کی اجازت دی اور یہ بھی فرمایا کہ اب اگر تم مناسب سمجھو تو دہلی میں جاکر رہو اور وہاں کے باشندوں میں دینیات کی اشاعت کرو۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے چند دن اور اکبرآباد (آگرہ) میں اپنے اُستاد کے قدموں میں رہنا پسند کیا۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق بعض بزرگوں سے ملتے رہے ۱؎

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، شاہ عبدالرحیم کے بزرگوں کا منصب و مشغلہ ابتدا میں تعلیم وتدریس اور قضا و افتاء کا تھا۔ البتہ بعد میں انہوں نے فوجی زندگی اختیار کرلی تھی۔ شاہ عبدالرحیم نے پھر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں "شاہ عبدالرحیم نے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اس میں علم حدیث کی تعلیم دینی شروع کی" مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے والد کے زمانے

۱؎ خلیفہ ابوالقاسم کے ارشاد پر شاہ عبدالرحیم نے شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے ہاں حاضری دی، جو سلسلہ چشتیہ کے ایک معمر بزرگ تھے، اور آگرہ میں رہتے تھے۔ وہ بیمار تھے، اور پلنگ پر لیٹے لیٹے شاہ صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں جیسے ہی شاہ صاحب نے اپنا خاندانی تعلق شیخ عبدالعزیز شکر بار سے ظاہر کیا آپ فوراً پلنگ سے نیچے اترے اور شاہ صاحب کو گلے سے لگالیا اور ایک سوال پوچھا۔ اس کے بعد کہا کہ میرے دادا کو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے کچھ تبرکات دیئے تھے، اور فرمایا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی آئے تو اسے یہ تبرکات دے دینا۔ چنانچہ آپ نے شاہ صاحب کے سر پر عمامہ باندھا اور اپنے طریقے کی اجازت دی۔ جب چلنے لگے تو مٹھائی اور نقد روپے بھی ساتھ کردیئے۔ شاہ صاحب نے واپس آکر اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کی خدمت میں سب ماجرا بیان کیا انہوں نے شاہ عبدالرحیم کو یہ بشارت دی ــ روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فارغ البالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ باطنی اطمینان اور اجازت کا اشارہ ہے۔" شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ اس بشارت کے بعد معاشی پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے کبھی پیدا نہیں ہوا۔ "انفاس العارفین" اور بعض دوسری کتابوں میں شاہ عبدالرحیم کی جس صاف ستھری زندگی کا پتہ ملتا ہے اس کے پڑھنے سے دل کو راحت ہوتی ہے ــــ ملخص از تذکرہ شاہ ولی اللہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

میں فقہا اور مفسرین نے عوام مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی سے قرآنی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی خارج کر دیا تھا۔
سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم نے ادھر توجہ کی اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ایک بہت اچھا طریقہ اختیار کیا اس سے پہلے علماء کا یہ دستور تھا کہ پہلے تو وہ قرآن مجید کو محض تلاوت کی خاطر پڑھا دیتے۔ پھر اگر انہیں طالب علموں کو قرآن مجید کے مطالب و معانی کی تعلیم دینا مقصود ہوتی، تو جس فن سے خود انہیں دلچسپی ہوتی، اس فن کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیر کی جو کتاب وہ مناسب سمجھتے طالب علموں کو پڑھاتے .... اس کے خلاف شاہ عبدالرحیم نے یہ کیا کہ قرآن کے متن پر زیادہ زور دیا، لیکن بجائے اس کے کہ متن قرآن محض تلاوت کی غرض سے پڑھا جاتا، یا کسی خاص فن کی تفسیر کے ذریعہ قرآن کے مطالب کو حل کرنے کی کوشش ہوتی۔ آپ یہ کرتے کہ قرآن کے متن کو شروع سے لے کر آخر تک بڑی تحقیق اور بصیرت کے ساتھ پڑھاتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کے جملہ مطالب اور معانی تک براہ راست طلبہ کی رسائی ہو جائے۔ اور وہ جان لیں کہ قرآن کا مجموعی طور پر کیا پیغام ہے۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ اپنے والد بزرگوار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "آپ کی عادت یہ تھی کہ اپنے اصحاب کے حلقے میں ہر روز قرآن مجید کے دو یا تین رکوع پڑھتے اور اس پر نہایت تدبر کرتے اور ان کے معانی پر غور و خوض فرماتے۔" ایک اور جگہ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے "خدا تعالیٰ نے مجھ ضعیف پر جو بڑے بڑے الطاف کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مجھے چند بار والد بزرگوار سے تدبر معانی، شان نزول کے بیان اور تفاسیر میں مطالب کی تحقیق کے ساتھ قرآن عظیم کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کی وجہ سے مجھ پر علم و عرفان کا ایک بڑا دروازہ کھل گیا۔" شاہ عبدالرحیم اپنے درس و تدریس میں "حکمت عملی" پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں:۔
اُس وقت حالت یہ تھی کہ عام متکلمین نے ارسطو کی نظری حکمت کو اپنا مطمح نظر بنا لیا تھا۔ اور ان کا سارا زور قیاس آرائیوں اور استدلالی بحثوں پر صرف ہوتا تھا۔ وہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے بے خبر تھے اور "حکمت عملی" سے سروکار نہ رکھتے تھے لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کلام میں دلچسپی لینے والے فقہا اور متکلمین قومی زندگی کی ضروریات میں تدبر اور تفکر سے محروم ہو گئے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے مذکورہ بالا رجحان فکری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ "حضرت شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ اخلاق سلیمہ میں

درجۂ کمال پر تھے۔ نیز دینی اور مابعد الطبیعاتی علوم میں درک کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ "عقل معاشی" سے بھی جو کے ذریعہ انسانی زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کو سمجھا جاتا ہے پورے طور پر بہرہ ور تھے۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر "حکمت عملی" اور کاروبار زندگی کے معاملات کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔"

درس و تدریس کے ان مشاغل میں انہماک کی وجہ سے شاہ عبدالرحیم ملک و ملت کے عام امور سے بالکل بے تعلق نہیں ہو گئے تھے۔ کتاب "سیرت سید احمد شہید" کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاہ عبدالرحیمؒ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں ان کا خط نظام الملک آصف جاہ اوّل کے نام ہے، جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔ اور یوں بھی مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں "شاہ صاحب کا خاندانی تعلق جس قبیلہ اور نسل سے تھا علم و تصوف کے ساتھ اس خاندان کے لوگ فوجی کاروبار میں یگانۂ روزگار تھے ــــ بلکہ شاہ عبدالرحیم سے پہلے تو شاہ صاحب کے خاندان میں علم و تصوف کی محض ثانوی حیثیت تھی اصلی کام اس خانوادہ کا جہاد ہی تھا۔ آپ (شاہ ولی اللہ) کے براہ راست جدِّ امجد یعنی شیخ وجیہہ الدین کے واقعات تو خود شاہ (شاہ ولی اللہ) نے اپنی مختلف کتابوں میں درج کئے ہیں، جن کو سنکر حیرت ہوتی ہے" اس سے آگے مولانا گیلانی مرحوم فرماتے ہیں :۔ "اور کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری ہی پشت میں حضرت شاہ صاحب کے گزرنے سے جو وہ مرد غازی مولانا اسمٰعیل شہید اٹھے، اور ایک مدت تک بجائے قلم کے تلوار کو کمر سے لگائے رہے۔ تاایں کہ اس راہ میں بالآخر جان عزیز بھی نذر کی، یہ شاہ صاحب کی کسی اندرونی تربیت کا نتیجہ نہ تھا جس کا رواج ان کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔"

عام زندگی میں شاہ عبدالرحیم کا کیا مسلک تھا، مندرجہ ذیل سطور میں اس کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں :۔ ایک بار والد بزرگوار نماز ظہر کے قریب دفعتہً میری طرف متوجہ ہوئے اور برجستہ یہ رباعی پڑھی ۔

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر — خاطر کس را مرنجاں الحذر
در طریقت رکن اعظم حرمت است — ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

یہ رباعی پڑھ کر فرمایا۔ ولی اللہ! یہ رباعی لکھ لو۔ حق تعالیٰ نے دفعتہً میرے دل میں اس مضمون کو بایں غرض القا فرمایا ہے کہ تمہیں وصیت کروں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب جب احباب کو رخصت کیا کرتے، تو الوداع کہتے ہوئے یہ بیت پڑھا کرتے تھے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

نیز فرماتے تھے کہ جو لوگ تم سے قدر و منزلت میں کم درجے پر ہوں، اگر وہ تمہیں سلام کرنے میں پہل کریں تو اسے خدا تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھو اور ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات کرو۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ میتواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر میکنند

ایک دفعہ شاہ عبدالرحیم سے ایک معتقد نے سوال کیا کہ ابنائے روزگار کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ فرمایا کن فی الناس کاحدمن النّاس (لوگوں میں اس طرح رہو جیسے تم ان میں سے ایک ہو) پھر اس نے دریافت کیا کہ حضرت حق تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے، فرمایا۔ رجالٌ لا تلھیھم تجارۃ ولا بیعٌ عن ذکراللّٰہ (وہ ایسے لوگ ہیں کہ نہ تو تجارت اور خرید و فروخت ہی انہیں ذکراللہ سے غافل کرتی ہے)

شاہ عبدالرحیم کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان کے بڑے بھائی شاہ ابوالرضا محمد کا بڑا حصہ ہے۔ "حیاتِ ولی" میں لکھا ہے "ابتدا میں شاہ عبدالرحیم کی اتالیقی آپ ہی کے سپرد تھی۔ اگرچہ شاہ عبدالرحیم کی تعلیم پر دیگر ماہرین فن بھی چار سال کی عمر میں مقرر تھے۔۔۔ لیکن پوری پوری خدمتِ تربیت شیخ ابوالرضا محمد ہی کے ہاتھ میں تھی۔۔۔۔" "شوارق المعرفہ" میں ہے کہ شیخ ابوالرضا محمد متعدد علوم میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے تھے اور اسے فطرت کی بخشش و عنایت سمجھنا چاہیئے کہ آپ کا ذہن و حافظہ اس بلا کا تھا کہ ایک ہی نشست میں مختلف علوم تحصیل کرتے تھے۔" ظاہری علوم سے فارغ ہونے کے بعد آپ حضرت خواجہ باقی باللہ کے فرزند رشید جناب

خواجہ خرد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کمالات باطنی حاصل کئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، شاہ عبدالرحیم اور شاہ شیخ ابوالرضا محمد کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین عالمگیر کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن ان کے دونوں صاحبزادے شاہی دربار سے بے تعلق رہے۔ اور درس و تدریس ہی کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ شیخ ابوالرضا محمد کے متعلق "حیات ولی" میں لکھا ہے۔ اوّل

اوّل اگرچہ آپ بصوابدید والد بزرگوار اس زمانے کے امراء سے ملتے جلتے تھے، اور شاہی دربار سے ایک معزز و ممتاز عہدہ بھی آپ کے لئے نامزد ہو گیا تھا۔ لیکن دفعتہً آپ کی فطری استعداد ظہور پذیر ہوئی اور آپ نے عزلت نشینی، تجرید تام، توکل کلی، ہر حال میں سنت نبوی پر عمل کرنا اختیار کیا۔ اور یک لخت ابنائے دنیا حتیٰ کہ عزیز و اقارب سے بھی ملنا ترک کر دیا۔

اوّل اوّل آپ طلبا کو ہر قسم کے علوم و فنون کا درس دیتے تھے۔ اور مختلف علوم کے شائقین جوق در جوق حاضر ہوتے تھے لیکن آخر میں بجز تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف کے اور کسی علم کا درس دینا پسند نہ کرتے تھے۔ آپ کا دستور تھا کہ نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔۔ ہر درجے اور مرتبے کے آدمی جن میں طالب علم، علماء، فضلاء، صوفیہ، رئیس شہزادے وغیرہ ہوتے تھے، سب آ آکر جمع ہو جاتے تھے۔۔۔ ان کا ایک مشہور قول ہے ہمارے عرفائے زمانہ کو ذاتی تجلی میسر نہیں ہے، ورنہ اپنے، اپنی اولاد و اقارب کے حصول اغراض کے لئے سلاطین کے محتاج نہ ہوتے۔

شاہ ابوالرضا محمد کی طرح شاہ عبدالرحیم بھی دربار شاہی سے بے تعلق رہے۔ ان کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جب وہ طالب علم تھے اور فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہو رہی تھی تو ان کے ایک دوست نے انہیں اس کام میں شریک ہونے پر آمادہ کیا، لیکن شاہ عبدالرحیم صاحب نے انکار کر دیا۔ جب اس انکار کی خبر شاہ صاحب کی بیوہ والدہ کو ہوئی تو وہ برہم ہوئیں اور اصرار کر کے حکماً نوکری قبول کرنے پر مجبور کیا چنانچہ شاہ صاحب تدوین فتاویٰ عالمگیری سے متعلق ہو گئے، مگر جب یہ خبر ان کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو وہ ناخوش ہوئے اور ترک ملازمت پر زور دیا۔ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم کا عذر پیش کیا، لیکن آپ کے مرشد برابر مُصر رہے۔ آخر شاہ صاحب نے خلیفہ ابوالقاسم صاحب سے عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ نوکری چھوٹ

جائے۔ ورنہ یوں چھوڑوں گا تو والدہ ناراض ہوں گی چنانچہ ترک ملازمت کے لئے دعا کرائی گئی۔ اور وہ قبول ہوئی بعد میں عالمگیر نے زمین دینی چاہی لیکن شاہ صاحب کے الفاظ میں "میں نے قبول نہیں کیا اور شکر ادا کیا"[1]

شاہ عبدالرحیم کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اس بارے میں شاہ عبدالعزیز کا یہ قول ان کے ملفوظات میں ہے "حکمت ہم درخاندان ما معمول بود۔ چنانچہ جدّ بزرگوار و عمّ فقیر دوامی کردند والدما جد بندہ موقوف ساختہ" صفحہ ۲۳

یہ خاندان عربی النسل تھا۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضؓ تک پہنچتا ہے اور والدہ کی جانب سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک تحقیقی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خاندان نے سرزمین عرب کو کیسے چھوڑا، لیکن شاہ ولی اللہ نے جو شجرہ نسب بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضؓ کے بعد پانچویں پشت میں افراد خاندان کے ناموں میں عجمیت آگئی تھی۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو ہندوستان آئے، اور رہتک میں آباد ہوئے، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، شیخ شمس الدین مفتی تھے۔

شاہ عبدالرحیم کی ساٹھ سال کی عمر تک کوئی اولاد نہ تھی ایک دفعہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار کی زیارت کو گئے، آپ پر منکشف ہوا کہ آپ کے ہاں اور اولاد ہوگی۔ اس پر شاہ عبدالرحیم نے ایک بزرگ شیخ محمد کی صاحبزادی سے عقد فرمایا۔ جس سے شاہ ولی اور دو صاحبزادے اور ہوئے شادی کے بعد شاہ عبدالرحیم سترہ اٹھارہ سال تک زندہ رہے۔

(اس سلسلے کا دوسرا مضمون جس میں اس عہد کے سیاسی و معاشی حالات کا جائزہ ہوگا اگلے شمارے میں شائع ہوگا۔)

---

[1] ماخوذ از تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

وحدت دین کا تصور

ڈاکٹر عبدالواحد ھالے پوتا

قانونِ ارتقاء کے تحت جیسے جیسے معاشرہ اپنی ابتدائی منزل سے، جسے شاہ ولی اللہ صاحب نے "ارتفاق اوّل" کا نام دیا ہے، ترقی کرکے اعلیٰ منازل کی طرف جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مذہب کے اسلوب، طریقہائے اظہار یا انہیں آپ مناہج اور رسوم کہہ لیں، بدلتے جاتے اور ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ اس خیال کے حامیوں کے نزدیک مذہب انسان کا فطری خاصہ ہے جو اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے فطری کردار اور اعمال پر محیط ہوتا ہے۔ اور وہ اسی طرح عمومی قانون فطرت ہے، جیسے دوسرے حیاتیاتی قوانین ہیں۔ اور جس طرح پوری انسانی زندگی میں، جس کے یہ حیاتیاتی قوانین ایک حصہ ہیں، ارتقاء کا عمل ہوتا رہا ہے، ایسے ہی مذہب کا عملی اظہار جن شکلوں اور صورتوں میں ہوتا ہے ان میں بھی تاریخ کے ادوار میں ارتقاء جاری رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسانوں میں ستارہ پرستی عام تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ ان لوگوں کے حالات کے مطابق ہو، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس کو ختم کیا، اور ستاروں کے ذریعہ خدا تک پہنچنے کے بجائے براہ راست غیر مشہود خدائے مطلق کی عبادت کا طریقہ رائج فرمایا۔[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ میں ہے :۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہے تو مدبّر کل، لیکن اپنے مخصوص

(باقی حاشیہ صلا پر)

مظاہر فطرت کو قدرت خداوندی کا جلوہ سمجھنے کے بجائے انہیں خود ذات خداوندی کا قائم مقام بنا لینا ارتقائے انسانی کی ابتدائی منزلوں میں عام تھا، اس دور میں انسان کے لئے یہ ایک امر محال تھا کہ وہ ذات خداوندی کا عالم تجرّد میں ادراک کر سکے۔ وہ ان مظاہر کو خدائی صفات کا حامل قرار دے دیتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ایک اعلیٰ و برتر اور منزہ اور مجرّد ذات خداوندی کا تصوّر پیش فرمایا۔ اور مظاہر کو مظاہر کا درجہ دیا۔

بندوں کی شفاعت قبول کرتا ہے۔ اس لئے وہ ان مخصوص بندوں کو "عباد اللہ" کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ عام یہود و نصاری اور ہمارے زمانے کے بعض مسلمانوں میں یہ مرض ہے۔ اور چونکہ شریعت کی بنا اس پر ہے کہ مشتبہ امور کو قائم مقام اصل کے نہ گردانا جائے۔ اس لئے وہ امور محسوسہ جن سے شرک کا شبہ ہو سکتا ہے شریعت نے کفر گردانا۔ جیسا کہ بتوں کے سامنے سجدہ کرنا، ان کے لئے جانور ذبح کرنا وغیرہ۔

اِس علم کے بارے میں پہلی مرتبہ مجھے یوں انکشاف ہوا کہ میرے سامنے ایک ایسی قوم پیش کی گئی، جو ایک چھوٹی سی مکھی کے سامنے جو ہر وقت اپنی دُم اور بازو ہلایا کرتی تھی، سجدہ کر رہی تھی۔ پھر میرے قلب میں القاء ہوا کہ کیا تم اس کے اندر شرک کی تاریکی پاتے ہو اور جس عصیاں نے بت پرستوں کو گھیر لیا ہے وہ ان پر بھی محیط ہے؟ میں نے کہا، نہیں۔ ان کے اندر میں یہ چیز نہیں پاتا۔ کیونکہ ان لوگوں نے مکھی کو معبود نہیں گردانا بلکہ قبلہ گردانا ہے۔ اور تذلل و انکساری اور شرف و عزت کے اصل درجہ کو مخلوط نہیں کیا ہے اس پر مجھ سے کہا گیا کہ تم نے واقعی اس کا اصل راز پالیا۔ چنانچہ اس دن سے میرا قلب اسی علم سے معمور ہو گیا اور میں علم و بصیرت کی منزل تک پہنچ گیا۔ اور توحید و شرک اور شریعت نے جن امور کو مظنۂ توحید یا مظنۂ شرک گردانا ہے اس کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو گیا۔ اور عبادت و تدبیر میں کیا ربط اور تعلق ہے، اس سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ اور مجھے پوری پوری معرفت حاصل ہو گئی۔ واللہ اعلم"

ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے ستاروں کی معبود نہیں، بلکہ قبلہ سمجھ کر عبادت کی جاتی ہو اور چونکہ اس میں مظنۂ شرک تھا، اسی لئے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہو، اس کے بعد حضرت ابراہیم سے براہ راست اَن دیکھے خدا کی عبادت کا طریقہ رائج ہوا۔

اگر ہم دنیا کے بڑے مذاہب کا ان کے جو اخلاقی، فلسفیانہ، عباداتی اور روحانی پہلو ہیں اس لحاظ سے مطالعہ کریں، تو ہمیں ان میں ارتقاء کے جو اعلیٰ درجات ہیں، ان تک انسان کے پہنچنے کے لئے جو نہایت ہی ضروری اور لابدی ذرائع ہیں۔ ان کے بارے میں عظیم صداقتیں اور اہم خیالات ملیں گے۔ جو کہ باقیات صالحات ہیں ان پیغامات کی جو وقتاً فوقتاً انسانیت کو دیئے گئے ہیں۔ ان عظیم پیغامات کی ایک جھلک ان مذاہب کے ادب اور ان کی تعلیمات کے مطالعہ میں آپ کو مل سکے گی، جو یہ ہیں۔ ہندو مت۔ بدھ مت، زرتشتیت، کنفیوشنیزم، ٹاؤازم، یہودیت، عیسائیت، اور اسلام۔

یہ آٹھ مذاہب دنیا میں عظیم ادب، عظیم فن اور عظیم موسیقی کے سب سے بڑے سرچشمہ رہے ہیں۔ اور جب آپ ان کا جائزہ لیں۔ اور ان کا باہم مقابلہ کریں تو یہ حیرت انگیز حقیقت واشگاف ہوگی کہ جہاں ان میں کئی ایک معمولی اور بعض اوقات کئی بڑے امور میں وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں، وہاں ان میں انسان کے خدا تک پہنچنے نیز خدا کی صفات کے متعلق، خواہ اس کی اپنی ذات کے بارے میں خواہ اپنی مخلوقات سے اس کے تعلق کے بارے ہیں، جو وسیع تر اصول ہیں، وہ ان سب مذاہب میں آپس میں ملتے ہیں، اور اگر وہ مختلف بھی ہیں تو ان میں تضاد نہیں، بلکہ ہم آہنگی ہے گویا جس طرح ایک ہی سورج کی روشنی مختلف رنگوں کے شیشوں کی کھڑکیوں میں منعکس ہوتی ہے، اسی طرح ایک خدا کے بارے میں ایک ہی حقیقت مختلف دماغوں کے مختلف شیشوں کے ذریعہ دنیا میں منعکس ہوئی ہے۔ [ل]

شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ایک باب کا عنوان ہے :۔ "تمام مذاہب و ادیان کی اصل ایک ہے۔ شرائع، مناہج، طریقے مختلف ہیں"۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا (اس نے تمہارے لئے دین کا وہ راستہ ٹھہرایا ہے، جس پر چلنے کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور اے پیغمبر! تمہاری طرف

ل The Divine Universe by H. N. Spalding P P 1-2

بھی ہم نے اسی راستہ کی وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا) حضرت مجاہد نے اس آیت کی تفسیر اور معنی یہ کئے ہیں کہ اے محمد! ہم نے تم کو اور ان کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون۔ فتقطعوا امرھم بینھم زبراً کل حزب بما لدیھم فرحون (اور یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہے۔ تو تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ ڈالکر اپنا اپنا دین جدا کر لیا۔ اور جو دین جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہے) یعنی تمہاری ملت اور تمہارا دین وملّت اسلام ہے اور مشرکین، یہود اور نصاریٰ نے اس میں پھوٹ ڈال دی۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا (اور ہم نے وقتاً فوقتاً تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریقہ خاص ٹھہرایا) اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں شریعت اور منہاج کے معنی راہ اور طریقے کے ہیں۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ (ہم نے ہر ایک امت کے لئے عبادت کے طریقے قرار دیئے کہ وہ ان پر چلتے رہیں"

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:" معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل دین ایک ہے اور تمام انبیائے کرام اس پر متفق ہیں۔ تمام انبیائے کرام کا اتفاق ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے، اس کی عبادت کی جائے ۔۔۔۔ قیامت حق ہے، مرنے کے بعد زندہ ہونا حق ہے ۔۔۔۔۔ اسی طرح تمام انبیائے کرام بر یعنی نیکی کے اصولی اقسام پر بھی متفق ہیں ۔۔۔ اور اسی طرح تمام انبیائے کرام نکاح کی ضرورت، زنا کی حرمت عدل و انصاف قائم کرنے، ظلم و جور کی حرمت ۔۔۔۔۔ پر متفق ہیں۔

" یہ امور ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن کے مخاطب تھے۔ بطور مسلّمات کے تھے اور اگر اختلاف تھا تو صرف ان امور کی صورتوں اور شکلوں میں تھا ۔۔۔ حاصل کلام یہ کہ وہ خاص خاص صورتیں اور مخصوص ہیئتیں جو مختلف قسم کی نیکیوں اور تدبیر منزل و معاشی اور سیر معاشرت کی آسانیوں ...

صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستانِ ما پرید

اور آخر میں فرماتے ہیں :-

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

اگر محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان کی ملی تاریخ کے تابناک اوراق اور پائیدار نقوشِ عظمت سے متعارف کرانے میں اس طرح کامیاب ہو جائے تو یہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا، اور قومی تعمیر میں اس کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ہم بڑی مسرت سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ پروفیسر غلام حسین جلبانی صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے، اور اب وہ اس کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ امید ہے ہم بہت جلد حضرت شاہ ولی اللہ پر انگریزی زبان میں ایک ایسی کتاب جو اجمالی طور سے ان کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگی، شائع کر سکیں گے۔ پروفیسر جلبانی صاحب کی یہ کتاب سندھی اور اردو میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان حضرات کے لئے جو ان دونوں زبانوں سے ناواقف ہیں، حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس منعقدہ ۱۵ اگست میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اکیڈمی کے زیر اہتمام الرحیم کا سندھی میں ایک سہ ماہی ایڈیشن نکالا جائے، جس میں اردو ایڈیشن کی طرح حکمت ولی اللہی اور دوسرے اسلامی مسائل پر مضامین ہوں گے۔

شاہ ولی اللہ — تاریخی پس منظر

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ اپنے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں:[1] "یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اجداد عظام میں سب سے پیشتر حضرت شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے۔ اور انہوں نے قصبہ رہتک میں سکونت اختیار کی۔" رہتک دہلی سے کوئی تیس میل دور ہے۔ اور اس زمانے میں یہ بڑا آباد شہر تھا۔ شیخ شمس الدین ایک بزرگ شیر ملک کے بیٹے اور محمد عطا ملک کے پوتے تھے جن کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رہتک میں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کے پرپوتے شیخ عبدالملک کے عہد میں قضا و احتساب اور افتاء کے عہدے اس خاندان میں موروثی کر دیئے گئے۔ چنانچہ شیخ عبدالملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں قاضی بدھا کی اولاد میں سے شیخ محمود تھے جنہوں نے منصبِ قضا ترک کر کے "اعمال سلطانیہ" اختیار کر لئے۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے سے سپاہیانہ زندگی اچھی اور انسب و اولیٰ ہے۔" شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد تھے۔ جن کی تربیت شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم نے کی، جو رہتک میں نہیں بلکہ سونی پت میں رہتے تھے۔ شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور کی شادی بھی اپنے ننھیال میں ہوئی اور اسی طرح ان دونوں خاندانوں کا سلسلہ اکٹھا ہو گیا۔

یہ شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم جلال الدین اکبر کے دور میں تھے، اور بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ آپ نے راجپوتانہ کے قلعہ چتوڑ کی فتح کی پیش گوئی کی تھی چنانچہ چند ہی روز گزرے تھے کہ چتوڑ کی فتح اسی اسلوب و طریقہ پر بادشاہ کی

---

[1] اس حصۂ مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر حیاتِ ولی از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی سے مدد لی گئی ہے۔ — مدیر

اور آخر میں فر [illegible]

اگر محکمۂ اوقاف [illegible]

اوراق اور پائیدار نقو [illegible]

کا ایک بہت [illegible]

ہم بڑی مسرت سے [illegible] پیر غلا [illegible]

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نے اپنی کتاب [illegible]
اور اب وہ اس کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ امید ہے ہم بہت جلد حضرت شاہ [illegible] کتاب
جو اجمالی طور سے ان کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگی، شائع کر سکیں گے۔ پروفیسر جلبانی صاحب کی یہ
کتاب سندھی اور اردو میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان حضرات کے لئے جو ان دونوں زبانوں سے
ناواقف ہیں، حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس منعقدہ ۵ اگست میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اکیڈمی
کے زیر اہتمام الرحیم کا سندھی میں ایک سہ ماہی ایڈیشن نکالا جائے، جس میں اردو ایڈیشن کی طرح
حکمت ولی اللہی اور دوسرے اسلامی مسائل پر مضامین ہوں گے۔

تاریخی پس منظر

خاندانی حالات

ولی اللہ اپنے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں:- "یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اجداد عظام میں سب سے پیشتر
س الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے۔ اور انہوں نے قصبہ رہتک میں سکونت اختیار کی"۔ رہتک دہلی سے کوئی
ہے۔ اور اُس زمانے میں یہ بڑا آباد شہر تھا۔ شیخ شمس الدین ایک بزرگ شیر ملک کے بیٹے اور محمد عطا ملک کے
جن کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رہتک میں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان
کے پرپوتے شیخ عبدالملک کے عہد میں قضاء احتساب اور افتاء کے عہدے اس خاندان میں موروثی کردیئے گئے۔ چنانچہ شیخ
عبدالملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں قاضی بدھا کی اولاد میں سے شیخ محمود تھے
نہوں نے منصب قضا ترک کرکے "اعمال سلطانیہ" اختیار کرلئے۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ "موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے
سے سپاہیانہ زندگی اچھی اور انسب و اولیٰ ہے"۔ شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد تھے۔ جن کی تربیت شیخ عبدالغنی
بن شیخ عبدالحکیم نے کی، جو رہتک میں نہیں بلکہ سونی پت میں رہتے تھے۔ شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور کی شادی بھی اپنے
ننھیال میں ہوئی اور اسی طرح ان دونوں خاندانوں کا سلسلہ اکٹھا ہوگیا۔

یہ شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم جلال الدین اکبر کے دور میں تھے، اور بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ آپ نے
راجپوتانہ کے قلعہ چتوڑ کی فتح کی [illegible] تھے کہ چتوڑ کی فتح اسی اسلوب و طریقہ پر بادشاہ کی

---

[1] اس حصہ مضمون کی ترتیب میں [illegible] اور مولانا محمد رحیم بخش دہلوی سے مدد لی گئی ہے۔ مدیر

صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستانِ ما پرید

اور آخر میں فرماتے ہیں :-

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

اگر محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان کی ملی تاریخ کے تابناک اوراق اور پائیدار نقوشِ عظمت سے متعارف کرانے میں اس طرح کامیاب ہو جائے تو یہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا، اور قومی تعمیر میں اس کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

ہم بڑی مسرت سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ پروفیسر غلام حسین جلبانی صدر شعبۂ عربی سندھ یونیورسٹی اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" کا انگریزی ترجمہ مکمل کر لیا ہے، اور اب وہ اس کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ امید ہے ہم بہت جلد حضرت شاہ ولی اللہ پر انگریزی زبان میں ایک ایسی کتاب جو اجمالی طور سے ان کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگی، شائع کر سکیں گے۔ پروفیسر جلبانی صاحب کی یہ کتاب سندھی اور اردو میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان حضرات کے لئے جو ان دونوں زبانوں سے ناواقف ہیں، حضرت شاہ صاحب کی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔

اکیڈمی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس منعقدہ ۱۵ اگست میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ اکیڈمی کے زیر اہتمام الرحیم کا سندھی میں ایک سہ ماہی ایڈیشن نکالا جائے، جس میں اردو ایڈیشن کی طرح حکمت ولی اللہی اور دوسرے اسلامی مسائل پر مضامین ہوں گے۔

شاہ ولی اللہؒ ــ تاریخی پس منظر

خاندانی حالات

شاہ ولی اللہ اپنے بزرگوں کے ذکر میں لکھتے ہیں:- "یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے اجداد عظام میں سب سے پیشتر حضرت شیخ شمس الدین مفتی ہندوستان تشریف لائے۔ اور انہوں نے قصبہ رہتک میں سکونت اختیار کی"۔ رہتک دہلی سے کوئی تیس میل دور ہے۔ اور اس زمانے میں یہ بڑا آباد شہر تھا۔ شیخ شمس الدین ایک بزرگ شیر ملک کے بیٹے اور محمد عطا ملک کے پوتے تھے جن کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے رہتک میں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کے پرپوتے شیخ عبدالملک کے عہد میں قضاء و احتساب اور افتاء کے عہدے اس خاندان میں موروثی کر دیئے گئے۔ چنانچہ شیخ عبدالملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی بدھا اس منصب پر فائز ہوئے۔ انہیں قاضی بدھا کی اولاد میں سے شیخ محمود تھے جنہوں نے منصبِ قضا ترک کر کے "اعمال سلطانیہ" اختیار کر لئے۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ "موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے سے سپاہیانہ زندگی اچھی اور انسب و اولیٰ ہے"۔ شیخ محمود کے صاحبزادے شیخ احمد تھے۔ جن کی تربیت شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم نے کی، جو رہتک میں نہیں بلکہ سونی پت میں رہتے تھے۔ شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور کی شادی بھی اپنے ننھیال میں ہوئی اور اسی طرح ان دونوں خاندانوں کا سلسلہ اکٹھا ہو گیا۔

یہ شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم جلال الدین اکبر کے دور میں تھے، اور بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ آپ نے راجپوتانہ کے قلعہ چتوڑ کی فتح کی پیش گوئی کی تھی چنانچہ چند ہی روز گزرے تھے کہ چتوڑ کی فتح اسی اسلوب و طریقہ پر بادشاہ کی

---

[1] اس حصۂ مضمون کی ترتیب میں زیادہ تر حیات ولی از مولانا محمد رحیم بخش دہلوی سے مدد لی گئی ہے۔　　مدیر

خدمت میں معروض ہوئی، جیسا کہ جناب شیخ عبدالغنی صاحب نے بیان فرمایا تھا۔ اس پر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور اپنی فیاضانہ ہمت سے باوریخ گاؤں جناب امام ناصرالدین شہید کے مزار کی نذر کر دیئے اور شیخ عبدالغنی کے نام ایک شاہی فرمان جاری ہوا۔ کہ ان قصبات کی سالانہ آمدنی آپ کی تفویض میں ہمیشہ رہے گی۔"

انہیں شیخ عبدالغنی صاحب کے متعلق "حیات ولی" میں ایک اور واقعہ منقول ہے:۔

"خواجہ محمد ہاشم کشمی شیخ مجدد یعنی حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی قدس سرہ سے ناقل ہے کہ شیخ مجدد فرماتے ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار ایک مدت تک جناب شیخ عبدالغنی صاحب کی ملاقات کے جویاں رہے جو شہر سونی پت کے ایک کامل درویش اور مشہور و معروف بزرگ تھے ہمارے والد بزرگوار کو آپ سے نیاز حاصل کرنے اور خدمت میں حاضر ہونے کا اس لحاظ سے اور بھی بے تابانہ شوق تھا کہ انہیں کسی معتبر ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ شیخ عبدالغنی صاحب اپنے بزرگ و محترم پیر کا ایک خاص راز مضمر رکھتے ہیں۔"

شیخ منصور جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان کے ہاں شیخ عبدالغنی صاحب کی پوتی سے دو صاحبزادے ہوئے ایک شیخ معظم اور دوسرے شیخ اعظم۔ شیخ معظم کے بیٹے شیخ وجیہ الدین تھے، جو شیخ عبدالرحیم کے والد بزرگوار ہیں، جن کے ہاں ۱۱۱۴ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے تھے۔ شیخ معظم کے حالات میں صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں:۔

"جب شیخ معظم علمی تحصیل سے فارغ ہوئے تو آپ کی طبیعت بے اختیارانہ جوش کے ساتھ سپاہیانہ فنون کی تحصیل اور تحصیل کے ساتھ تکمیل کی طرف دوڑی۔ گو آپ کی طرز معاشرت بالکل درویشانہ اور عالمانہ تھی لیکن آپ کی پر شوق اور تیز نظریں اس لاجواب اور عدیم المثال شجاعت کی طرف بڑی شتابی کے ساتھ اٹھ رہی تھیں، جو زمانہ سابق میں اسلام اور بانیان اسلام کے حق میں فطرت کی عام بخششیں سمجھی گئی تھیں۔۔۔"

"شیخ معظم کے والد بزرگوار شیخ منصور بھی بہت بڑے شجاع اور دلیر تھے۔"

شیخ عبدالرحیم (والد شاہ ولی اللہ) نے اپنے دادا شیخ معظم اور پردادا شیخ منصور کی بہادری کے بہت سے واقعات ذکر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے والد شیخ وجیہ الدین کا ذکر کرتے ہیں فرماتے ہیں۔ میرے واجب الاحترام والد نہایت محتاط اور متورع آدمی ہیں۔ چونکہ آپ کا قالب بالکل سپاہیانہ تھا اور آپ فطرتاً چاق و چوبند تھے، اس لئے شمشیر زنی اور اپنی بے خوف شجاعت کے جوہر ظاہر کرنے کا آپ کو زیادہ شوق تھا

یہی وجہ تھی کہ آپ ابتدائی زمانے سے سلطنت مغلیہ کی فوج میں بھرتی ہوگئے تھے۔ اور اپنے کارہائے نمایاں کے صلے میں کوئی بڑا اور معزز فوجی عہدہ رکھتے تھے۔۔۔ اس وقت شاہجہاں بادشاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ شیخ عبدالرحیم نے بعض ان معرکوں کا ذکر کیا ہے جن میں شیخ وجیہ الدین نے اپنی شجاعت و جرأت کے جوہر دکھائے تھے۔

عالمگیر کی تخت نشینی پر جب اس میں اور اس کے بھائی شاہ شجاع میں موضع کھجوہ پر خونریز جنگ ہوئی تھی، تو اس میں شیخ وجیہ الدین اورنگ زیب عالمگیر کی طرف تھے ان کی بہادری کی بدولت جنگ کا ایک اہم مورچہ سر ہوا تھا۔ جس کی تفصیل "حیات ولی" میں یوں ہے۔

لڑائی کے دوسرے دن شاہ شجاع نے دو تین کوہ پیکر مست ہاتھی عالمگیر کے لشکر کی طرف دھکیل دیئے۔ جن کے پیچھے زرہ پوش سپاہی تھے۔ شاہ شجاع کا یہ حملہ بڑا کامیاب رہا اور عالمگیر کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیخ وجیہ الدین نے اپنے مورچے پر کھڑے جو یہ صورت حال دیکھی۔ تو اپنے ساتھیوں کو لے کر ہاتھیوں کی طرف بڑھے اور سب سے پہلے اس ہاتھی پر حملہ کیا، جو سب سے سرکش تھا، ہاتھی نے سونڈ بڑھا کر آپ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا آپ نے تلوار کا ایک وار کیا، جس سے اس کی سونڈ کٹ گئی اور وہ چنگھاڑتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگا۔ اس کا بھاگنا تھا کہ زرہ پوشوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور شاہ شجاع کے لشکر کو شکست ہوگئی۔

عالمگیر نے اس فتح کی خوشی میں ایک شاندار جلسہ کیا اور چونکہ وہ عین معرکہ میں جناب شیخ وجیہ الدین صاحب کی بہادرانہ کوشش اور وفادارانہ جوش کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکا تھا اس لئے اس نے آپ کو بہت انعامات دیئے اور خود اپنے ہاتھ سے آپ کی کمر میں تلوار باندھی۔

شاید سیواجی کا زمانہ تھا، شیخ وجیہ الدین دکن جا رہے تھے کہ راستے میں راہزنوں سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ جس میں آپ شہید ہوگئے۔

شیخ وجیہ الدین کی شادی شیخ رفیع الدین محمدؒ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو ایک مشہور خانوادہ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد شیخ قطب العالم اور دادا شیخ عبدالعزیز دہلوی البحر المواج عرف شکر بار تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحومؒ امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف" میں لکھتے ہیں:۔ "چشتی طریقے میں حضرت

شیخ عبدالعزیز دہلوی متوفی ۹۷۵ھ ایک بہت بڑے عالم، عارف اور متشرع بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں ایک رسالہ "عینیہ" ہے جو موصوف نے شیخ امان پانی پتی کے رسالہ "غیریہ" کے جواب میں لکھا تھا۔ اور اس میں آپ نے وحدت الوجود کے بعض عمیق مسائل کو اپنے کشفی رنگ میں پیش فرمایا ہے۔ حضرت شیخ عبدالعزیز البحر المواج کے والد شیخ حسن[1] بن طاہر متوفی ۹۰۹ھ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں دہلی آ بسے تھے۔ آپ کے پوتے شیخ رفیع الدین بن قطب العالم خواجہ باقی باللہ کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ آپ شیخ وجیہ الدین کے خسر اور شیخ عبدالرحیم کے نانا تھے ..... مشہور ہے کہ جس طرح مغلیہ خاندان میں سلطنت سلسلہ بہ سلسلہ چلتی رہی، اسی طرح علم و عرفان شیخ عبدالعزیز کی اولاد میں شاہ ولی اللہ تک اور شاہ ولی اللہ سے ان کی اولاد تک جاری رہا۔

شیخ عبدالرحیم جنہیں ہم آیندہ شاہ عبدالرحیم لکھیں گے، شیخ وجیہ الدین کے صاحبزادے اور شیخ رفیع الدین بن قطب العالم کے نواسے تھے۔ ان کی شادی ایک صاحب کرامات بزرگ حضرت شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی سے ہوئی شیخ محمد کا بڑا پرانا نامور خاندان تھا۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک شیخ احمد تھے جو سلطان سکندر کے دربار میں پہنچے اور چند ہی روز میں اپنی بے نظیر قابلیت سے شاہی دربار میں وہ اعزاز و اعتبار پیدا کر لیا کہ سلطنت کی طرف سے چند قریئے آپ کو مدد معاش کے لئے نسلاً بعد نسل عنایت ہوگئے۔ اور یہ خاندان دہلی کے نواح پھلت میں آباد ہو گیا۔

شاہ عبدالرحیم سے بڑے ان کے بھائی شاہ ابوالرضا محمد تھے۔ ایک بھائی اور بھی تھے لیکن ان کے حالات نہیں ملتے۔ شاہ عبدالرحیم تقریباً ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷ برس کی عمر پا کر ۱۱۳۱ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ جب آپ پیدا ہوئے، تو آپ کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین سلطنت کے ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔

---

[1] شیخ طاہر ملتان میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں آپ کا خاندان بڑا واجب الاحترام تھا۔ تحصیل علم کے لئے آپ تھانیسر آئے اور وہاں سے بہار کا رخ کیا۔ بہار کے قاضی نے اپنی لڑکی آپ کے عقد میں دی۔ آخر میں آپ مع خاندان جونپور آگئے۔ آپ کے صاحبزادے شیخ حسن جو بہت بلند پایہ عالم تھے۔ دہلی آگئے۔ سلطان سکندر آپ کا بڑا معتقد تھا۔ علم سلوک میں آپ کی کتاب "مفتاح الفیض" بڑی مشہور ہے۔ (ملخص از حیات دہلی)

اور ظاہر ہے دولت و ثروت کی فراوانی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے ماموں شیخ عبدالحی ایک نہایت صالح اور خداترس بزرگ تھے اور اہل دنیا سے طبعی نفرت رکھتے تھے بدقسمتی سے اپنی اولاد ان کی توقعات کے مطابق نہ نکلی ایک دفعہ انہوں نے مجھے بچپن میں پورے سُنن و آداب کے ساتھ وضو کرتے دیکھا۔ تو بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ میں ہمیشہ ڈرتا تھا کہ ہمارے اسلاف کا سِرّ ہماری اولاد سے منقطع ہو جائے گا، لیکن اب مجھے قطعی طور سے معلوم ہو گیا کہ اس سِرّ کا حامل ہمارے خاندان میں موجود ہے گو اپنی نسل میں نہ سہی بہن کی نسل میں موجود ہے۔"

صاحب "حیات ولی" لکھتے ہیں :- جب آپ کا نواں یا دسواں سال شروع تھا تو شرح عقائد اور حاشیہ خیالی پڑھتے تھے۔ اور معقول کی اکثر کتابیں نکال چکے تھے جس زمانے میں اورنگ زیب اکبرآباد (آگرہ) میں جلوس فرما تھا۔ آپ کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ اور اس تقریب سے آپ اکبرآباد میں میرزا محمد زاہد ہروی سے تعلیم پاتے رہے۔ ابتدائی رسائل سے شرح عقائد و حاشیہ خیالی تک تو آپ نے اپنے برادر کلاں شیخ ابوالرضا محمد سے نکالے اور شرح مواقف اور تمام کتب کلامیہ و اصولیہ میرزا زاہد ہروی سے پڑھیں۔ شاہ ولی اللہ اپنے والد کے ذکر میں فرماتے ہیں :"اس نیلگوں آسمان کے نیچے جناب شیخ عبدالرحیم سے زیادہ فن حدیث میں طاق اس عہد میں کوئی نہ تھا۔۔۔ میں نے ان جیسا ایک شخص بھی نہیں دیکھا، جو تمام علوم میں عموماً اور حدیث اور فقہ میں خصوصاً تبحر رکھتا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد آپ جیسے محدث و مفسر، فقیہ کو ہندوستان کی گود میں پرورش پانا بہت کم نصیب ہوا ہو گا۔"

شاہ عبدالرحیم نے میرزا محمد زاہد ہروی اور خواجہ خرد بن خواجہ باقی اللہ کے علاوہ کئی اور بزرگوں سے بھی استفادہ کیا۔ جن میں خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی خاص طور سے ممتاز ہیں۔ ان کی شہرت اگرچہ زیادہ تر تصوفی تحقیقات میں ہے، لیکن حقیقت میں وہ تمام علوم میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اور ہندوستان میں مجتہدینِ فن تسلیم کئے جاتے تھے۔ شاہ صاحب کے ایک اور استاد حافظ عبداللہ تھے، جو اس قدر خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے کہ سننے والوں پر محویت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ عالم کے ساتھ بڑے عارف بھی تھے۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ جب خلیفہ ابوالقاسم صاحب نے مجھے تکمیل و ارشاد کی اجازت سے سرفراز فرمایا، تو ایک دعوت کا انتظام کیا۔ اور اس میں اپنے مریدوں اور جاننے والوں کو مدعو کیا

آپ نے فقیر کو طلب فرمایا۔ میرے سر پر دستار باندھی ایک اجازت نامہ لکھکر دیا۔ اور مجھے طالبان حق کی رہنمائی اور دینی علوم کی اشاعت و درس کی اجازت دی اور یہ بھی فرمایا کہ اب اگر تم مناسب سمجھو تو دہلی میں جاکر رہو اور وہاں کے باشندوں میں دینیات کی اشاعت کرو۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے چند دن اور اکبرآباد (آگرہ) میں اپنے اُستاد کے قدموں میں رہنا پسند کیا۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق بعض بزرگوں سے ملتے رہے ؎

جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے، شاہ عبدالرحیم کے بزرگوں کا منصب و مشغلہ ابتدا میں تعلیم و تدریس اور قضا و افتاء کا تھا۔ البتہ بعد میں انہوں نے فوجی زندگی اختیار کر لی تھی۔ شاہ عبدالرحیم نے نئے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ صاحب حیات ولیؒ لکھتے ہیں "شاہ عبدالرحیم نے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور اس میں علم حدیث کی تعلیم دینی شروع کی" مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے والد کے زمانے

؎ خلیفہ ابوالقاسم کے ارشاد پر شاہ عبدالرحیم نے شاہ عظمت اللہ نامی بزرگ کے ہاں حاضری دی، جو سلسلہ چشتیہ کے ایک معمر بزرگ تھے، اور آگرہ میں رہتے تھے۔ وہ بیمار تھے، اور پلنگ پر لیٹے لیٹے شاہ صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں جیسے ہی شاہ صاحب نے اپنا خاندانی تعلق شیخ عبدالعزیز شکر بار سے ظاہر کیا آپ فوراً پلنگ سے نیچے اترے اور شاہ صاحب کو گلے سے لگالیا اور ایک سوال پوچھا۔ اس کے بعد کہا کہ میرے دادا کو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے کچھ تبرکات دیئے تھے، اور فرمایا تھا کہ میری اولاد میں سے اگر کوئی آئے تو اسے یہ تبرکات دے دینا۔ چنانچہ آپ نے شاہ صاحب کے سر پر عمامہ باندھا اور اپنے طریقے کی اجازت دی۔ جب چلنے لگے تو مٹھائی اور نقد روپے بھی ساتھ کر دیئے۔ شاہ صاحب نے واپس آکر اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کی خدمت میں سب ماجرا بیان کیا انہوں نے شاہ عبدالرحیم کو یہ بشارت دی ۔ روپیہ تو ظاہر حال کے اطمینان اور فارغ البالی کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ باطنی اطمینان اور اجازت کا اشارہ ہے۔" شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ اس بشارت کے بعد معاشی پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے کبھی پیدا نہیں ہوا۔ "انفاس العارفین" اور بعض دوسری کتابوں میں شاہ عبدالرحیم کی جس صاف ستھری زندگی کا پتہ ملتا ہے اس کے پڑھنے سے دل کو راحت ہوتی ہے ـــــ ملخص از تذکرہ شاہ ولی اللہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

میں فقہا اور مفسرین نے عوام مسلمانوں کی روزہ مرہ کی زندگی سے قرآنی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی خارج کر دیا تھا۔ سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم نے ادھر توجہ کی اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ایک بہت اچھا طریقہ اختیار کیا اس سے پہلے علماء کا یہ دستور تھا کہ پہلے تو وہ قرآن مجید کو محض تلاوت کی خاطر پڑھا دیتے۔ پھر اگر انہیں طالب علموں کو قرآن مجید کے مطالب و معانی کی تعلیم دینا مقصود ہوتی، تو جس فن سے خود انہیں دلچسپی ہوتی، اس فن کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیر کی جو کتاب وہ مناسب سمجھتے طالب علموں کو پڑھاتے .... اس کے خلاف شاہ عبدالرحیم نے یہ کیا کہ قرآن کے متن پر زیادہ زور دیا، لیکن بجائے اس کے کہ متن قرآن محض تلاوت کی غرض سے پڑھا جاتا، یا کسی خاص فن کی تفسیر کے ذریعہ قرآن کے مطالب کو حل کرنے کی کوشش ہوتی۔ آپ یہ کرتے کہ قرآن کے متن کو شروع سے لیکر آخر تک بڑی تحقیق اور بصیرت کے ساتھ پڑھاتے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کے جملہ مطالب اور معانی تک براہ راست طلبہ کی رسائی ہو جائے۔ اور وہ جان لیں کہ قرآن کا مجموعی طور پر کیا پیغام ہے۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ اپنے والد بزرگوار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "آپ کی عادت یہ تھی کہ اپنے اصحاب کے حلقے میں ہر روز قرآن مجید کے دو یا تین رکوع پڑھتے اور اس پر نہایت تدبر کرتے اور ان کے معانی پر غور و خوض فرماتے" ایک اور جگہ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے "خدا تعالیٰ نے مجھ ضعیف پر جو بڑے بڑے الطاف کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مجھے چند بار والد بزرگوار سے تدبر معانی، شان نزول کے بیان اور تفاسیر میں مطالب کی تحقیق کے ساتھ قرآن عظیم کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کی وجہ سے مجھ پر علم و عرفان کا ایک بڑا دروازہ کھل گیا"۔ شاہ عبدالرحیم اپنے درس و تدریس میں "حکمت عملی" پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں :-

اُس وقت حالت یہ تھی کہ عام متکلمین نے ارسطو کی نظری حکمت کو اپنا مطمح نظر بنا لیا تھا۔ اور ان کا سارا زور قیاس آرائیوں اور استدلالی بحثوں پر صرف ہوتا تھا۔ وہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے بے خبر تھے اور "حکمت عملی" سے سروکار نہ رکھتے تھے لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کلام میں دلچسپی لینے والے فقہا اور متکلمین قومی زندگی کی ضروریات میں تدبر اور تفکر سے محروم ہو گئے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے مذکورہ بالا رجحانِ فکری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :- "حضرت شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ اخلاق سلیمہ میں

وجہ کمال پر تھے۔ نیز دینی اور مابعد الطبیعاتی علوم میں وہ کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ "عقل معاشی" سے کہ جس کے ذریعہ انسان زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کو سمجھتا ہے پورے طور پر بہرہ ور تھے۔ آپ اپنی مجلس میں اکثر "حکمت عملی" اور کاروبار زندگی کے معاملات کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔"

درس وتدریس کے ان مشاغل میں انہماک کی وجہ سے شاہ عبدالرحیم ملک وملت کے عام امور سے بالکل بے تعلق نہیں ہوگئے تھے۔ کتاب "سیرت سید احمد شہید" کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاہ عبدالرحیم کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں ان کا خط نظام الملک آصف جاہ اوّل کے نام ہے، جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔ اور یوں بھی مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں "شاہ صاحب کا خاندانی تعلق جس قبیلہ اور نسل سے تھا علم وتصوف کے ساتھ اس خاندان کے لوگ فوجی کاروبار میں یگانۂ روزگار تھے — بلکہ شاہ عبدالرحیم سے پہلے تو شاہ صاحب کے خاندان میں علم وتصوف کی محض ثانوی حیثیت تھی اصلی کام اس خانوادہ کا جہاد ہی تھا۔ آپ (شاہ ولی اللہ) کے براہ راست جدِّ امجد یعنی شیخ وجیہہ الدین کے واقعات تو خود شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ) نے اپنی مختلف کتابوں میں درج کئے ہیں، جن کو سن کر حیرت ہوتی ہے" اس سے آگے مولانا گیلانی مرحوم فرماتے ہیں:۔ "اور کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری ہی پشت میں حضرت شاہ صاحب کے گزرنے سے جو وہ مرد غازی مولانا اسمٰعیل شہید اٹھے، اور ایک مدت تک بجائے قلم کے تلوار کو کمر سے لگائے رہے۔ تا آں کہ اس راہ میں بالآخر جان عزیز بھی نذر کی، یہ شاہ صاحب کی اسی اندرونی تربیت کا نتیجہ نہ تھا جس کا رواج ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔"

عام زندگی میں شاہ عبدالرحیم کا کیا مسلک تھا، مندرجہ ذیل سطور میں اس کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:۔ ایک بار والد بزرگوار نماز ظہر کے قریب [illegible] طرف متوجہ ہوئے اور برجستہ یہ رباعی پڑھی۔

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر [illegible]
طریقت [illegible]

یہ رباعی پڑھ کر فرمایا۔ ولی اللہ! یہ رباعی لکھ لو۔ حق تعالیٰ نے دفعۃً میرے دل میں اس مضمون کو بایں غرض القا فرمایا ہے کہ تمہیں وصیت کروں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب جب احباب کو رخصت کیا کرتے، تو الوداع کہتے ہوئے یہ بیت پڑھا کرتے تھے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

نیز فرماتے تھے کہ جو لوگ تم سے قدر و منزلت میں کم درجے پر ہوں، اگر وہ تمہیں سلام کرنے میں پہل کریں تو اسے خدا تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھو اور ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات کرو۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ میتواں خرید
خوباں دریں معاملہ تقصیر میکنند

ایک دفعہ شاہ عبدالرحیم کے ایک معتقد نے سوال کیا کہ ابنائے روزگار کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ فرمایا کُن فی النّاس کاحدٍ من النّاس (لوگوں میں اس طرح رہو، جیسے تم ان میں سے ایک ہو) پھر اس نے دریافت کیا کہ حضرتِ حق تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے، فرمایا۔ رجالٌ لا تلھیھم تجارۃ ولا بیعٌ عن ذکر اللّٰہ (وہ ایسے لوگ ہیں کہ نہ تو تجارت اور خرید و فروخت ہی انہیں ذکر اللہ سے غافل کرتی ہے)

شاہ عبدالرحیم کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان کے بڑے بھائی شاہ ابوالرضا محمد کا بڑا حصہ ہے۔ "حیاتِ ولی" میں لکھا ہے۔ "ابتدا میں شاہ عبدالرحیم کی اتالیقی آپ ہی کے سپرد تھی۔ اگرچہ شاہ عبدالرحیم کی تعلیم پر دیگر ماہرین فن بھی چار سال کی عمر میں مقرر تھے... لیکن پوری پوری خدمتِ تربیت شیخ ابوالرضا محمد ہی کے ہاتھ میں تھی..." "شوارق المعرفۃ" میں ہے کہ "شیخ ابوالرضا محمد متعدد علوم میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے تھے ... سے فطرت کی بخشش و عنایت سمجھنا چاہیئے کہ آپ کا ذہن و حافظہ اس بلا کا تھا کہ ایک ہی نظر میں مختلف علوم [illegible] کے بعد آپ حضرت [illegible] باللہ کے [illegible]

خواجہ خورد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کمالات باطنی حاصل کئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، شاہ عبدالرحیم اور شاہ شیخ ابوالرضا محمد کے والد بزرگوار شیخ وجیہ الدین عالمگیر کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن ان کے دونوں صاحبزادے شاہی دربار سے بے تعلق رہے۔ اور درس و تدریس ہی کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ شیخ ابوالرضا محمد کے متعلق "حیات دلی" میں لکھا ہے۔ اوّل اوّل اگرچہ آپ بصوابدید والد بزرگوار اس زمانے کے امراء سے ملتے جلتے تھے، اور شاہی دربار سے ایک معزز و ممتاز عہدہ بھی آپ کے لئے نامزد ہو گیا تھا۔ لیکن دفعتہً آپ کی فطری استعداد ظہور پذیر ہوئی اور آپ نے عزلت نشینی، تجرید تام، توکل کلی، ہر حال میں سنت نبوی پر عمل کرنا اختیار کیا۔ اور یک لخت ابنائے دنیا حتیٰ کہ عزیز و اقارب سے بھی ملنا ترک کر دیا۔

اوّل اوّل آپ طلباء کو ہر قسم کے علوم و فنون کا درس دیتے تھے۔ اور مختلف علوم کے شائقین جوق در جوق حاضر ہوتے تھے لیکن آخر میں بجز تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ شریف کے اور کسی علم کا درس دینا پسند نہ کرتے تھے۔ آپ کا دستور تھا کہ نماز جمعہ کے بعد ہمیشہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ۔ ہر درجے اور مرتبے کے آدمی جن میں طالب علم، علماء، فضلاء، صوفیہ، رئیس شہزادے وغیرہ ہوتے تھے، سب آ آکر جمع ہو جاتے تھے ... ان کا ایک مشہور قول ہے ہمارے عرفائے زمانہ کو ذاتی تجلی میسر نہیں ہے، ورنہ اپنے، اپنی اولاد و اقارب کے حصولِ اغراض کے لئے سلاطین کے محتاج نہ ہوتے۔

شاہ ابوالرضا محمد کی طرح شاہ عبدالرحیم بھی دربار شاہی سے بے تعلق رہے۔ ان کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جب وہ طالب علم تھے اور فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہو رہی تھی تو ان کے ایک دوست نے انہیں اس کام میں شریک ہونے پر آمادہ کیا، لیکن شاہ عبدالرحیم صاحب نے انکار کر دیا۔ جب اس انکار کی خبر شاہ صاحب کی بیوہ والدہ کو ہوئی تو وہ برہم ہوئیں اور اصرار کر کے حکماً نوکری قبول کرنے پر مجبور کیا چنانچہ شاہ صاحب تدوین فتاوی عالمگیری سے متعلق ہو گئے، مگر جب یہ خبر ان کے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو وہ ناخوش ہوئے اور ترک ملازمت پر زور دیا۔ شاہ صاحب نے والدہ کے حکم کا عذر پیش کیا، لیکن آپ کے مرشد برابر مُصر رہے۔ آخر شاہ صاحب نے خلیفہ ابوالقاسم صاحب سے عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ نوکری چھوٹ

جائے، ورنہ یوں چھوڑوں گا تو والدہ ناراض ہوں گی چنانچہ ترک ملازمت کے لئے دعا کرائی گئی۔ اور وہ قبول ہوئی بعد میں عالمگیر نے زمین دینی چاہی لیکن شاہ صاحب کے الفاظ میں "میں نے قبول نہیں کیا اور شکر ادا کیا"[1]

شاہ عبدالرحیم کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اس بارے میں شاہ عبدالعزیز کا یہ قول ان کے ملفوظات میں ہے "حکمت ہم در خاندان ما معمول بود۔ چنانچہ جد بزرگوار و عم فقیر دوامی کردند والد ماجد بندہ موقوف ساختہ" صفحہ ۲۳

یہ خاندان عربی النسل تھا۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضؓ تک پہنچتا ہے اور والدہ کی جانب سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک تحقیقی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خاندان نے سرزمین عرب کو کیسے چھوڑا، لیکن شاہ ولی اللہ نے جو شجرہ نسب بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضؓ کے بعد پانچویں پشت میں افراد خاندان کے ناموں میں عجمیت آگئی تھی۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو ہندوستان آئے، اور رہتک میں آباد ہوئے، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، شیخ شمس الدین مفتی تھے۔

شاہ عبدالرحیم کی ساٹھ سال کی عمر تک کوئی اولاد نہ تھی ایک دفعہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار کی زیارت کو گئے، آپ پر منکشف ہوا کہ آپ کے ہاں اور اولاد ہوگی۔ اس پر شاہ عبدالرحیم نے ایک بزرگ شیخ محمد کی صاحبزادی سے عقد فرمایا۔ جس سے شاہ ولی اور دو صاحبزادے اور ہوئے شادی کے بعد شاہ عبدالرحیم سترہ اٹھارہ سال تک زندہ رہے۔

(اس سلسلے کا دوسرا مضمون جس میں اس عہد کے سیاسی و معاشی حالات کا جائزہ ہوگا اگلے شمارے میں شائع ہوگا۔)

---

[1] ماخوذ از تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

وحدتِ دین کا تصوّر

ڈاکٹر عبدالواحد ھلے پوتا

قانونِ ارتقاء کے تحت جیسے جیسے معاشرہ اپنی ابتدائی منزل سے، جسے شاہ ولی اللہ صاحب نے "ارتفاق اوّل" کا نام دیا ہے، ترقی کر کے اعلیٰ منازل کی طرف جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مذہب کے اسلوب، طریقہائے اظہار یا انہیں آپ مناہج اور رسوم کہہ لیں، بدلتے جاتے اور ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ اس خیال کے حامیوں کے نزدیک مذہب انسان کا فطری خاصہ ہے جو اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے فطری کردار اور اعمال پر محیط ہوتا ہے۔ اور وہ اسی طرح عمومی قانون فطرت ہے، جیسے دوسرے حیاتیاتی قوانین ہیں۔ اور جس طرح پوری انسانی زندگی میں، جس کے یہ حیاتیاتی قوانین ایک حصہ ہیں، ارتقاء کا عمل ہوتا رہا ہے، ایسے ہی مذہب کا عملی اظہار جن شکلوں اور صورتوں میں ہوتا ہے ان میں بھی تاریخ کے ادوار میں ارتقاء جاری رہا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسانوں میں ستارہ پرستی عام تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں وہ ان لوگوں کے حالات کے مطابق ہو، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس کو ختم کیا، اور ستاروں کے ذریعہ خدا تک پہنچنے کے بجائے براہ راست غیر مشہود خدائے مطلق کی عبادت کا طریقہ رائج فرمایا۔[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ میں ہے :۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہے تو مدبّر کل، لیکن اپنے مخصوص

(باقی حاشیہ صلا پر)

مظاہر فطرت کو قدرت خداوندی کا جلوہ سمجھنے کے بجائے انہیں خود ذات خداوندی کا قائم مقام بنالینا ارتقائے انسانی کی ابتدائی منزلوں میں عام تھا، اس دور میں انسان کے لئے یہ ایک امر محال تھا کہ وہ ذات خداوندی کا عالم تجرّد میں ادراک کرسکے۔ وہ ان مظاہر کو خدائی صفات کا حامل قرار دے دیتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک اعلیٰ و برتر اور منزہ اور مجرّد ذات خداوندی کا تصوّر پیش فرمایا۔ اور مظاہر کو مظاہر کا درجہ دیا۔

بندوں کی شفاعت قبول کرتا ہے۔ اس لئے وہ ان مخصوص بندوں کو "عباداللہ" کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ عام یہود و نصاریٰ اور ہمارے زمانے کے بعض مسلمانوں میں یہ مرض ہے۔ اور چونکہ شریعت کی بنا اس پر ہے کہ مشتبہ امور کو قائم مقام اصل کے نہ گردانا جائے۔ اس لئے وہ امور محسوسہ جن سے شرک کا شبہ ہوسکتا ہے شریعت نے کفر گردانا۔ جیسا کہ بتوں کے سامنے سجدہ کرنا، ان کے لئے جانور ذبح کرنا وغیرہ۔

اِس علم کے بارے میں پہلی مرتبہ مجھے یوں انکشاف ہوا کہ میرے سامنے ایک ایسی قوم پیش کی گئی، جو ایک چھوٹی سی مکھی کے سامنے جو ہر وقت اپنی دُم اور بازو ہلایا کرتی تھی، سجدہ کررہی تھی۔ پھر میرے قلب میں القاء ہوا کہ کیا تم اس کے اندر شرک کی تاریکی پاتے ہو اور جس عصیاں نے بت پرستوں کو گھیر لیا ہے وہ ان پر بھی محیط ہے؟ میں نے کہا، نہیں۔ ان کے اندر میں یہ چیز نہیں پاتا۔ کیونکہ ان لوگوں نے مکھی کو معبود نہیں گردانا بلکہ قبلہ گردانا ہے۔ اور تذلل و انکساری اور شرف و عزت کے اصل درجہ کو مخلوط نہیں کیا ہے اس پر مجھ سے کہا گیا کہ تم نے واقعی اس کا اصل راز پالیا۔ چنانچہ اس دن سے میرا قلب اسی علم سے معمور ہوگیا اور میں علم و بصیرت کی منزل تک پہنچ گیا۔ اور توحید و شرک اور شریعت نے جن امور کو مظنۂ توحید یا مظنۂ شرک گردانا ہے اس کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوگیا۔ اور عبادت و تدبیر میں کیا ربط و تعلق ہے، اس سے اچھی طرح واقف ہوگیا۔ اور مجھے پوری پوری معرفت حاصل ہوگئی۔ واللہ اعلم،

ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے ستاروں کی معبود نہیں، بلکہ قبلہ سمجھ کر عبادت کی جاتی ہو اور چونکہ اس میں مظنۂ شرک تھا، اسی لئے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہو، اس کے بعد حضرت ابراہیم سے براہ راست اُن دیکھے خدا کی عبادت کا طریقہ رائج ہوا۔

اگر ہم دنیا کے بڑے مذاہب کا ان کے جو اخلاقی، فلسفیانہ، عباداتی اور روحانی پہلو ہیں اس لحاظ سے مطالعہ کریں، تو ہمیں ان میں ارتقاء کے جو اعلیٰ درجات ہیں، ان تک انسان کے پہنچنے کے لئے جو نہایت ہی ضروری اور لابدی ذرائع ہیں۔ ان کے بارے میں عظیم صداقتیں اور اہم خیالات ملیں گے۔ جو کہ باقیات صالحات ہیں ان پیغامات کی جو وقتاً فوقتاً انسانیت کو دیئے گئے ہیں۔ ان عظیم پیغامات کی ایک جھلک ان مذاہب کے ادب اور ان کی تعلیمات کے مطالعہ میں آپ کو مل سکے گی، جو یہ ہیں۔ ہندو مت۔ بدھ مت، زرتشتیت، کنفیوشینزم، ٹاؤازم، یہودیت، عیسائیت، اور اسلام۔

یہ آٹھ مذاہب دنیا میں عظیم ادب، عظیم فن اور عظیم موسیقی کے سب سے بڑے سرچشمہ رہے ہیں۔ اور جب آپ ان کا جائزہ لیں۔ اور ان کا باہم مقابلہ کریں تو یہ حیرت انگیز حقیقت واشگاف ہوگی کہ جہاں ان میں کئی ایک معمولی اور بعض اوقات کئی بڑے امور میں وسیع اختلافات پائے جاتے ہیں، وہاں ان میں انسان کے خدا تک پہنچنے نیز خدا کی صفات کے متعلق، خواہ اس کی اپنی ذات کے بارے میں خواہ اپنی مخلوقات سے اس کے تعلق کے بارے ہیں، جو وسیع تر اصول ہیں، وہ ان سب مذاہب میں آپس میں ملتے ہیں، اور اگر وہ مختلف بھی ہیں تو ان میں تضاد نہیں، بلکہ ہم آہنگی ہے گویا جس طرح ایک ہی سورج کی روشنی مختلف رنگوں کے شیشوں کی کھڑکیوں میں منعکس ہوتی ہے، اسی طرح ایک خدا کے بارے میں ایک ہی حقیقت مختلف دماغوں کے مختلف شیشوں کے ذریعہ دنیا میں منعکس ہوئی ہے۔ لہ

شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ایک باب کا عنوان ہے:- "تمام مذاہب وادیان کی اصل ایک ہے۔ شرائع، مناہج، طریقے مختلف ہیں"۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا ہے، جس پر چلنے کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور اے پیغمبر! تمہاری طرف

لہ The Divine Universe by H. N. Spalding P P 1-2

بھی ہم نے اسی راستہ کی وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا) حضرت مجاہد نے اس آیت کی تفسیر اور معنی یہ کئے ہیں کہ اے محمد! ہم نے تم کو اور ان کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وان ھٰذہٖ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون۔ فتقطعوا امرھم بینھم زبراً کل حزب بما لدیھم فرحون (اور یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہے۔ تو تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ ڈال کر اپنا اپنا دین جدا کر لیا۔ اور جو دین جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہے) یعنی تمہاری ملت اور تمہارا دین وملت اسلام ہے اور مشرکین، یہود اور نصاریٰ نے اس میں پھوٹ ڈال دی۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکلٍ جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجاً (اور ہم نے وقتاً فوقتاً تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریقہ خاص ٹھہرایا) اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ شریعت اور منہاج کے معنی راہ اور طریقے کے ہیں۔

" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ (ہم نے ہر ایک امت کے لئے عبادت کے طریقے قرار دیئے کہ وہ ان پر چلتے رہیں"

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:" معلوم ہونا چاہیئے کہ اصل دین ایک ہے اور تمام انبیائے کرام اس پر متفق ہیں۔ تمام انبیائے کرام کا اتفاق ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے، اس کی عبادت کی جائے۔۔۔۔ قیامت حق ہے، مرنے کے بعد زندہ ہونا حق ہے۔۔۔۔ اسی طرح تمام انبیائے کرام بر یعنی نیکی کے اصولی اقسام پر بھی متفق ہیں۔۔۔۔ اور اسی طرح تمام انبیائے کرام نکاح کی ضرورت، زنا کی حرمت عدل وانصاف قائم کرنے، ظلم وجور کی حرمت۔۔۔۔۔ پر متفق ہیں۔

" یہ امور ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن کے مخاطب تھے۔ بطور مسلمات کے تھے اور اگر اختلاف تھا تو صرف ان امور کی صورتوں اور شکلوں میں تھا۔۔۔ حاصل کلام یہ کہ وہ خاص خاص صورتیں اور مخصوص ہیئتیں مختلف قسم کی نیکیوں اور تدابیر نافعہ ومعاشی اور امور معاشرت کی آسانیوں اور سہولتوں کی

عمارت قائم کی جاتی ہے، انہیں کا نام شریعت اور منہاج ہے۔[۹]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے، جن کی وجہ سے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے لئے مختلف شرائع نازل ہوتے رہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

"معلوم ہونا چاہیئے کہ انبیائے کرام کے شرائع میں اختلاف چند اسباب و مصالح کی بنا پر ہوا کرتا ہے اور یہ اس طرح کہ شرائع الٰہیہ کے لئے چند ایسے اسباب اور وجوہات ہوتے ہیں جن کی بنا پر ان شرائع کو شعائر قرار دیا جاتا ہے۔ اور شرائع کے مقدار اندازے کی مشروعیت میں بھی مکلفین کے حالات، عادات اور اطوار کا لحاظ کیا جاتا ہے۔"[۱۰] اس کی مثالیں دینے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

"انبیائے کرام کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان ارتفاقات اور معاشرت کی ان تدابیر نافعہ کی اصلاح کی جائے، جو ان کے مخاطبین میں موجود اور ان میں جاری و ساری ہیں۔ اور اسی لئے ان کو انکی مالوفات اور شب و روز کی عادی چیزوں سے یکسر جدا کر کے غیر مالوف چیزوں کی طرف دعوت نہیں دی جاتی۔ الا ماشاء اللہ اور یہ ظاہر ہے کہ مصالح کے مواقع باعتبار زمانہ اور عادتوں کے مختلف ہوا کرتے ہیں اور اسی بنا پر شریعتوں میں نسخ صحیح اور جائز ہے۔ اس کی مثال طبیب کی سی ہے کہ وہ ہر حال میں مزاج کا اعتدال اور اس کا تحفظ چاہتا ہے۔ اور اس لئے مختلف اشخاص اور مختلف اوقات کے لحاظ سے اس کے احکام اور طبی طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ جس چیز کا حکم وہ جوان کو دیتا ہے۔ بوڑھے کو نہیں دیتا۔ گرمیوں کے زمانے میں کھلے میدان اور کھلی ہوا میں سونے کا حکم دیتا ہے۔ اور سردیوں میں وہ گھر میں سونے کا حکم دیتا ہے کیونکہ گھر کے اندر سردی کا بچاؤ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اصل دین اور شرائع و مناہج کے اختلاف کے اسباب کو سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ تغیر و تبدل درحقیقت تغیر و تبدل نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شرائع کی نسبت قوموں کی طرف ہوا کرتی ہے اور چونکہ ان کی استعداد و قابلیت نے یہ شرائع اور مناہج ان پر واجب اور لازم کئے ہیں اور زبان حال سے مناسب سعی و التجا کے ساتھ ان شرائع کی خواست اور مطالبہ کیا ہے اس لئے بہت ملامت اور محل مواخذہ یہی قومیں اور یہی لوگ

اب مختلف مذاہب کی تعلیمات میں یہ جو ہم ظاہری اختلافات پاتے ہیں جنہیں شرائع ومناہج کا اختلاف کہنا چاہیئے، انہیں حل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان سارے مذاہب کا ایک اور صرف ایک دین کے مختلف پہلو سمجھ کر مطالعہ کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانیت اور اس کی تہذیب کے ارتقار اور اس کی ذہنی جمالیاتی اور روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ اس دین کو خود اپنے عمل ارتقار میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑا۔ انسانی تہذیب کی عمومی ترقی کا ایک رخ مذہب کی ترقی بھی ہے۔ جیسے آدمی ہوتے ہیں ایسے ہی انکے الٰہ (معبود) ہوتے ہیں۔ اجتماعی اخلاقیات اور انسانی آداب واطوار کی ہر ترقی، اور دنیا اور اس کے قوانین کے بارے میں انسان کے علم میں ہر اضافہ اس کے تصورات میں جو وہ اپنے معبودوں کے متعلق رکھتا ہے اثر انداز ہوتا ہے۔" ؎۱

پھر انسانیت کے دورانِ ارتقار میں اس کی ذہنی، جمالیاتی، روحانی اور معاشرتی ترقی نیز سیاسی اداروں کی تشکیل اور تہذیبی وثقافتی قدروں کی سمتوں میں کئی پہلو ہوتے ہیں۔ وہ ذرائع جن کے توسط سے ارتقار کی نچلی سطح سے انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ بلند سطح پر پہنچنے میں بہت مدد ملتی رہی وہ عام طور سے غیر معمولی افراد تھے جن کی بڑی پُر قوت شخصیتیں تھی اور انہیں غیر معمولی بصیرت اور مافوق الطبعی ذہن عطا ہوئے تھے، جو الہام اور وحی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اگر انسانیت کے مذہب کی تاریخ کا اس کے مختلف ارتقائی پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر تجزیہ کیا جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ مذہب ایک ہی ارتقائی تحریک ہے، اگرچہ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے یہ مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہے۔

مذہبی ارتقار کے دوران جن ذرائع سے انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وقتاً فوقتاً جو پیغامات آتے رہے، ان کی نشر واشاعت مختلف زبانوں میں مختلف

؎۱ Studies in the Philosophy of religion by Pringle Patteson. P.P. 8-9

طبقات کے افراد کے ذریعہ ہوتی رہی ہے جس میں سب سے پہلے کاہن آتا ہے۔ اس کے بعد سیاسی فرمانروا یا سپاہی لیکن آخری پیغام کا حامل ایک تاجر بھی ہے اور عامل (ورکر) بھی ایک سیاح تاجر اپنے پیغام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے اور اسی طرح وہ مختلف قوموں کے درمیان ربط و ارتباط کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس لئے آخری پیغام میں سفر اور سیاحت کو تعلیم اور تبلیغ کا بہترین طریقہ بتایا گیا ہے۔ لیکن اس پیغام میں سب سے زیادہ تعریف عامل "ورکر" کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ہر وہ مفید عمل جس سے انسان کے حقیقی مقصد کی تکمیل میں مدد ملے وہ خدا کی عبادت ہے"[1]

انسانی تاریخ کا اگر دوسری نظر سے تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جن بزرگوں اور عارفین کی بدولت انسانیت نے ترقی کی، اپنے اپنے وقت میں وہ تہذیب اور ثقافت (کلچر) کے مختلف پہلوؤں کے ارتقاء کا بھی ذریعہ بنے تھے۔ ثقافت سے یہاں میری مراد باطن کی اصلاح و تزکیہ اور افراد کی داخلی صلاحیتوں کی ترقی ہے۔ اور تہذیب کا تعلق میرے نزدیک اجتماعی زندگی کے ربط و ارتباط اور مختلف گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے سے ہے۔ زرتشت، منو اور موسیٰ علیہ السلام نے انسانی تہذیب کے نمائندہ معلمین کی حیثیت سے جو تعلیم دی، اس کا بڑی اچھی طرح سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ زرتشت نے خاندانی زندگی کی طرح ڈالی۔ منو مشترکہ خاندانی زندگی اور دیہی آبادی کا بانی ہے۔ اور بنو اسرائیل کے رہنما و قائد حضرت موسیٰؑ پہلے آدمی ہیں، جنہوں نے قبائل کو متحد کر کے قومی زندگی کی ضرورت کو پورا کیا۔

تاریخ مذہب کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ترقی یافتہ قدیم مذاہب میں روح اور مادہ کی دوئی پر زور دیا گیا اور روحانیت کی ترقی کو سب کچھ سمجھا گیا۔ اس کے خلاف بعض ایسے مذاہب بھی تھے، جن کا زیادہ زور زندگی کے معاشرتی پہلوؤں کی ترقی اور اس کے خارجی مظاہر کی تحسین پر تھا۔ اور انہوں نے باطنی زندگی کو اہمیت نہ دی۔ آخری الہامی مذہب، جو قرآن مجید پر مشتمل ہے، اس دوئی کو ختم کر کے

---

[1] Adventures of Brown Girl in her search for God - by - I. I. Qazi. P. P. 158 - 159

دونوں کو باہم مربوط کرتا ہے۔ اس کے نزدیک آدمی کا ہر معمولی سے معمولی عمل اگر اس نیت سے ہو کہ اس سے ایک عالمی و عمومی مقصد کو تقویت پہنچے گی۔ تو یہ بذات خود ایک بہترین عبادت ہے۔ انسانی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں جب کہ مادیت اور روحانیت کی دوئی بعض اعتبار سے ایک ضرورت تھی، وہ ایک عالمی مذہب کے آنے سے ختم ہو گئی۔ اب بذات خود کوئی چیز غیر روحانی یا دنیاوی نہیں رہی اگر اس سے خدائی مقصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے [۱]

مذہب کے عام ارتقاء کی طرح خدا اور الٰہ کا جو انسانی تصور ہے اس میں بھی برابر ارتقاء ہوتا رہا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں آپ کو انسانی معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں خدا کے بارے میں شعور ملے گا۔ "الٰہ" (معبود) کے تصور کے متعلق انسانی علم نے درجہ بدرجہ ترقی کی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ وقت آیا جب توحید کا تصور عام ہو گیا۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان قوانین کی طرح جو زندگی کے مختلف شعبوں پر کارفرما ہوتے ہیں، انسانوں کے نقطہ ہائے نظر، عقائد اور شعور بھی معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتے اور ترقی کرتے ہیں۔ اور یہی کیفیت خدا کے بارے میں انسانی شعور کی بھی ہے۔ غرض یہ ایک حقیقت ہے کہ افرادِ انسانی کے لئے خدا کے بارے میں شعور اتنا ہی فطری ہے جتنی کہ ان کی ذہنی اور روحانی ترقی؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی فطری ترقی اور اس کے طبائع و اطوار کے ارتقاء کے پہلو بہ پہلو خدا کے بارے میں اس کا یہ صحت مند شعور بھی ترقی کرتا رہا ہے۔ جہاں تک ابتدائی انسان کا تعلق ہے، لازماً اس میں بھی کسی نہ کسی صورت میں خدا کے بارے میں شعور ہو گا۔ گو یہ اس طرح واضح اور معین نہ ہو، جیسے کہ بعد کے ترقی یافتہ انسان میں ہے، ایک ایسی مافوق الطبعی طاقت جو پیدا کرتی ہے، پرورش کرتی ہے اور پھر موت دیتی ہے، یعنی خالق، رب اور ممیت کا شعور ابتدائی سے ابتدائی انسان کو بھی ضرور ہو گا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ معاشرتی ارتقاء کی شروع کی منزلوں میں ان تین طاقتوں کو الگ الگ سمجھا جاتا ہو، اور ان کی کائنات پر علیحدہ علیحدہ فرمانروائی مانی جاتی ہو۔ اور بعد میں فہم و دانش کی ترقی اور علم کے مسلسل ارتقاء کے ساتھ

---

[۱] Adventures of Brown Girl in her search for God - by - I. I. Qazi. P. P. - 159

کائنات پر ایک سے زیادہ فرمانروا طاقتوں کے خیال کی جگہ اس عقیدے نے لے لی ہو کہ اس ساری کائنات پر صرف ایک طاقت کی حکمرانی ہے جس کے ہاتھ میں یہ سارے اختیارات ہیں۔ مختصراً خدا کا یہ تصور انسانی شعور کی بعد کی ترقی یافتہ منزل میں آگے آیا ہے، اور جہاں تک قرآن کے تصورِ توحید کا تعلق ہے وہ تو اس سے بہت بلند تر ہے اور بڑے ترقی یافتہ انسانی معاشرے کے مذہب کا امتیاز ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ نہ صرف ایک خدا پر عقیدے کا اس شکل میں تعین ہوا بلکہ روحانیت اور مادیت کی اس دوئی میں جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، نئے نقطہ ہائے نظر کی تخلیق سے ہم آہنگی پیدا کر دی گئی، جس میں کہ ہر چیز کو اپنا ایک نیا مقام اور تناسب ملا اور اس طرح یہ ہم آہنگی انسانی ذہن کی مزید ترقی کے امکانات کا باعث بنی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعہ ایک نئی اجتماعی زندگی کی بنیاد بھی پڑی جسے آپ مافوق قومیت اور بین الاقوامیت کہہ سکتے ہیں اور جو انسانی زندگی کو ایک نامی وحدت کلی کی طرف لے جانے میں مد و معاون ہوتی ہے۔ بنو نوع انسان میں مذہب کا جس طرح ارتقاء ہوا اس کے بعض عام پہلو سرسری طور سے اوپر بیان ہوئے ہیں۔ اور اس ارتقاء کے مختلف مراحل میں اصحاب مذاہب، عارفین اور حکماء نے اس کی مختلف نمایاں خصوصیات پر جس طرح زور دیا ہے اس کا بھی اجمالاً ذکر کیا گیا ہے اب ضرورت ہے کہ اس کی روشنی میں مذہب کا مطالعہ انسانی ترقی کی ایک مستقل اور منظم نامی تحریک کی حیثیت سے کیا جائے، جس کے پیش نظر افراد انسانی کی بلحاظ نوع انسان کے افراد ہونے کے ان کی جو فطری ضرورتیں اور تقاضے ہیں، ان کی تکمیل ہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انسانیت کے مذہب کی تاریخ کا مطالعہ اسکے ابتدائی مراحل سے شروع کیا جائے اور بتدریج اس کے ارتقاء کے اس ترقی یافتہ مرحلے پر پہنچا جائے، جب کہ وہ پوری نوع انسانی کے لئے ایک عالمی (Universal) اور انتلافی (Synthesized) مذہب بن گیا ہے۔ یعنی ایسا مذہب جس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ساری انسانیت ایک نامی وحدت کلی ہے۔ اور اس ساری کا ایک ہی خالق اور ایک ہی رب ہے۔ اور اس سب پر ایک ہی طاقت کی فرمانروائی اور حکمرانی ہے۔ اس عالمی وحدت کو سامنے رکھتے ہوئے فلسفۂ مذہب کے شارحین کا یہ کام ہونا چاہیئے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں خواہ وہ معاشرتی

[1] Adventures of Brown Girl in her search for God - P. 164 .

ہوں یا اخلاقی و روحانی اس مذہب کی تعلیم و تلقین کی اہمیت کا تجزیہ کریں۔ اس ضمن میں زندگی کی روحانی اور دنیوی (سیکولر) دو خانوں میں تقسیم کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ چنانچہ زندگی کا یہ اخلاقی نقطۂ نظر اس عظیم مذہب کی تعلیمات کے مقتضیات کو صحیح طور پر سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

جو لوگ فلسفۂ مذہب کا اس نظر سے مطالعہ کرنا چاہئیں، انہیں اس میں شاہ ولی صاحب کے طریقۂ بحث سے بڑی مدد مل سکتی ہے، جو انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجتہ اللّٰہ البالغہ میں اختیار کیا ہے۔ شاہ صاحب کا طریقۂ بحث بڑا جامع ہے اور وہ عالمی مذہب یا دین فطرت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکتا ہے اور اس کا اطلاق انسانیت کے جو بھی ترقی یافتہ مذاہب ہیں ان کے تمام تر بنیادی اصولوں پر ہو سکتا ہے۔



اللّٰہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ یا ایہا الذین آمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم و ان تسئلوا عنہا حین ینزل القرآن تبد لکم۔ (اے مسلمانو! بہت چیزوں کا سوال نہ کیا کرو۔ اگر وہ تمہارے سامنے ظاہر کی جائیں گی، تو تمہارے حق میں بُری ہوں گی۔ اور قرآن نازل ہونے کے وقت تم ان چیزوں کا حال دریافت کرو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی)

اور اصل رضائے الٰہی اس میں ہے کہ نزول شرائع و احکام کے لئے اس قسم کے اسباب کم ہوں۔ کیونکہ اس قسم کے شرائع و احکام کا نزول اکثر و بیشتر کسی مخصوص مصلحت اور وقت خاص کے ماتحت ہوا کرتا ہے۔ اور بعد میں جا کر پیچھے آنے والوں کے لئے تنگی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم زیادہ مسائل دریافت کرنے کو برا سمجھتے تھے۔

(حجتہ اللّٰہ البالغہ)

امروٹ شریف سندھ میں علوم ولی اللّٰہی کی تعلیم

مولانا ابوبکر شبلی[1]

تعلیمات شاہ ولی اللہ کے عظیم ترجمان حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو سندھ سے جو جذباتی وابستگی تھی، وہ آپ کی تصانیف سے پوری طرح عیاں ہیں۔ یہ آپ ہی کی ہستی تھی جن کی وساطت سے سندھ کے علماء اور مشائخ براہ راست شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے متعارف ہوئے۔ اور بالآخر یہ سندھ کو ہی شرف حاصل ہوا ہے کہ اب "شاہ ولی اللہ اکیڈمی" کی وجہ سے فلسفۂ ولی اللہی کی مرکزیت اسے حاصل ہوگی۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سندھ میں ابتدائی کارنامے اور ان کی علمی و مذہبی کوششیں آج تک منظر عام پر نہیں آسکیں۔

"سوانح سیدنا تاج محمود امروٹیؒ" کی تدوین اور ترتیب کے دوران جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں، وہ قارئین "الرحیم" کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ شبلی

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے سندھ میں آکر حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی رحمۃ اللہ علیہ (مرشد حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹیؒ) کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ان ہی کی ہدایت پر مختلف مقامی علماء سے اکتساب علم کرنے کے بعد آپ علوم اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند

---

[1] استاد ادبیات عربی۔ تعمیر نو قومی درس گاہ۔ کوئٹہ

تشریف لے گئے۔ مولانا سندھیؒ کو دیوبند میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف ملا۔ اور بالآخر آپ نے آپ کے مقربین اور معتمد علیہ لوگوں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کرلی۔ فراغت تحصیل علوم کے بعد جب حضرت مولانا سندھی نے وطن کی طرف مراجعت کی تو سیدھے بھرچونڈی شریف آئے۔ آپ کے آنے سے دس دن قبل سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈویؒ اس دنیا سے رحلت فرما گئے تھے۔ آپ بھرچونڈی میں مختصر قیام کرنے کے بعد سیدھے امروٹ شریف تشریف لے گئے۔ جہاں آپ کے روحانی والد اور مرشد حضرت بھرچونڈیؒ کے خلیفۂ اعظم قطب الاقطاب سیدنا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ اپنے فیوضات روحانی سے ہر خاص و عام کو فیضیاب فرما رہے تھے۔

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی حضرت مولانا سیدنا تاج محمود امروٹیؒ سے بھرچونڈی کے دورانِ قیام ہی میں متعارف ہو چکے تھے۔ اس لئے آپ کو امروٹ میں آکر کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی چنانچہ اپنے روحانی والد کی وفات کے بعد آپ نے حضرت سیدنا امروٹی کو ہی اپنا روحانی پیشوا تسلیم کیا، اور ان ہی کے ساتھ مستقل طور پر امروٹ میں رہنے کا عزم مصمم کرلیا۔

اس ضمن میں حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں :۔

" میں شوال (۱۳۰۸ھ) میں سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈویؒ کے دوسرے خلیفہ حضرت مولانا ابوالحسن تاج محمود امروٹیؒ کی طرف امروٹ ضلع سکھر کی طرف چلا گیا۔ آپ نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کیا۔ آپ میرے لئے باپ کی طرح تھے آپ نے میرا نکاح سکھر میں اسلامیہ سکول کے معلم مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی بیٹی سے فرمایا۔ میری والدہ کو بھی بلوایا۔ جو آخر تک میرے ساتھ رہیں آپ نے میرے مطالعہ کے لئے ایک بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے سایہ عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک نہایت اطمینان سے مطالعہ میں مصروف رہا۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے حسب ذیل باتیں واضح طور پر عیاں ہوتی ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ دیوبند سے مراجعت کے بعد سیدھے امروٹ شریف آئے اور اسی کو اپنا مسکن منتخب کیا۔

۲۔ حضرت مولانا سیدنا تاج محمود امروٹیؒ نے آپ کے قیام کے لئے تمام وسائل مہیا کئے اور حضرت آپ پر پدرانہ شفقت فرماتے رہے۔

۳۔ حضرت مولانا سیدنا تاج محمود صاحب امروٹی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی شادی کرائی اور آپ کے مزید اطمینان قلب کے لئے آپ کی والدہ کو آپ کے پاس بلوایا۔

۴۔ حضرت سیدنا امروٹی نے حضرت مولانا سندھیؒ کے علم کے اضافہ کے لئے ایک عظیم کتب خانہ جمع کیا۔ (جو اب تک خستہ حالت میں موجود ہے) یہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے ابتداء میں امروٹ شریف کو اپنا مستقل مسکن بنا کر اپنی علمی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔

جس وقت حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے امروٹ کو اپنا مستقل مسکن بنا کر اپنی علمی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا، اس وقت صوبہ سندھ زندگی کے ہر میدان میں بہت پیچھے تھا۔ علمی لحاظ سے پورے صوبے میں کوئی بھی مرکزی دینی درس گاہ نہیں تھی بعض قصبات میں چھوٹے چھوٹے دینی مدارس تھے جن کا آپس میں کوئی ربط نہیں تھا ان کا وجود کسی مدرس یا مولوی کی ذاتی جدوجہد کا مرہون منت ہوتا تھا۔ جونہی وہ شخصیت اس کام سے سبکدوش ہوتی تو مدرسہ کا تمام نظام ختم ہو جاتا۔ ان مدارس کا نصاب صدیوں کا گھسا گھسایا تھا جس میں کوئی بھی تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ اس لئے صوبہ سندھ کے دینی مدارس کے طلبہ میں کسی قسم کی ذہنی بیداری لانا تقریباً ناممکن تھی۔

سیاسی لحاظ سے سندھ تقریباً عضو معطل تھا۔ کراچی کے علاوہ پورے صوبہ میں کہیں بھی سیاسی شعور نہیں تھا۔ سندھ اپنے مخصوص جغرافیائی اور لسانی حالات کی وجہ سے برطانوی ہند کے دوسرے تمام صوبہ جات سے الگ تھلگ تھا۔ علمی اور ادبی لحاظ سے سندھ صفر تھا۔ پریس اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اور وسائل پر ہندو دانشوروں کا قبضہ تھا۔ مسلمانوں کے تمام مذہبی کتابیں حتیٰ کہ قرآن مجید بھی ہندو پریسوں میں ہندوؤں کے سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔

ان حالات میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ نے امروٹ شریف میں حضرت مولانا سیدنا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ کے تعاون اور سرپرستی میں اپنے پروگرام کا آغاز کیا۔ آپ کے پروگرام کے تین

بڑے مراحل یہ تھے۔ ابتداء میں امروٹ شریف میں ایک عظیم دینی درس گاہ قائم کی جائے جو دقیانوسی طرز عمل سے ہٹ کر جدید طریقہ پر تعلیمی کام کرے۔ اس عظیم دینی درس گاہ کے نصاب میں شاہ ولی اللہ کی تصانیف کو بنیادی اہمیت حاصل ہو تاکہ ان کے فلسفہ کے ذریعہ پہلے سندھ میں، بعد میں تمام ہندوستان میں اسلام کا فکری اور علمی انقلاب لایا جاسکے۔ مسلمانوں میں دینی، سیاسی، اور علمی انقلاب لانے کے لئے ایک "دارالاشاعت الاسلامیہ" کھولا جائے۔ جس کا اپنا پریس ہو جس کے ذریعہ مسلمانوں میں علمی اور سیاسی شعور بڑھانے کے لئے مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کی جائیں اور "دارالاشاعت" کی طرف سے سندھی زبان میں ایک مستقل ماہنامہ بھی شائع کیا جائے۔ چنانچہ انہی خطوط پر حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے امروٹ شریف میں اپنا کام شروع کیا۔

سب سے پہلے آپ نے ایک دینی درس گاہ قائم کی اس کی چند ایک قابل ذکر خصوصیات یہ تھیں کہ اس درس گاہ کو دیوبند کے طریقہ پر جاری کیا گیا۔ اور اس کا روحانی تعلق دیوبند سے قائم رکھا گیا اس لحاظ سے سندھ کو پہلی مرتبہ دیوبند سے علمی اور روحانی رابطہ پیدا ہوا۔ اس درس گاہ کے نصاب میں حدیث، تفسیر اور شاہ ولی اللہ کی تصانیف کو بھی شامل کیا گیا۔ اس طرح سندھ کے طالب علموں کو پہلی مرتبہ علوم اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملا۔ اس درس گاہ میں فکری جلا پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ چنانچہ طلبہ میں حریتِ وطن اور احیائے دین قیم کی روح پیدا کرنے کی پوری کوشش ہوتی تھی۔ اس درس گاہ کی لائبریری میں مصر استنبول اور ہندوستان سے مشہور اور نادر کتابیں جمع کی گئیں۔ اور اس طرح سندھ کے طلبہ کو ایک جید عالم کی نگرانی میں توسیع مطالعہ کا پہلی دفعہ موقع ملا۔

اس درس گاہ میں تقریباً سات سال تک جب تک کہ حضرت مولانا سندھی امروٹ شریف میں رہے۔ اس طرح کام ہوتا رہا۔ اس دوران میں سندھ اور بیرون سندھ کے سیکڑوں علماء نے اس سے استفادہ کیا اور اسی درس گاہ کی وجہ سے سندھ میں حریت وطن اور احیائے دین قیم کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔

اس درس گاہ کے تلامذہ میں حضرت الحاج مولانا عبدالعزیز صاحب تھر پارکری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ اول حضرت سید تاج محمود صاحب امروٹی اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اور

جناب مولانا خوشی محمد صاحب لاڑکانوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر دونوں حضرات وفات پاچکے ہیں موخرالذکر حضرت بقید حیات ہیں اور سندھ کے علمی حلقوں میں احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا کرنے کے لئے پریس کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ وہ صوبہ سندھ کے لئے "دارالاشاعت" کا قیام بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے امروٹ شریف میں پریس لگا کر دینی کتابیں چھاپنے کی تجویز آپ کے ذہن میں آئی اور آپ نے حضرت مولانا تاج محمود امروٹی سے مدد چاہی، لیکن اس وقت حضرت امروٹی کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی اس لئے آپ اس عظیم کام کے لئے فوری طور آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ ادھر حضرت مولانا سندھی کو اس پر شدید اصرار تھا۔ آخر کار ذاتی جد وجہد سے حضرت مولانا سندھی نے ایک چھوٹی سی مشین خرید لی اور سندھ کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں طباعت واشاعت کا کام شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس "دارالاشاعت" سے سندھی زبان میں ایک ماہنامہ بھی جاری کیا گیا۔ جو کافی عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔

اس "دارالاشاعت" سے ماہنامہ کے علاوہ سندھی زبان میں کئی کتابیں بھی شائع ہوئیں جن میں حضرت مولانا امروٹی کا قرآن مجید کا سندھی ترجمہ "الہام الرحمان فی تفسیر القرآن" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ایک دینی درس گاہ، شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی تعلیم اور محمود المطابع کے قیام کی وجہ سے امروٹ شریف نے تھوڑے ہی عرصہ میں سرزمین سندھ میں علمی اور سیاسی لحاظ سے ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لی اور سندھ کے علاوہ بیرون سندھ میں بھی اس کی شہرت ہو گئی۔ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے اپنے ذاتی روابط اور تعلقات سے حضرت مولانا امروٹی اور حضرت مولانا شیخ الہند کو باہم متعارف کرایا۔ اسی تعارف اور تعلق کے بعد حضرت شیخ الہند اپنی زندگی میں دو بار امروٹ شریف تشریف لائے آپ کے تلامذہ میں سے حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا تھانوی بھی امروٹ شریف آئے تھے۔

امروٹ شریف میں دینی درس گاہ اور محمود المطابع کے قیام اور اس سے شائع ہونے والے رسائل اور کتب کے نتائج بڑے اچھے نکل رہے تھے۔ اور حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نہایت اطمینان سے اپنی جد وجہد میں مصروف تھے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کچھ ایسے اسباب در پیش آئے کہ تعلیم کمال

سے زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ اور مولانا سندھی نے امروٹ شریف چھوڑنے کا فوری فیصلہ کر لیا۔ جن اسباب کی وجہ سے آپ کو امروٹ شریف چھوڑنا پڑا وہ یہ ہیں۔

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ امروٹ شریف میں بڑی پرسکون متاہل زندگی گذار رہے تھے کہ بعض ناسازگار حالات پیدا ہو گئے۔ قیام امروٹ کے آخری ایام میں آپ کی زوجہ محترمہ مختصر علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں اور اپنے پیچھے دو ننھی معصوم بچیاں چھوڑ گئیں جن کی پرورش اور پرداخت کا مسئلہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے لئے ایک دردسر بن گیا۔ اس طرح حضرت مولانا سندھی ہر وقت متفکر رہنے لگے۔

اسی دوران میں حضرت مولانا سندھی اور حضرت مولانا امروٹیؒ کے درمیان دینی درس گاہ کے طریق کار میں اختلاف پیدا ہوئے۔ جو آخر میں مولانا سندھی کے امروٹ شریف چھوڑنے پر منتج ہوئے بات دراصل یہ تھی کہ جب امروٹ شریف میں یہ دینی مدرسہ قائم ہوا، اور وہ بتدریج فروغ پانے لگا تو یہ وہ دور تھا جب سلطنت برطانیہ کے زیر سایہ نیا نظام تعلیم روبہ ترقی تھا اور پرانا نظام تعلیم دم توڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کی نئی پود کو انگریز اپنی مشینری کے پرزے بنانے کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں اسکولوں کا ایک وسیع جال پھیلا رہا تھا۔ جو بچے ان اسکولوں میں تعلیم پاتے، ان کا مستقبل مادی لحاظ سے بڑا اچھا ہو جاتا ان کے مقابلے میں دینی مدارس میں تعلیم پانے والے بچے انگریزی سلطنت کے کارندوں کی نظر میں تو حقیر تھے ہی، لیکن خود مسلمان بھی ان کو ناکارہ اور معاشرہ پر ایک بوجھ سمجھنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مسلم معاشرہ کے ذہین اور اونچے خاندانوں کے بچے ان اسکولوں کی طرف کھنچتے جا رہے تھے۔ اور دینی مدارس کی طرف اکثر معاشی یا جسمانی لحاظ سے معذور بچے رجوع کرتے تھے۔ مولانا سندھی کا خیال تھا کہ دینی مدارس کے طلبہ کا معیار زندگی اتنا اونچا ہو کہ اونچے خاندانوں کے ذہین بچے بھی ان میں داخلہ لینے پر فخر محسوس کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کا ایک مستقل ہاسٹل ہو۔ جس میں ان کے لئے عمدہ خوراک اور عمدہ لباس کا بندوبست کیا جائے۔

مولانا سندھیؒ نے امروٹ شریف کی دینی درس گاہ کو اس طرز پر چلانا چاہا۔ لیکن اس عظیم کام کے لئے جن ذرائع اور وسائل کی ضرورت تھی، وہ وہاں بالکل ناپید تھے اور انہیں نہ مولانا سندھیؒ مہیا کر سکتے تھے نہ حضرت

مولانا تاج محمود امروٹی اس کے علاوہ یہ دینی درس گاہ امروٹ شریف کی خانقاہ کے احاطہ میں قائم تھی جہاں حضرت مولانا امروٹی اپنے متوسلین کو روحانی فیوضات سے مستفید کرتے تھے۔ ان متوسلین کو تصوف کے مشہور طریقہ پر فقر فاقہ، صبر اور قناعت کی تلقین کی جاتی تھی۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک ہی جگہ طریقت کے طالب تو سادگی اور فقر فاقہ سے زندگی بسر کریں اور اسی وقت ان کے سامنے شریعت ظاہریہ کے تلامذہ ٹھاٹ سے رہیں یہی وجہ تھی کہ حضرت مولانا امروٹی اس سلسلہ میں نہ صرف مولانا سندھی کی معاونت نہ کر سکے بلکہ ان کے اس خیال کی تائید پر بھی آمادہ نہ ہوئے نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا سندھی مستقل طور پر ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے۔

انہی دنوں میں پیر جھنڈہ کے دینی مدرسہ دارالرشاد کو ایک بہت بڑے دارالعلوم کی شکل دینے کے لئے ایک وسیع و عریض جدید طرز کی شاندار عمارت بنائی گئی صاحب العلم حضرت رشداللہ صاحب بذات خود اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ویسے بھی علمی لحاظ سے یہ مدرسہ سندھ میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں کا کتب خانہ ہندوپاکستان میں حیدرآباد دکن کے کتب خانہ کے بعد دوسرے درجہ پر تھا حضرت رشداللہ صاحب کو کسی ایسے جید عالم کی تلاش تھی جو قدیم اور جدید علوم کا مجمع ہونے کے علاوہ کام کی تڑپ اور جذبہ بھی رکھتا ہو حضرت مولانا سندھی کی جدوجہد اور مساعی ان سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ مولانا سندھی کو امروٹ میں اپنے کام کے سلسلے میں جو بےچینی اور بے اطمینانی تھی اس کا بھی ان کو علم تھا۔ آپ نے مولانا کو پیر جھنڈہ آکر کام کرنے کی دعوت دی، جو مولانا نے فوراً قبول کر لی۔ اور اس طرح امروٹ شریف کو الوداع کر کے پیر جھنڈہ چلے آئے۔

اس طرح مولانا سندھی کی سات سال سے جاری تمام اسکیمیں بند ہو گئیں اور آپ نے اب پیر جھنڈہ میں نئی علمی زندگی کا آغاز کیا۔

حضرت مولانا سندھی کے امروٹ چھوڑنے پر حضرت مولانا امروٹی کو بہت رنج اور ملال ہوا۔ آپ نے ان کو روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن مولانا سندھی اپنے عزم سے باز نہ آئے۔ بالآخر مولانا امروٹی نے بادل ناخواستہ ان کو الوداع کہا۔ پیر جھنڈہ کے دوران قیام میں بھی حضرت مولانا سندھی اور حضرت مولانا امروٹی کے درمیان سیاسی اور علمی روابط بدستور قائم رہے۔

مولانا سندھی کے ہجرت کابل کے اکثر انتظامات بھی مولانا امروٹی نے کرلئے تھے۔ کابل پہنچکر بھی آپ نے حضرت مولانا امروٹی ؒ کے ساتھ اپنا ربط قائم رکھا، چنانچہ حضرت مولانا امروٹی کی پہلی نظر بندی ان ریشمی رومالوں کی وجہ سے ہوئی تھی، جو مولانا سندھی نے آپ کو کابل سے روانہ کئے تھے۔ نیز اس سات سالہ کارکردگی کا یہ اثر ہوا کہ حضرت مولانا سید تاج محمود صاحب امروٹی ؒ جو بعد میں سندھ کی ایک عظیم روحانی اور سیاسی شخصیت بن چکے تھے، وطن عزیز کی آزادی کی جدوجہد میں نہایت سرگرمی سے حصہ لینے لگے اور ایک وقت آیا کہ امروٹ پورے سندھ میں سیاسی مرکزیت حاصل کرگیا۔ خصوصاً خلافت تحریک کے سلسلہ میں حضرت مولانا امروٹی ؒ کی خدمات زرین حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں جس حکمت ولی اللہی کی دعوت دیتا ہوں، وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں میں مرتب اور مدون شکل میں موجود نہیں۔ دراصل اس زمانے میں اور ان حالات میں اس قسم کے فکر کی ترتیب اور تدوین کا کوئی امکان نہ تھا۔ مجھے اس کے ماننے میں بھی تامل نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں بعض باتیں ایسی ہیں، جو ان کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ آج بھرتی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ اکثر دیکھیں گے کہ شاہ صاحب صفحے کے صفحے لکھ گئے ہیں، اور ان میں آپ کو ایک دو باتیں کام کی مل جاتی ہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں طالب علموں کو ادھر متوجہ کروں تاکہ وہ ان کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کریں۔

میں مانتا ہوں کہ آج کل کے ذہین نوجوانوں میں جو شکوک پیدا ہوتے ہیں، میں سب کا جواب نہیں دے سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ نوجوان شک سے بیزار ہوں گے، اور انہیں زندگی میں کسی مثبت فکر کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میرے نزدیک شاہ ولی اللہ صاحب اسلام کی جو تعبیر کرتے ہیں، وہ ہمارے نوجوانوں کے لئے اطمینان اور تسلی کا باعث ہوسکتی ہے۔

(ارشادات مولانا سندھی ؒ)

امام ابو حامد غزالیؒ

حسین امین (بغداد)[1]

عباسیوں کے بغداد میں مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک مدرسہ تھا، جسے سلجوقیوں کے مشہور و معروف وزیر نظام الملک نے ۴۵۹ھ میں قائم کیا تھا۔ نظام الملک نے بغداد کے علاوہ سلطنت کے بعض دوسرے شہروں میں بھی اس قسم کے مدرسے قائم کئے تھے، اور انہیں بھی نظامیہ کہا جاتا تھا۔ اسی طرح کا ایک مدرسۂ نظامیہ نیشاپور میں بھی تھا، جس میں سب سے مشہور مدرس امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی متوفی ۴۷۸ھ تھے۔ یہ بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ اور طلبہ ان سے اس قدر مانوس تھے کہ کہا جاتا ہے جب ان کا انتقال ہوا تو طالب علموں نے شدت غم میں جامع مسجد کا وہ منبر توڑ دیا، جہاں سے ان کے شفیق استاد وعظ کہا کرتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی قلمیں اور دواتیں بھی توڑ دیں، اور پورے ایک سال تک وہ درس و تدریس کو چھوڑے رہے، ان چار سو طالب علموں میں سے ایک طالب علم امام ابو حامد غزالی بھی تھے

نظام الملک کے بنائے ہوئے مدارس نظامیہ میں سے سب سے زیادہ شہرت بغداد کے نظامیہ کو حاصل ہوئی۔ جہاں کا کہ دور دراز سے طالبانِ علم قصد کرتے، اور جس میں ہر علم و فن کے متبحر اور مسلمہ علماء درس دیا کرتے تھے۔ انہی مدرسین میں سے، جو اپنے وقت میں بہت مشہور ہوئے، ایک مدرس حجۃ الاسلام

---

[1] جامعہ بغداد (عراق) کے "مجلہ کلیہ الآداب" میں شائع شدہ ایک عربی مضمون کا اردو ملخص۔ مولانا شبلی کی کتاب "الغزالی" کے حاشیے مترجم کے ہیں۔

ابوحامد الغزالی بھی تھے۔ یہ مدرسہ کوئی دو سال میں بن کر تیار ہوا تھا، اور بغداد کے مدرسہ مستنصریہ کے قیام سے پہلے وہ سب سے بڑا اور شان دار مدرسہ تھا۔ اس مدرسے کا قیام خاص طور سے فقہ شافعی کی تدریس کے لئے وجود میں آیا تھا اور واقف کی یہ شرط تھی کہ "اس میں مدرس، واعظ اور کتابوں کا متولی اصلاً اور فرعاً شافعی ہو"۔[1]

امام غزالی کا پورا نام محمد بن محمد بن محمد بن احمد ہے۔ وہ ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اُون کاتنے کا کاروبار تھا۔ اس بنا پر وہ الغزالی کے لقب سے منسوب ہوئے۔ وہ بچپن ہی میں اپنی ذہانت کی وجہ سے بڑے ممتاز تھے۔ امام غزالی نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے اور وہاں انہیں امام الحرمین عبدالملک جوینی سا کامل استاد ملا۔ انہوں نے بہت دل لگا کر پڑھا، اور درس و مطالعہ میں بڑی محنت کی یہاں تک کہ ایک طرف وہ فقہ، کلام، اصول اور منطق میں ماہر ہو گئے۔ اور دوسری طرف انہوں نے حکمت اور فلسفہ میں بھی درک حاصل کیا۔ نیز مختلف علوم پر انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ امام الحرمین کے انتقال کے بعد ایک علمی مجلس میں امام غزالی کی نظام الملک سے ملاقات ہوئی۔ اس مجلس میں دوسرے علماء بھی موجود تھے ان کے اور امام غزالی کے درمیان کسی مسئلہ پر بحث چھڑ گئی، جس میں امام غزالی کا پلہ بھاری رہا۔[2] اور ان کے استدلال

---

[1] ابن الجوزی۔ المنتظم ج ۹ ص ۶۶

[2] مولانا شبلی اپنی کتاب "الغزالی" میں لکھتے ہیں:- "چونکہ ان (امام غزالی) کی علمی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی، نظام الملک نے نہایت تعظیم و تکریم سے ان کا استقبال کیا۔ اُس وقت فضیلت اور کمال کے اظہار کا جو طریقہ تھا علمی مناظرات تھے۔ رؤساء و امراء کے دربار میں علماء اور فضلاء کا مجمع ہوتا تھا۔ اور مسائل علمی پر مناظرانہ گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ جو شخص زورِ تقریر سے حریفوں کا منہ بند کر دیتا تھا، وہی سب سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔۔ امام غزالی نظام الملک کے دربار میں پہنچے، تو سینکڑوں اہل کمال کا مجمع تھا۔ نظام الملک نے مناظرہ کی مجلس منعقد کی۔ متعدد جلسے ہوئے اور مختلف مضامین پر بحثیں رہیں۔ ہر معرکہ میں امام صاحب ہی غالب رہے۔ اس کامیابی نے امام صاحب کی شہرت کو چمکا دیا۔ اور تمام اطراف و دیار میں اس کے چرچے پھیل گئے۔ (ابن خلکان)

اور زورِ بیان کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکا، سب علماء نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔ اور نظام الملک کے دل میں ان کا بڑا احترام پیدا ہوگیا۔ چنانچہ اس نے امام غزالی کو مدرسہ نظامیہ بغداد میں مدرس و استاد مقرر کردیا۔[1]

علوم و فنون میں تبحر و مہارت کے باوجود امام صاحب نے اپنا مطالعہ برابر جاری رکھا، اور ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ان پر نئے سے نئے حقائق واشگاف ہوں، اور وہ اس راہ میں برابر آگے بڑھتے جائیں چنانچہ اس سلسلے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"عنفوان شباب سے لے کر جب میں بلوغ کو پہنچا تھا، اُس وقت تک، جب کہ میری عمر پچاس کے قریب ہے، میں اس گہرے سمندر کی موجوں میں گھستا رہا ہوں اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن رہا ہوں۔ ایک جرأت مند آدمی کی طرح نہ کہ ایک بزدل اور جھجکنے والے کی طرح میں ہر اندھیرے میں کودا اور ہر مشکل مسئلے پر لپکا ہوں میں نے ہر فرقے کے عقیدے کی چھان بین کی۔ اور ہر گروہ کے اسرارِ مذہب کا کھوج لگایا۔ تاکہ میں حق پرست اور باطل پرست اور سنت پر چلنے والے اور بدعتی میں تمیز کرسکوں۔ میں نے ہر فرقہ باطنیہ والے کی باطنیت اور ہر ظاہری فرقے والے کی ظاہریت کا جو حاصل ہے اس پر یہ مطلع ہونا چاہا۔ میں نے کسی فلسفی کو نہیں چھوڑا کہ اس کے فلسفے کی کنہ و حقیقت سے واقف ہونے کی کوشش نہ کروں کسی متکلم یعنی علم کلام والے کو نہیں چھوڑا کہ اس کے کلام اور اس کے بحث و نظر کے مقصد و مدّعا سے واقف نہ ہوں۔ کسی صوفی کو نہیں چھوڑا کہ اس کی صوفیت کے راز پر اطلاع پانے کی خواہش نہ کروں۔ کسی عابد و زاہد کو نہیں چھوڑا کہ یہ معلوم نہ کروں کہ اس کی عبادت کا حاصل مقصود کیا ہے۔ اور اسی طرح کسی زندیق کو نہیں چھوڑا کہ اس کے بارے میں یہ سراغ نہ لگاؤں کہ اس کی اس جرأت زندیقی کے کیا اسباب ہیں غرضکہ ابتدا سے اور عنفوان شباب ہی سے حقائق کے ادراک کی پیاس میرا معمول رہی ہے۔ اور یہ خاصیت اللہ تعالےٰ نے میری جبلت اور فطرت میں رکھی ہے۔ اور میرے اختیار یا

---

[1] امام صاحب کی عمر اس وقت صرف ۳۴ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس عمر میں نظامیہ کی افسری حاصل کرنا ایک ایسا فخر تھا، جو امام صاحب کے سوا کسی کو کبھی حاصل نہیں ہوا۔ (الغزالی از مولانا شبلی)

میری کوشش کا نتیجہ نہیں؟

ایک تو اللہ تعالیٰ نے امام غزالی کو بحث و تحقیق، تجسس و تدقیق اور ہر چیز کے اصل اسباب کا سراغ لگانے کی یہ جبلت عطا کی تھی، اور دوسرے وہ جس زمانے میں پیدا ہوئے، اور بعد میں جو ماحول انہیں ملا، وہ انتہائی اضطراب اور انتشار سے بھرپور تھا۔ اس وقت خلافت عباسیہ میں ضعف آچکا تھا، اور وہ بڑی سرعت سے زوال پذیر تھی۔ مسلم معاشرہ فقہی گروہ بندیوں اور کلامی کشمکشوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ اور اس میں طرح طرح کے مذہبی فرقے بکثرت موجود تھے امام غزالی ہی کے زمانے میں صلیبی جنگوں کا بھی سلسلہ شروع ہوا ایک طرف تو یہ حالت تھی، دوسری طرف اسی عہد میں مدارس کے قیام کی تحریک بڑے زوروں پر شروع تھی اور علماء کی بڑی کثرت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ تصوف پھیل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اسی زمانے میں یونانی فلسفے کے زیر اثر ایسے فرقوں کا ظہور ہوا جنہیں امام غزالی نے دہریت، طبیعت اور الہیت کے نام دیئے ہیں۔ امام صاحب نے فلسفیوں پر تنقید کی اور ان کے رد میں اپنی مشہور کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" لکھی امام غزالی کے نزدیک فلسفی دین کے لئے ایک خطرہ ہیں، کیونکہ وہ شریعت اور اس کی حدود کا احترام نہیں کرتے اور شعائر دین کو نظر حقارت دیکھتے ہیں انہوں نے خود فلسفہ کا مطالعہ کیا تاکہ وہ اس سے پوری طرح واقف ہوں اور اس کی کمزوریوں کو سمجھیں۔ فلسفے کا یہ مطالعہ انہیں ایک نئے فکری مذہب کی طرف لے گیا جس کا بنیادی نقطہ شک ہے۔

انتشار کا یہ دور جس میں کہ امام غزالی کی زندگی گزری اور جس میں کہ افکار و آراء اور فقہی مذاہب و مذہبی گروہوں میں باہم اس قدر تصادم تھا یقیناً اس کے اثرات امام صاحب کے درس و تدریس، بحث و مطالعہ، علمی نقطۂ نظر اور فکری تبدیلیوں پر پڑے۔ وہ ایک ذہین و محنتی طالب علم سے ترقی کر کے اس بلند مقام پر پہنچے کہ وہ امام اور حجتہ الاسلام کہلائے۔ پھر وہ مدرسہ نظامیہ بغداد میں استاد مقرر ہوئے۔ اور فقہ اور علم کلام کی تعلیم دینے لگے۔ اس زمانے کے حالات اور اس میں جو افکار و آراء تھے، ان کا ہی اثر تھا کہ اس وقت امام صاحب میں ایک فکری انقلاب رونما ہوا۔ اور انہوں نے مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس چھوڑ کر زہد کی زندگی اختیار کر لی اور آخر میں وہ طوس شہر میں زاویہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور ہمہ تن تصنیف و تالیف ہی میں لگ گئے۔

امام غزالی کے افکار و آراء ان میں بعد میں جو ذہنی انقلاب ہوا، اُن سے اُس زندگی کا جو اُس وقت

بغداد کی تھی، بڑا گہرا تعلق ہے۔ ان کے عہد میں بغداد لوگوں کی نظروں کا کعبۂ مقصود تھا۔ وہاں علماء کی بڑی ریل پیل رہتی تھی۔ طرح طرح کے خیالات اور اعتقادات آپس میں ٹکراتے تھے اور مدارس اور علمی مرکزوں کی بڑی کثرت تھی۔ ؎۱

امام غزالی ۴۸۴ھ میں جب بغداد میں وارد ہوئے، تو ان کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔ انہوں نے نظامیہ میں درس دینا شروع کیا تو ان کی طرف طلبہ کا عام رجوع ہوا اور درس سننے کے لئے بکثرت لوگ آنے لگے اس کے علاوہ سب کے سب ان کے اخلاق، علم اور وسعتِ معلومات کے بھی گرویدہ ہو گئے اور ان کے درس میں بڑے بڑے علماء اور فقہا نے آنا شروع کر دیا، جن میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر ابوالخطاب اور ابن عقیل ہیں۔ اور یہ دونوں کے دونوں حنبلی تھے غرضکہ مدرسۂ نظامیہ میں امام غزالی کا تعلیم و تدریس کا یہ دور ایک طرف علم و فکر سے بھرپور تھا، اور دوسری طرف طلبہ کا جمّ غفیر تھا، جو ہر وقت ان کا احاطہ کئے رہتا اور جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا، وہ بڑے ذوق و شوق سے اسے سنتے، اور دلوں میں جگہ دیتے ؎۲

؎۱ مولانا شبلی "الغزالی" میں لکھتے ہیں "امام صاحب نے جس قسم کی تعلیم و تربیت پائی تھی اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ وہ اپنے اہل مذہب کے طریقہ کے سوا کسی طرف التفات نہ کرتے۔ چنانچہ ان کے تمام ہمعصروں کی یہی حالت رہی لیکن امام صاحب ابتدا ہی سے ایک خاص قسم کی طبیعت رکھتے تھے۔ ان کا مذاق یہ تھا کہ ان کے سامنے جس قدر مذہبی فرقے موجود تھے اور ان کے جو عقائد اور خیالات تھے، سب پر وہ غور کی نگاہ ڈالتے تھے نیشاپور وغیرہ میں سلجوقیہ کے اثر کی بدولت دوسرے مذاہب کا بہت کم چرچا تھا۔ لیکن بغداد دنیا بھر کے عقائد اور خیالات کا دنگل تھا۔ اس زمین پر قدم رکھ کر ہر شخص پورا آزاد ہو جاتا تھا اور جو کچھ چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔ شیعی، سنّی، معتزلی، زندیق، ملحد، مجوسی، عیسائی، بغداد ہی کے دنگل میں باہم علمی لڑائیاں لڑتے تھے۔ اور کوئی شخص ان سے معترض نہیں ہو سکتا تھا۔ اس آزادی کی بدولت ہر قسم کے مختلف عقائد و خیالات پھیلے ہوئے تھے۔

؎۲ ان کے درس میں تین سو مدرسین اور سو امرا و رؤسا حاضر ہوتے تھے۔ درس کے علاوہ خود وعظ بھی فرماتے تھے.... یہ وعظ بھی درحقیقت علمی لیکچر ہوتے تھے .... ایک سو تراسی وعظ قلمبند کئے گئے، جن کا مجموعہ دو ضخیم جلدوں میں تیار ہوا.... (الغزالی)

۴۸۸ھ میں امام غزالی نے مدرسۂ نظامیہ میں درس دینا چھوڑ دیا، اور وہ بغداد سے شام روانہ ہو گئے۔ ؎۱ جہاں انہوں نے دو سال قیام کیا۔ یہ مدت انہوں نے عزلت نشینی اور اعتکاف میں گزاری۔ شام سے وہ بیت المقدس گئے اور مسجد صخرہ میں قیام فرمایا اور پھر انہوں نے حج کا ارادہ کیا۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ مدینہ منورہ گئے اور ایک مدت وہاں میں آپ کا قیام رہا۔ اب ان کے دل میں بیوی بچوں اور خاندان کا خیال آیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "مجھے بال بچوں کے خیال اور ان کی آواز نے وطن کی طرف کھینچا، اور میں وطن لوٹا حالانکہ میں اس کی طرف لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا، لیکن وطن میں بھی میں نے عزلت کو ترجیح دی تاکہ مجھے تنہائی اور خلوت میسر آئے۔ اور میں ذکر و فکر کر سکوں زمانے کے حوادث، اولاد و اطفال کے مسائل اور معاش کی ضروریات حصولِ مراد میں خارج اور خلوت کی صفائی قلب میں تشویش کا باعث ہوتی ہیں"

امام غزالی نے تقریباً تمام اسلامی دنیا کی سیاحت کی تھی۔ وہ مصر بھی گئے۔ قاہرہ اور اسکندریہ میں بھی ان کا جانا ہوا۔ اور ان دونوں شہروں میں وہ ایک مدت قیام فرما ہوئے۔ اس دوران سیاحت میں انہوں نے اپنی کتاب "احیاء علوم الدین" مکمل کی وہ جہاں کہیں بھی جاتے، جلوت پر خلوت کو مقدم رکھتے۔ اور اس خلوت میں ان کے پیش نظر طریقہ تصوف ہوتا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:۔ "ان خلوتوں میں مجھ پر

؎۱ "۔۔۔۔ ادھر اپنے اشغال کو دیکھا، تو کوئی خلوص پر مبنی نہ تھا۔ درس و تدریس کی طرف طبیعت کا میلان اس وجہ سے تھا کہ وہ جاہ پرستی اور شہرت عامہ کا ذریعہ تھا۔ ان واقعات نے دل میں تحریک پیدا کی کہ بغداد سے نکل کھڑا ہوں۔ اور تمام تعلقات کو چھوڑ دوں یہ خیال رجب ۴۸۸ھ میں پیدا ہوا۔ لیکن چھ مہینے تک لیت و لعل میں گزرے۔ نفس کسی طرح گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس بڑی عظمت و جاہ سے دست بردار ہو جائے۔ ان ترددات میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ زبان رک چلی۔ درس دینا بند ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ہضم کی قوت جاتی رہی۔ آخر طبیبوں نے علاج سے ہاتھ اٹھا لیا اور کہہ دیا کہ ایسی حالت میں علاج کچھ سود مند نہیں ہو سکتا۔ بالآخر میں نے سفر کا قطعی ارادہ کر لیا۔"

المنقذ من الضلال (الغزالی)

جو امور منکشف ہوئے، ان کا احاطہ و استقصا نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے صرف ایک حصہ میں بیان کرتا ہوں تاکہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ میں نے یقینی طور سے یہ جان لیا کہ صوفیہ ہی بالخصوص اللہ کے راستے پر سب سے آگے ہیں۔ ان کی سیرت سب سے اچھی، ان کا طریقہ سب سے صحیح اور ان کے اخلاق سب سے بہتر ہیں ...۔ اور ان کی تمام حرکات و سکنات اپنے ظاہر و باطن میں شمع نبوت کے نور سے منور ہیں"

امام غزالی علم الکلام اور عقلیت سے کس طرح تصوف تک پہنچے اور انہوں نے نظامیہ بغداد میں درس و تدریس کی زندگی کے بجائے عزلت نشینی اختیار کی۔ اس کو سمجھنے کے لئے آپ کے یہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ ان کی طبیعت میں تلاش اور جستجو کا ملکہ شروع سے تھا اور جب تک وہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احصار نہ کر لیتے، وہ اس کے بارے میں قطعی رائے نہ دیتے تھے مذہب شک تک پھر وہ بعد میں پہنچے، یہ رجحان دراصل ان میں ابتدا سے تھا۔ لیکن امام غزالی شک کو حرف آخر نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کے نزدیک شک ذریعہ ہے حق الیقین تک پہنچنے کا فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص کہے کہ تین کا عدد دس سے بڑا ہے اور اس کی دلیل وہ یہ دے کہ میں لاٹھی کو سانپ میں تبدیل کر سکتا ہوں۔ اور وہ فعلاً ایسا کر دے اور میں اسے دیکھوں بھی، تو میں اس کی وجہ سے اپنے اس علم میں کہ دس کا عدد تین سے بڑا ہے شک نہیں کروں گا۔ البتہ اس نے لاٹھی کو جس طرح سانپ میں تبدیل کر دیا ہے اس کی قدرت پر تعجب ضرور ہوگا۔ اس سے میں نے یہ جانا کہ ہر وہ علم جو مجھے اس طرح حاصل نہیں ہوتا اور نہ میں اس طرح یقین کرتا ہوں وہ علم ناقابل اعتبار ہے اور اس میں آدمی غلطی سے مامون نہیں ہو سکتا۔ اور جس علم میں آدمی غلطی سے مامون نہ ہو۔ وہ علم یقینی نہیں ہوتا"

اس کے بعد امام غزالی نے جملہ علوم کی تحقیق شروع کی اس طرح ان میں سے اکثر کے بارے میں جو معلومات انہیں حاصل تھیں ان پر انہیں شک ہونے لگا۔ اور یہ شک اتنا آگے بڑھا کہ وہ اپنے یقین پر بھی شک کرنے لگے۔ یہ چیز تو جانی بوجھی ہے کہ یقین کی بنیاد حس ہے اور حس کے متعلق ضروری نہیں کہ اس کا تاثر ہمیشہ صحیح ہو امام غزالی فرماتے ہیں "میں کوشش بلیغ کے ساتھ ادھر متوجہ ہوا اور محسوسات اور ضروریات پر غور کرنے لگا میں نے سوچا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں خود اپنی ذات پر شک کروں آخر میں مجھے اس طرف لے گیا کہ میرا نفس محسوسات میں بھی غلطی سے مامون نہیں" تشکک کے یہ مراحل طے کرتے ہوئے وہ محسوسات سے عقلیات پر پہنچے، اور آخر الذکر پر ان کو اعتماد ہوا۔ لیکن

آگے چل کر وہ عقلیات پر بھی شک کرنے لگے۔ فرماتے ہیں۔ محسوسات نے کہا کہ اس کا کیا بھروسہ کہ تمہارا عقلیات پر ایسا ہی اعتماد ہو، جیسے محسوسات پر تھا۔ تم تو ہم پر بھی اعتماد کرتے تھے چنانچہ حاکمِ عقل کا ورود ہوا، اور اس نے ہمیں جھٹلایا اور اگر حاکمِ عقل نہ ہوتا، تو تم پہلے کی طرح ہم (محسوسات) پر اعتماد کرتے رہتے، ہو سکتا ہے کہ ادراکِ عقلی کے بعد بھی کوئی اور حاکم ہو"

اس طرح امام غزالی کشمکشِ افکار سے دوچار ہوتے ہیں اور ان کا تشکک آگے بڑھتا ہے اور آخر میں ان کا اعتماد "ضروریات عقلی" پر جاکر ٹھہرتا ہے۔ کیسے؟ یہ وہ نہیں بتاتے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ "یہ نور تھا، جو اللہ تعالیٰ نے سینے میں ڈالا اور یہی نور بیشتر معرفتوں کی کنجی ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ کس طرح امام غزالی لوگوں میں، علوم میں، اور ان کے گردوپیش جو کچھ ہو رہا تھا، ان سب میں شک کرتے ہیں۔ اور آخر اُن کا یہ شک انہیں علم الیقین تک پہنچا دیتا ہے، وہ اس بارے میں لکھتے ہیں۔ "یہ شکوک بھی حق کے لئے ایک موجب ہے، جس نے شک نہیں کیا، اس نے دیکھا نہیں، اور جس نے دیکھا نہیں، اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی، وہ اندھے پن اور گمراہی میں رہا۔" اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ جس چیز پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی یا جو چیز وہ کانوں کے ذریعہ سنتے تھے ان کا شک انہیں اس کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کرتا تھا اور وہ اس پر غور و خوض کرتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کی لوگوں سے کنارہ کشی اور الگ خلوت میں بیٹھنا اسی لئے تھا کہ وہ اُن امور پر جو زندگی میں انہیں پیش آئے تھے، علیحدگی میں اطمینان سے غور کر سکیں۔ اور ان کے بارے میں شک سے یقین پر پہنچیں چنانچہ یہی وہ عوامل تھے، جنہوں نے امام غزالی کو مجبور کیا کہ وہ بغداد چھوڑیں۔ مدرسہ نظامیہ میں تعلیم و تدریس چھوڑیں لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر گوشۂ عزلت ڈھونڈیں۔ اور اپنے شکوک کا مداوا کریں۔

امام غزالی ۴۸۴ھ سے ۴۸۸ھ تک بغداد میں رہے، بغداد آنے سے پہلے قدرتی طور پر امام صاحب کے دل میں "مقام خلافت" کے بارے میں بڑی عقیدت اور احترام ہوگا اور وہ اس کے متعلق بڑے اچھے خیالات رکھتے ہوں گے، لیکن جب وہ بغداد پہنچے اور وہاں انہوں نے وہ سب عیش و عشرت، لہو و لعب، فسق و فجور اور منکرات دیکھیں، جن سے کہ اس زمانے کا بغداد بھرا ہوا تھا۔ تو اس کا ان پر شدید ردِ عمل ہوا ہوگا اور اس کی

دیسے وہ قطعاً تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ جس کی تعلیم وہ پہلے یوسف النساج سے حاصل کر چکے تھے یعنی تصوف کا بیج پہلے موجود تھا بغداد کی زندگی کے حالات و کوائف نے اسے نمی بخشی، اور وہ پھوٹ کر بال و پر لایا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ امام غزالی کے فرمانروائے مراکش یوسف بن تاشقین کے ساتھ روابط تھے، اور عباسی خلیفہ کو یہ پسند نہ تھا۔ چنانچہ وہ اکثر امام صاحب سے اعراض برتا کرتا تھا۔ جب انہیں یہ محسوس ہوا۔ تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ بغداد سے نکل جائیں۔

اس ضمن میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ جب امام غزالی طوس سے بغداد گئے اور نظامیہ بغداد میں درس و تدریس شروع کیا تھا، تو وہ شادی شدہ تھے، اور ان کی اولاد تھی، جو طوس ہی میں سکونت پذیر رہی۔ امام صاحب بغداد میں تجرد کی زندگی گزارتے تھے۔ الغرض امام غزالی کی ذات گرامی ایک مستقل مکتب فکر تھی، جس کا اثر و نفوذ بہت دور دور تک پھیلا۔ اور بعد والوں نے ان کا اتباع کیا ؎

؎ آج تقریباً تمام دنیا میں الٰہیات، نبوت اور معاد کے متعلق مسلمانوں کے جو معتقدات و مسلمات ہیں وہی ہیں، جو امام صاحب نے مقرر کردہ ہیں۔ (بعد کی) جس قدر مشہور تصنیفات (کلام) ہیں سب امام صاحب ہی کے عقائد کے گویا شروح و حاشیے ہیں۔ حضرات صوفیہ اور علمائے اسلام سرتاپا اس الٰہیات کے پیرو ہیں، جس کو امام غزالی نے اسرار شریعت سے تعبیر کیا ہے اور جس کی نسبت ان کو نہایت اصرار ہے کہ عام نہ ہونے پائے۔ حضرات صوفیا اور فلاسفۂ اسلام کے سرگروہ مولانا روم شیخ الاشراق ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ ان بزرگوں کی تصنیفات درحقیقت امام صاحب ہی کے خیالات کا نمونہ ہیں تعجب یہ ہے کہ علامہ صدرالدین شیرازی باوجود اختلاف مذہب کے الٰہیات میں امام غزالی کے خوشہ چین ہیں اور سند کے طور پر امام صاحب کی عبارتیں صفحے کے صفحے نقل کرتے جاتے ہیں۔ (الغزالی)

خود امام غزالی نے بھی پہلوؤں سے بڑی آزادی سے فائدہ اٹھایا۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی لکھتے ہیں۔ ”تحقیقات کے شوق میں امام صاحب نے فلسفہ اور عقلیات کی کتابیں بھی پڑھیں اور ان فنون میں مجتہدانہ کمال پیدا کیا فلسفہ کی تصنیفات میں سے جو کتابیں زیادہ تر ان کے مطالعہ میں رہیں، بو علی سینا کی تصنیفات اور ابن مسکویہ کی کتاب تہذیب الاخلاق تھی امام مازری شارح صحیح مسلم کا بیان ہے کہ میں نے غزالی کے شاگردوں سے سنا کہ وہ اخوان الصفا کے رسالے اکثر دیکھا کرتے تھے امام صاحب نے خود بھی ایک موقعہ پر اخوان الصفا کا ذکر کیا ہے۔“ (الغزالی)

ان کے معترضین میں سے ایک امام ابن القیم ہیں جنہوں نے امام غزالی پر بیس مسئلوں کے بارے میں اعتراضات کئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض آپ کے اس قول پر ہے "لیس فی الامکان ابدع مما کان" (جو ہے اس سے بہتر ممکن نہیں) ابن قیم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہتر پیدا کرنے سے عاجز ہے اور یہ گویا اس کی قدرت کا عجز ہوا۔ جو کسی طرح بھی صحیح نہیں لیکن امام غزالی کا اس سے مطلب دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اس قدر اعلیٰ ہے کہ اس سے اعلیٰ اور کوئی چیز ہو نہیں سکتی اس سے ان کی مراد تخلیق کی عظمت کا اثبات ہے نہ کہ باری تعالیٰ کی قدرت کے عجز کا اظہار۔

امام غزالی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دین کو عقل کے قیاس آرائی کی عقل نہیں بلکہ علمی اور "اعتیادی" عقل کے قریب کیا۔ اور عام ذہنوں کے لئے اس کی باریکیاں آشکار کیں، درآں حالیکہ ان کے اور ان کے پہلے زمانے میں اکثر فقہا اور اصحاب دین معموں میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اور ابہام اور پیچیدگی ان کا مسلک تھا۔ امام غزالی نے دین کو عقلِ علمی یا "اعتیادی" سے قریب کر کے دین کا مرتبہ کم نہیں کیا۔ بلکہ ایمان کو اس کی اساس قرار دیکر دین کو فکر بلند کی قوت عطا کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ امام غزالی ان تمام اوصاف کے حامل تھے جو ایک عالم کے ہوتے ہیں۔ ان میں علم تھا۔ ادب تھا۔ تواضع تھی اور اخلاق حسنہ رکھتے وہ ایک زاہد و عبادت گزار صوفی تھے۔ انہوں نے بدعات کے خلاف جہاد کیا وہ ایک کامل استاد تھے۔ ان کے مواعظ و نصائح اب تک دلوں کو متاثر کرتے ہیں وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ ان کی ذات میں بڑی خوبیاں جمع تھیں آپ کا ۵۰۵ھ میں جمادی الثانی کی چودھویں تاریخ کو انتقال ہوا اور وہ طوس میں مشہور شاعر فردوسی کی قبر کے قریب دفن کئے گئے۔

فلسفہ کو بخوبی سمجھ لینے کے بعد میں نے جان لیا کہ جو غرض ہے اس کے لئے یہ بھی غیر کافی ہے اور عقل جمیع مطالب کے احاطے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اور نہ تمام مشکلات سے پردہ اٹھانے والی ہے۔

(امام الغزالی)

شاہ ولی اللہ اور علوم نقلیہ[1]

مولانا محمد عبداللہ عمرپوری

علوم نقلیہ میں حضرت شاہ صاحب کی وسعت نظر، اصابت فکر اور جامعیت کا شاید ہی کوئی ہو جو انکار کر سکے۔ وہ جس مسئلے پر بحث کرتے ہیں، اس کے تمام پہلوؤں کا پورا احاطہ فرماتے ہیں۔ ان میں الجھے ہوئے مطالب کی اس طرح وضاحت ہوتی ہے اور اختلافات میں یوں تطبیق دی جاتی ہے کہ قاری کو پورا اطمینان ہو جاتا ہے۔

علوم نقلیہ کے اہم شعبوں میں شاہ صاحب کی جو شاندار خدمات ہیں، اب میں مختصراً ان کو بیان کر دوں گا۔

علوم القرآن

سرزمین پاک و ہند میں شاہ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ فارسی میں ہے اور اس پر مختصر فوائد بھی ہیں۔ آپ نے اپنے مجوزہ نصاب تعلیم میں قرآن مجید کا ترجمہ لازمی قرار دیا اور اس کی تشریح کے لئے قرآن کی مختصر ترین تفسیر جلالین کا اضافہ کیا۔ (ملاحظہ ہو رسالہ دانش مندی و رسالہ وصیت) قرآن مجید کے جملہ مطالب کا اجمالی تعارف کرانے کے لئے شاہ صاحب نے الفوز الکبیر لکھی۔ اور

---

[1] اس سلسلے کے دو مضمون جولائی اور اگست کے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔

فتح الخبیر تصنیف فرما کر تفسیر بالرائے کے بجائے تفسیر بالروایت کی طرف متوجہ کیا۔

دراصل شاہ صاحب کے پیش نظر یہ تھا کہ تعلیم کے ابتدائی مرحلے ہی میں طالب علم کا قرآن کریم سے براہ راست تعلق ہو جائے۔ اور وہ ہر شعبہ علم میں، روایت میں بھی اور درایت میں بھی، قرآن ہی کو اپنی بنیاد بنائے اور ہر مسئلے میں سب سے پہلے اس کی توجہ قرآن کی طرف مبذول ہو، اور اس سے حل ڈھونڈے۔

قرآن مجید کے غامض اور مشکل مباحث کی تشریح شاہ صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں بڑی وضاحت سے کی ہے۔ قرآن کریم کا اکثر حصہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات پر مشتمل ہے شاہ صاحب نے تاویل الاحادیث میں ان کی حکمت بیان کی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلۂ نبوت کے ارتقاء میں جو تدبیر ملحوظ تھی، اسے بیان کیا ہے۔

علوم الحدیث

علوم دینیہ میں علم حدیث کا درجہ بڑا بلند ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح اس کے بغیر غیر معتبر ہے۔ علم فقہ کی بنیاد اسی پر ہے۔ علم اصول دین و معتقدات اسی کا محتاج ہے اور تاریخ اسلام اس کے بغیر ناتمام رہتی ہے۔ برصغیر میں عمومی فتوحات اسلامیہ غزنوی سلاطین سے شروع ہوئیں اور ان کے مراکز لاہور اور ملتان میں۔ زیادہ تر علماء کا وہ گروہ وارد ہوا۔ جس پر عقلیت اور اس کے بعد فقہ حنفی غالب تھی ان کے شاگردوں میں سے مولوی عبداللہ اور مولوی عزیز اللہ برادران تلمبہ نواح ملتان سے دہلی پہنچے۔ اور اپنے استادوں کے طرز پر وہاں مسند درس و تدریس بچھائی، ان کے حلقۂ درس میں ہندوستان کی ہر طرف سے طالب علم شریک ہونے لگے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ برصغیر میں رواج پا گیا۔ یہ ان دیار کی خوش قسمتی تھی کہ ۹۵۸ھ میں شیر شاہ سوری کے عہد میں شیخ سیف الدین ترک کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جو بعد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نام نامی سے مشہور ہوا۔ آپ اڑتیس سال کی عمر میں حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور حجاز میں کئی سال رہے۔ اور وہاں علم حدیث کی تحصیل کی۔ شیخ عبدالحق حضرت شیخ علی متقی مکی مشہور محدث کے شاگرد رشید اور ملک العلماء حضرت ملا علی قاری کے ہم درس تھے۔ حجاز سے واپسی

پر دہلی میں آپ نے حدیث کا درس شروع کیا۔ اور اس طرح ان دیار میں تدریس حدیث کی طرح پڑی۔

اگرچہ اُس عہد میں حاجی محمد افضل سیالکوٹی کا بھی علم حدیث کا اپنا سلسلۂ تدریس تھا، لیکن زیادہ شہرت حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی کی ہوئی، آپ نے مشکوٰۃ المصابیح کی دو شرحیں ایک فارسی اور ایک عربی میں لکھی۔ آپ کو فقہ حنفی میں بڑا غلو تھا۔ یہاں تک کہ ان ضعیف حدیثوں کو جو فقہ حنفی کے مطابق ہوتیں احادیث صحیحہ پر ترجیح دیا کرتے۔ ان کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی کا یہ مقولہ مشہور ہے "سُنّی سُنّت۔ حنفی چُست"۔

شاہ ولی اللہ نے علم حدیث اپنے والد سے پڑھا، جن کا سلسلۂ تلمذ حاجی محمد افضل سے ملتا ہے۔ بعد میں آپ حجاز تشریف لے گئے، اور وہاں کے اساتذہ کاملین سے نئے سرے سے اسی علم کو حاصل کیا وطن واپس آکر آپ نے تعلیم حدیث کا طرز بدل دیا۔ اور بجائے مشکوٰۃ کے موطا امام مالک کی تدریس پر زور دینے لگے۔ المسوی اور المصفّٰی اسی کی عربی اور فارسی میں شرحیں ہیں۔ جس طرح آپ نے قرآن کریم کی تعلیم اپنے فارسی ترجمے فتح الرحمٰن سے شروع کرنے کی تلقین کی اس طرح علم حدیث کے درس میں المسوی اور المصفّی کو ابتدائی اور حجۃ اللہ البالغہ کو تکمیلی کتاب قرار دیا۔

موطا امام مالک کے بعد صحتِ روایتِ حدیث اور استنباط مسائل میں صحیح بخاری کا مرتبہ ہے اس کے ابواب کے متعلق مشہور ہے کہ بڑے دقیق اور مشکل ہیں، شاہ صاحب نے اس سلسلے میں تراجم ابواب البخاری تالیف فرمائی۔ عوام کے لئے چہل حدیث نام سے ایسی چالیس حدیثیں جمع کیں جو بہت مختصر سہل اور پر معنی ہیں۔ آپ کے فرزند اکبر کے نواسے شاہ محمد اسحاق نے مشکوٰۃ کی اردو میں چار ضخیم جلدوں میں مظاہر الحق کے نام سے شرح لکھی۔

اصول حدیث

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے علم حدیث کی تدریس کے سلسلے میں علم اصول حدیث پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ جو کہ مقدمہ شیخ عبدالحقؒ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں موصوف نے حدیث کے متون کو معین

کرنے کا طریقہ بتایا ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے اس میں اصلاح کی اور متونِ حدیث کے انتقاد کا محققانہ طریقہ وضع کیا اس سلسلے میں ایک انتباہ ملحوظ رہے اور وہ یہ کہ محدثین کرام کی ایک جماعت کی یہ رائے رہی ہے کہ جتنی بھی زیادہ سے زیادہ حدیثیں جمع ہوسکیں، جمع کی جائیں تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ شرعی مسائل اخذ کئے جائیں۔ یہ جماعت نیک نیتی سے یہ رائے رکھتی ہے کہ احادیث ضعیفہ بھی قابل عمل ہیں' اس لئے کہ ممکن ہے پہلے زمانے میں (صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں' یہ حدیثیں مشہور اور صحیح ہوں بعد میں ان کے سلسلۂ اسناد میں ضعیف وغیر معتبر راویوں کے آنے سے زمانہ تدوین حدیث میں انہیں ضعیف قرار دیا گیا ہو۔ یہ طریقہ شیخ عبدالرحمٰن سیوطی مصری کا ہے۔ شیخ علی متقی مکی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی یہی رائے رکھتے تھے۔

محدثین کرام کی دوسری جماعت وہ ہے جو احادیث صحیحہ کا ذخیرہ بہت کم تسلیم کرتی ہے لیکن اسکے نزدیک وہ دین کے استنباط کے لئے کافی ہے۔ یہ رائے امام محی الدین نووی مصری' حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی (استاد حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری) شیخ عبدالرحمٰن سخاوی مصری اور دیگر محدثین محققین کی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اسی دوسری جماعت کے ہم خیال ہیں۔ آپ نے اپنے اس نقطۂ نظر کی اشاعت کے لئے مستقل تصنیفات کیں المصفّٰی کا مقدمہ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ کا حصۂ حدیث وفقہ اور حجۃ اللہ البالغہ کا باب طبقات کتب الحدیث اس ضمن میں آتے ہیں۔ اسی طریقۂ تحقیق کی مزید وضاحت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی مبسوط کتاب بستان المحدثین اور مختصر رسالے عجالہ نافعہ میں کی

شاہ ولی اللہ نے اپنی تالیف قرۃ العینین میں تصریح فرمائی ہے کہ احکام وشرائع کے ماخذ بننے کے لئے احادیث صحیحہ کے موجودہ ذخیرے میں سے دس ہزار متون کارآمد ہیں۔ باقی روایاتِ مقبولہ ان متون کی توثیق اور تائید کے لئے رائج ہیں لہٰذا ہر مسئلے کے لئے نیا متنِ حدیث تلاش کرنے کی ضرورت نہیں نیز تحقیق احادیث کی مشق کا آغاز موطّا امام مالک سے ہونا چاہیئے۔ اور اس میں جو احادیث مروی ہیں' ان کی اسناد وروایت کی تحقیق کتب صحاح خمسہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن نسائی' سنن ابوداود

امام ترمذیؒ میں کی جائے اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بات پیش نظر رہے کہ ان کتب صحاح میں کسی حدیث کے جو اسنادِ روایت ہیں ان میں امام مالکؒ کے ہم عصر جو راوی ہیں' وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں اگر نہیں ہیں تو وہ حدیث قابل قبول نہیں۔ اور اگر موجود ہیں' تو حدیث کے متن پر غور کیا جائیگا کہ یہ متن الفاظ کے اعتبار سے دیگر احادیث ثابتہ صحیحہ کے منافی تو نہیں اگر منافی ہے تو یہ حدیث متروک ہے، اگر یہ دونوں مذکورہ بالا معیاروں پر پوری اترتی ہے تو نیچے کی اسناد پر غور کیا جائیگا۔ اگر وہاں کوئی راوی ضعیف یا ناقابل اعتبار ہے اور بیرونی شہادت اور قرائن سے تائید عملی نہیں ہوتی تب بھی یہ حدیث ناقابل عمل ہوگی۔ لیکن اگر راوی ضعیف نہیں' ثقہ اور قابل اعتبار ہے یا قرائن خارجہ روایت کی صحت کے موئید ہیں تو حدیث (متن) قابل عمل اور قابل قبول ہے۔ اور پھر قبولیت اور اعتبار کے لحاظ سے اس کے غریب حسن، مشہور، مستفیض اور متواتر کے درجے ہوں گے۔ اور یہ احکام شرعیہ کے ماخذ کا کام دے گی۔

شاہ صاحب کے نزدیک اس وقت بھی معتدبہ مشق کرنے کے بعد ائمہ محدثین کی مرویات کی تحقیق کرنے کی قابلیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور علم حدیث کا ایک طالب علم اسناد کی آزادانہ تحقیق کرکے ایک حدیث کے متعلق وہی حکم لگا سکتا ہے جو کہ مثال کے طور پر امام ترمذیؒ نے ہر ایک متن اور سند پر اپنی کتاب جامع ترمذی میں لگایا ہے۔ اکثر احادیث صحیحہ موطا اور صحاح خمسہ میں موجود ہیں اور جو تھوڑی بہت باہر سے لینی پڑیں گی' وہ مسند امام احمدؒ میں مروی احادیث ثابتہ صحیحہ سے لی جاسکتی ہیں۔ مسند امام احمد میں تین قسم کی مرویات ہیں۔

ایک مرویات امام احمدؒ۔

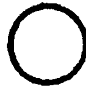
دوسری مرویات عبداللہ ابن امام احمدؒ۔

تیسری مرویات کثعی (شاگرد امام احمدؒ) ان میں سے مرویات امام احمد کا درجہ اعلیٰ ہے۔ اس کے علاوہ روایات کا ذخیرہ ہے' وہ علم حدیث کے صرف متبحرین کی بحث و جستجو اور مشق و مہارت کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ نہ تو اثباتِ احکام شرعیہ کے کام آسکتا ہے۔

اور نہ یہ علم حدیث کے مبتدی طالب علموں کے لئے کارآمد ہے۔ جیسا کہ الفیہ عراقی میں صحیح حدیث کے بیان میں امام نووی کے قول کو اس مصرعے میں بیان کیا گیا ہے۔

ولم یفت الخمسۃ الا الندر

پانچ کتابوں سے کوئی شاذونادر ہی صحیح حدیث رہ گئی ہے



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے مجھے آگاہ فرمایا۔ اور حنفی مذہب کے یہ طریقہ ان مشہور احادیث سے جو امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں اور ان کی اس زمانے میں جانچ پڑتال بھی ہوئی، موافق ترین ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ امام ابویوسف اور امام محمد کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے جو مسئلہ زیر بحث میں مشہور احادیث سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ پھر ان فقہائے احناف کے فتاویٰ کی پیروی کی جائے جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی جہاں تک کہ ان چیزوں کے اصول کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں خاموش رہے اور انہوں نے ان کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم نہیں دیا، لیکن ہمیں ایسی احادیث ملتی ہیں، جن میں ان چیزوں کا ذکر ہے۔ اس حالت میں ان چیزوں کا اثبات ظاہر لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔ اعمال اور احکام میں اس روش کو اختیار کرنا بھی مذہب حنفی میں داخل ہے۔

"فیوض الحرمین"

علم لطائف کے بیان میں

مصلح الدین احمد اسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہی اللہ تعریف و حمد کے لائق ہے جس نے اپنے مخلص بندوں کو جہان میں اور ان کے نفوس میں اپنی عظمت کی نشانیاں اور اپنی قدرت کے آثار دکھائے جن سے انہوں نے جان لیا کہ حق ہی سے انفس و آفاق اور ان کی ذات اور ان کی صفات، عالم اجسام ہو یا عالم ارواح، قائم ہے اور باقی اس کے سوا جو چیز ہے، باطل ہے اور اللہ ہی کل اشیاء کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جدھر ہم دیکھتے ہیں، اللہ ہی کی جلوہ گری ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

اس کے بعد فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی، اس پر اس کے والدین اور مشائخ پر اللہ رحمت نازل فرمائے، عرض کرتا ہے کہ یہ چند ورق جن کا نام "الطاف القدس" ہے نفس کے لطائف کی معرفت اور حقیقت قلب و عقل و نفس و روح و سِر و خفی و اخفیٰ و حجر بحت اور ان کے بیان میں ہیں نیز ان سب کی اصلاح کے طریق اس میں بیان کئے گئے ہیں مگر اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ خالص وہ مسائل لکھے جائیں جو وجدانی اور کشفی

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب "الطاف القدس" کی تمہید کا یہ اردو ترجمہ ہے، جو جناب مصلح الدین احمد صاحب اسیر نے لکھنؤ سے ارسال فرمایا ہے صاحب موصوف نے "الطاف القدس" کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔

طور پر حاصل کئے گئے ہیں۔ اس رسالہ میں عقلی و نقلی علم سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

اللہ علی ما نقول وکیل

فصل اوّل، علم لطائف کے شرف اور فائدہ کے بیان میں

علم لطائف ایک بہت بڑی میراث ہے جس سے خداوند تعالیٰ نے پچھلے زمانہ کے صوفیوں کو برگزیدہ فرمایا ہے ان میں سے جو سب سے زیادہ ان لطائف کی بصیرت رکھتا ہے، وہ سب سے زیادہ تہذیب نفس میں بصیرت رکھتا ہے اور ان میں سے جو سب سے زیادہ ان لطائف کے احکام کی تمیز رکھتا ہے وہ سب سے زیادہ مسترشدین کے ارشاد پر قادر ہے۔ ان لطائف کے علم کا عالم بہ نسبت ان صوفیوں کے جنہوں نے تصوف کے میدان میں عمریں گذاری ہیں، اور اس علم سے واقفیت نہ حاصل کر سکے، مثل ایک طبیب حاذق کے ہے جو مرض کے اقسام کا اس کے اسباب، علامات اور علاج وغیرہ کی تشریح سے، نیز ان قوانین سے جو حکمائے سلف نے عمر بھر کے تجربوں کے بعد حاصل کئے تھے کما حقہ واقف ہے۔ بمقابلہ ان بوڑھیوں کے جو اپنے ناقص تجربوں یا سنی سنائی روائتوں سے کہ فلاں دوا کا یہ فائدہ ہے اور فلاں کا یہ نقصان، دوا کی خاصیت بیان کرتی ہیں۔ یا ان لطائف کے جاننے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ وہ راہبر جو عمر بھر جنگلوں میں پھرتا رہا ہو، اور راستہ کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتا ہو اور صحیح اور غلط راستہ کی شناخت بخوبی کر سکے، بہ نسبت اس جماعت کے جس نے مصیبت یا شوق کے ہاتھوں بلا مقصد اور بغیر راستہ مقرر کئے ہوئے جنگل کی راہ لی۔ جس میں سے کچھ لوگ تو ہلاک ہوئے اور کچھ مراد کو پہنچے۔ اور عمر دراز کے بعد اپنے وطن مالوف کو لوٹے ان میں سے سبھوں نے اپنا اپنا قصہ بیان کیا اور اپنی نامکمل اور ناقص حکایتوں سے سننے والوں کو تنگدل کر دیا۔ ان میں سے ایک بھی اس قابل نہ ہوا کہ کسی کے اعتراض کا جواب دے سکے یا ان کے شک کو رفع دفع کر سکے اور صحیح بات بیان کر سکے بہر حال اگر تم اہل تمکین کی راہ جو کہ انبیاء کے وارث ہیں، معلوم کرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ وہ بجز علم لطائف کے حاصل کئے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ صراط مستقیم کا (طریقہ) سلوک جس میں نہ کوئی لغو حرکت ہے اور نہ کوئی بے فائدہ تکلیف ہے، حاصل ہو جائے تو وہ بھی بغیر علم لطائف کے ناممکن ہے اور یہ ایک نعمت عظمیٰ ہے کہ متاخرین اس سے پوری طرح محظوظ

ہوتے چلے آئے ہیں ذالک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون
اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا فضل فرمایا لیکن ان میں سے اکثروں نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔ آج کل اذکار و افکار
کے جو طریقے رائج ہیں انہیں یہاں اپنے بزرگوں سے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ ایک عزیز
کو اس راہ کا شوق ہوا۔ اس سے جس طرح بنا سلسلۂ سلوک اختیار کیا اور آخر ایک قسم کے اطمینان کی حالت تک پہنچا
اور مرشد و ہدایت کے آثار اس سے ظاہر ہونے لگے اور طالبان راہ حق اس سے رجوع کرنے لگا۔ یہ خود جس مقام
تک پہنچا تھا، ان کو پہنچا دیا گویا اس کے سوا کوئی اور ٹھکانا نہیں اور نہ اس کے علاوہ کوئی کمال ہے۔ اس عزیز
کے یار دوستوں نے اسی کی راہ اختیار کی اور اسی کیفیت پر اعتماد کلی کر بیٹھے۔ اس جماعت کے اکثر لوگ صرف
ایک نسبت کے حامل ہوتے ہیں یا تو نسبت شوق و تعلق یا ارواح بزرگان سے اویسی طور پر استفادہ کرنے کی
نسبت، یا نیچے طبقہ کے ملائکہ کے مشابہت کی نسبت یا نسبتِ توحید یا نسبتِ طہارت، یا عالم مثال کے اذکار
کی صورتوں سے ارتباط کی نسبت یا وہ کوئی دوسری اسی قسم کی کوئی نسبت پیدا کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے
لطیفوں میں سے کوئی لطیفہ اس نسبت کی مناسبت سے مہذب ہو جاتا ہے، اور باقی لطائف ویسے ہی کدورت
میں پڑے رہتے ہیں۔ اگر ان کے کمال کی صورتِ مثالی تمہارے سامنے آجائے تو وہ ایسی صورت ہوگی جس کی
آدھی شکل کالی ہوگی اور آدھی سفید یعنی ان کے عمل نیک و بد دونوں ہوں گے، اس جماعت کے بہت سے لوگ
شرع کی پابندی نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ سب ظاہری شرع ہے اور حقیقت اور لب لباب اس کا وہ ہے
جس کا ہمیں ادراک ہوا۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

دوسری قسم وہ ہے کہ ان کے استاد ایسے کامل و مکمل ہوتے ہیں جن کو تدبیر کلی حق نے مرشد خلق
کا خلعت بخشا۔ امت مرحومہ کا بچا کھچا ان کے ہاتھوں میں سونپا اللہ کی مرضی سے ان سے رشد و ہدایت کا
ظہور ہوا۔ ان کو اس کے متعلق ضروری باتوں کا الہام فرمایا گیا۔ اور ان کو سالکوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا گیا
وہ انکی اتباع شدت کے ساتھ کرتے رہے ان بزرگواروں نے ضرورت کے مطابق قواعد کی تمہید ڈالی اور ہر
مرض کی دوا اور ہر آفت کا علاج مقرر کیا وغیرہ وغیرہ مستشر یدین میں سے بہتوں کا ایک ہی لطیفہ اصل جبلت
میں قوی ہوتا ہے اور دوسرے لطائف ضعیف ہوتے ہیں۔ پس اگر انسب ہے ہی سے اشتغال و اذکار کرنا شروع

کریں اور ان تمام کی تربیت کا قصد کریں تو مدت دراز چاہیئے کہ وہ طاقتور لطیفہ اپنا سرور اُن سب لطائف سے حاصل کر کے مہذب ہو، جوش و خروش میں آئے اور اس لطیفہ کے تہذیب کے آثار ظاہر ہوں۔ اور یہ سالک اطمینان تک پہنچ سکے۔ ہاں اگر کوئی سالک خصوصیت کے ساتھ اس لطیفہ کی تقویت کو سامنے رکھ کر دوسرے لطائف کو مجمل طور پر جاری کر کے کوشش کرے تو جلد اس مطلب کو پہنچ جائیگا اور اطمینان حاصل کرے گا۔ اس اطمینان کا باعث جو متعدد مراتب فنا طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، وہی لطیفہ ہے، جس کی فطرت زیادہ قوی ہوتی ہے

دوسرے یہ کہ راہ طریقت کے سالک پر فنا و بقا کے مختلف احوال ظاہر ہوتے ہیں اور وہ ہر حالت کی نسبت کو لطیفہ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اور حیرت میں پڑ جاتا ہے اور عدم حصول کے گمان میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جانتا ہے کہ اس سے پیشتر جو ظاہر ہوا تھا، وہ محض غرور نفس کی وجہ سے تھا اس لئے اس کو بہت ملال اور قبض لاحق ہو جاتا ہے اور اس کا کام رک جاتا ہے۔ اور اگر وہ ہر حالت کا انتساب لطیفہ سے کرے اور ہر فنا و بقا کے رجوع کے وقت ایک خاص امر کا ادراک کرے تو وہ اس قسم کے قبض سے نجات پا جائیگا دوسرے یہ کہ اولیاء کے احوال ملاحظہ کریگا ان کے اقوال اور احوال کے اختلاف کو سمجھے گا اور شک میں پڑ جائے گا۔ کبھی اس حالت کی طرف متوجہ ہوگا اور کبھی اس حال کی طرف، اور کام سے ہاتھ کھینچ لے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ انتہا درجہ تک ایک شخص تامل کرے اور سمجھے کہ سلوک کی حقیقی انتہا یہی ہے اور فی الحقیقت ان کے اقوال و احوال کا اختلاف اور اس کے انتہا کی گوناگونی لطائف کے فطری قوت و ضعف پر مبنی ہوتی ہے دوسرے یہ کہ ایک کام کے معقول اسباب پیدا کرنے جائیں اس کام کے ساتھ مناسبت حقیقی پیدا کر لی جائے تو اس کام میں تھوڑی سی کوشش بہت سی کوشش کی برابر حکم رکھتی ہے اور روز بروز فائدہ اس سے زیادہ ہوتا جاتا ہے اور جب بصیرت اور معرفت کے اصول سے اس میں فکر کی جائے تو راستہ کھلتا جاتا ہے۔

بہر حال علم لطائف کی فضیلت اور فائدے بہت ہیں یہ تھوڑا سا اس بہت کا نمونہ پیش کیا گیا۔

معرکہ بالاکوٹ کی شکست

عمر فاروق خاں

شاہ ولی اللہ صاحب کا جو زمانہ (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) ہے اسی زمانہ میں جزیرہ عرب میں ایک اور اصلاحی تحریک وجود میں آئی۔ جس کے بانی شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) تھے [1] اس کے بعد افریقہ میں بھی اسی قسم کی ایک اصلاحی تحریک شروع ہوئی، جو سنوسی کے نام سے مشہور ہے۔ اور لیبیا میں آج اسی کے امام برسر اقتدار ہیں۔ شیخ محمد بن عبد الوہاب کا انتقال ۱۷۹۲ء میں ہوا، اور سنوسی اعظم ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوئے

---

[1] "فقہ و اعتقاد میں محمد بن عبد الوہابؒ نے امام ابن تیمیہؒ کے کتب و رسائل کا امعان نظر سے مطالعہ کیا۔ انہوں نے امام صاحب کے افکار و دعوت کو سمجھا اور اپنا لیا۔ اور اس طرح اپنایا کہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت میں لگ گئے۔ اپنے حوالی موالی کو انہوں نے افکار ابن تیمیہؒ قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت کچھ ایسے اثر انگیز انداز میں دی کہ لوگوں نے دل کے کانوں سے سنی۔ رفتہ رفتہ بہت جلد ایک بڑا گروہ ایسا تیار ہو گیا جس کا مدار اعتقاد افکار ابن تیمیہؒ تھے۔ یہ لوگ محمد بن عبد الوہابؒ کے معین و مددگار اور یاور و انصار بن گئے بلکہ ان لوگوں کی ایک چھوٹی سی مملکت بھی وجود میں آ گئی کیونکہ محمد بن عبد الوہاب کے زبردست حامیوں میں ان کے خسر محمد بن سعود بھی تھے، جو موجودہ مملکت سعودیہ کے جد اعلیٰ تھے۔"

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ از پروفیسر محمد ابو زہرہ مصری (اردو ترجمہ)

یہ دور مسلمانوں کے لئے بڑا پُرفتن اور انحطاط کا تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں مغل سلطنت اور اُدھر مغربی ایشیا میں ترکوں کی عثمانی سلطنت پوری طرح زوال کے نرغے میں آچکی تھی۔ ایک طرف ان پر یورپی قوموں کی یلغار جاری تھی اور وہ ان کے سامنے بُری طرح پسپا ہو رہی تھیں دوسری طرف شہنشاہی اور جاگیرداری نظام، جس پر ان سلطنتوں کی عالی شان عمارتیں کھڑی تھیں، بتدریج ٹوٹ رہا تھا۔ اور یورپ کی تجارتی معیشت جس نے بعد میں وہاں صنعتی انقلاب کی شکل اختیار کی، اور علاقائی قومیتوں کا پیدا کردہ استعماری سیلاب مشرق کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ دنیائے اسلام کے ہاتھ سے مشرق و مغرب کی باہمی تجارت کی اجارہ داری چھن چکی تھی، اور اب پرتگالیوں، ولندیزیوں (ڈچ) فرانسیسیوں اور انگریزوں کے سمندری جہاز ساحل افریقہ کے گرد گھوم کر براہ راست ہندوستان، انڈونیشیا اور چین پہنچنے لگے تھے۔ اور وہ زمانہ ختم ہو چکا تھا جب پرتگالی ملاح واسکوڈاگاما کو بحر ہند میں ہر جگہ مسلمانوں ہی کے تجارتی جہاز اور ہندوستان سے لیکر چین تک ہر ساحلی مقام پر انہیں کی تجارتی کوٹھیاں نظر آئی تھیں، اس کے علاوہ اسی زمانے میں خود ان ملکوں کے اندر یورپی تاجروں کی آمد کی وجہ سے دولت و ثروت جاگیرداروں، زمینداروں اور دستی کام کرنیوالے کاریگروں سے جو زیادہ تر مسلمان تھے۔ ایک نئے طبقے میں جو اکثر غیر مسلم تھا بتدریج منتقل ہونی شروع ہو گئی۔ یہ طبقہ یورپی تاجروں اور مقامی زمینداروں اور کاریگروں کے درمیان واسطے کا کام کرتا تھا۔ ترکوں کی عثمانی سلطنت میں یہ یونانی، ارمنی اور یہودی تھے، اور برصغیر میں اکثر و بیشتر ہندو تھے چنانچہ برصغیر کی دیہی معیشت کی دولت کھنچ کر کلکتہ اور بمبئی کے راستے جب یورپ کی طرف جانے لگی، تو اس کا ایک حصہ اس نئے طبقے کو بھی ملنے لگا۔ اور یہ امیر سے امیر تر ہوتا گیا اس طرح یورپی تاجر اور اس کا یہ ہندوستانی غیر مسلم گماشتہ برصغیر کی معیشت پر بتدریج چھانے لگا۔ اس کے نتیجے میں یہاں مختلف گروہوں اور طبقوں میں، جو سیاسی توازن چلا آرہا تھا، وہ خلل پذیر ہونے لگا اور شمالی ہند اور وسط ہند کے شہروں کے بجائے کلکتہ اور بمبئی برصغیر کی سیاست و معیشت کے مرکزِ ثقل بن گئے

غرض جیسے جیسے مسلمانوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار چھنتا گیا۔ اور ان کی نوابیوں کے ساتھ ساتھ ان کی سرداریاں اور جاگیرداریاں بھی ختم ہونی شروع ہوئیں تو ان سے متعلق ان کے جو فوجی طبقے تھے، وہ بے روزگار

ہونے لگے۔ ان پر کسب معاش کے دروازے بند ہوتے گئے۔ یہ تو اس برصغیر میں مسلمانوں کے حکمران ادارے سے تعلق رکھنے والے طبقات کا حال ہوا، لیکن مسلمانوں کے دست کار طبقے یورپی تاجروں کی آمد سے اور بھی زیادہ تباہ ہوئے۔ ان کی دستی صنعتیں یورپی مصنوعات کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اور کچھ تو اس مقابلہ کی وجہ سے اور کچھ سیاسی دباؤ کے ماتحت وہ بالکل اپاہج ہو کر رہ گئے اور یورپی تاجر اور غیر مسلم بنیا تمام آزاد پیشوں پر مسلط ہوتا گیا۔ سیاسی اقتدار سے محرومی اور اس معاشی زبوں حالی کے اثرات کا ان کے معاشرے پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ اس میں پہلے جو خرابیاں تھیں، وہ اور بڑھنے لگیں۔ غلط رسم و رواج میں اور اضافہ ہوا۔ اخلاقی نظم و ضبط کے بندھن ڈھیلے ہونے لگے۔ افراد کا کوئی عہد و وفاداری نہ رہا۔ جماعت کا شیرازہ بڑی سرعت سے بکھرنے لگا۔ ذہن کا جمود، نظر کی تنگی اور عمل کی کوتاہی روز بروز زیادہ نمایاں ہونے لگی۔

یہ دور تھا، جس میں شاہ ولی اللہ کی تحریک اصلاح کا آغاز ہوتا ہے۔ اُس وقت مذہبی لحاظ سے مسلمان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور بڑی شدت سے ایک دوسرے کی تکفیر میں منہمک تھے۔ علمائے امت کا زیادہ زور فروعات پر تھا۔ اور دین کے اصل مقاصد ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ صوفیاء کا حال ان سے بھی بدتر تھا۔ وہ سلف کے نام لیوا ضرور تھے، لیکن سلف کی حقیقی روح ان کے تصوف سے غائب تھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے ہی گروہی تصوف کو حرف آخر سمجھتا تھا اور کمال تصوف رہبانیت بنتا جا رہا تھا۔ نجات کے لئے چند وظائف کی تکرار کافی سمجھی جاتی۔ کسی کو معاشرتی و ملکی مسائل سے دلچسپی نہ تھی۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند" کہہ کر وہ اپنے دل کو اطمینان دے لیتے تھے۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تین پائے تھے — بادشاہ، اس کے امراء و فوج یعنی حکمران طبقہ۔ علماء اور صوفیاء، علماء قانون اور ایڈمنسٹریشن چلاتے۔ صوفیاء عوام اور حکومت کے درمیان واسطہ تھے اور بادشاہ اور امراء تو حکومت کرتے ہی تھے۔ اسلامی سلطنت کے ان تینوں پایوں کو گھن لگ چکا تھا، اور یہ بتدریج ناکارہ ہو رہے تھے۔ مختصراً یہ کا ملاً طوائف الملوکی کا زمانہ تھا اکبر سے لیکر عالمگیر تک کی بنائی ہوئی یہ وسیع و عریض سلطنت امراء گردی کا شکار ہو رہی تھی۔ ہر امیر اپنی جگہ خود مختار ہونے کی کوشش کرتا۔ اور مرکز سے اس کا تعلق بس برائے نام

ہوتا، خود مرکز میں حکومت کرنے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ بادشاہ امرا کا قیدی اور ان کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کا ایک آلۂ کار بن کر رہ گیا تھا۔ غرض برصغیر میں بسنے والے مسلمان خواص و عوام بڑی سرعت سے سیاسی انتشار، معاشرتی خلفشار، معاشی پستی اور اخلاقی و روحانی تباہی کی طرف جا رہے تھے۔ ظاہر ہے شاہ ولی اللہ جیسے صاحب النظر بزرگ ان حالات سے کیسے مطمئن ہو سکتے تھے اور یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ہر طرف سے مصائب کو یوں امنڈتا ہوا دیکھتے اور ان سے اسلام اور ملت اسلام کو بچانے کے لئے کچھ نہ کرتے انہوں نے سوچا، اور برصغیر کے اس ماحول میں، اور اس زمانے میں جس میں کہ شاہ صاحب تھے اس کے علاوہ اور کیا سوچا جا سکتا تھا کہ احمد شاہ ابدالی کو جو مغل سلطنت کے تین صوبوں پنجاب، سندھ اور کشمیر پر قابض تھا۔ دہلی کی طرف کوچ کرنے پر آمادہ کیا جائے، اور اس کی مدد سے برصغیر کے جنوب سے آنے والی مرہٹہ طاقت کو کچلا جائے۔ برصغیر کی گزشتہ تاریخ میں بارہا ہو چکا تھا کہ جب کبھی بھی اس کے مرکز میں مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوئی تو شمال سے نئی طاقت اُدھر بڑھی اور اس نے زوال پذیر حکومت کو ہٹا کر خود ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی اس طرح اسلامی سلطنت کو تازہ خون مل جاتا۔ اور برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو جاتا اس دور میں احمد شاہ ابدالی کا قندھار اور لاہور سے چل کر پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے خلاف صف آرا ہونا کسی غیر ملکی کا ملکی طاقت کے خلاف صف آرا ہونا نہیں تھا۔ وہ دور اور تھا۔ اُس دور میں برصغیر کی سیاسی حدود اور تھیں اور پھر ملکی اور غیر ملکی کے جو تصورات آج ہیں وہ اس دور میں نہیں تھے یہ تو بہر حال دو سو سال قبل کی بات ہے۔ اِس برصغیر میں پچھلے سترہ اٹھارہ سالوں میں ملکی اور غیر ملکی کی تعریف جس طرح بدلی ہے اور اس کے تصورات کیا سے کیا ہو گئے ہیں، وہ آج سب کے سامنے ہے۔

احمد شاہ ابدالی کی مدد سے مرہٹوں کا زور تو ٹوٹ گیا، لیکن بدقسمتی سے دہلی کے اسلامی مرکز میں جان نہ پڑ سکی۔ اور نہ برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کو تازہ خون مل سکا احمد شاہ واپس چلا گیا اور مغل سلطنت اسی زبوں حالی کا شکار رہی بلکہ اس کی حالت اور بدتر ہو گئی۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا خیال تھا کہ اسلامی ہند کے زوال کا تدارک شمال مغرب کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ اب احمد شاہ ابدالی کے تجربے کی ناکامی کے بعد ان کی توجہ عوام کی طرف ہوئی۔ انہوں نے ایک اصلاحی اسلامی تحریک کی فکری بنیاد رکھی جسے بعد میں ان کے پیرو کاروں

نے ایک سیاسی جمعیت کی شکل دی، اور اس نے برصغیر کے شمال مغرب میں جاکر اپنا ایک مرکز بنایا۔ اس مرکز کی پنجاب کی غیر مسلم حکومت کے ساتھ جنگیں ہوئیں۔ اور ایک وقت میں اس کی پشاور میں حکومت بھی قائم ہو گئی۔ لیکن یہ زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی، اور بالاکوٹ کے مقام پر ولی اللہی تحریک کی ان عوامی طاقتوں کو شکست اٹھانی پڑی۔ تاریخ کے ان دو حادثوں میں کتنی عجیب مشابہت ہے کہ جس طرح شاہ ولی اللہ کے پیروکاروں کو سکھ حکومت کے مقابلے میں، جس کے پاس یورپی افسروں کی تربیت یافتہ فوج تھی، بلکہ اس کے بعض سالار اور کمانڈر بھی یورپی فوجی افسر تھے۔ شکست اٹھانی پڑی اسی طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیروکار بھی مصر کے محمد علی پاشا کی فوجوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے، جو یورپی افسروں کی تربیت یافتہ تھیں اور رنجیت سنگھ کی سکھ فوجوں کی طرح ان کے بعض اعلیٰ افسر بھی یورپی تھے، اور جزیرۂ عرب میں ان کی حکومت ختم ہو گئی۔ تاآنکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطان عبدالعزیز بن سعود اٹھا، اور اس نے اپنے باپ دادوں کی حکومت کو بحال کیا، جو اب سعودی عرب کی صورت میں موجود ہے۔

اس ضمن میں جہاں تک فکر ولی اللہی کا تعلق ہے، میرے نزدیک شکستِ بالاکوٹ سے اس کے شکست کھا جانے یا دُوراز کار اور غیر موثر ہونے کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں۔ دراصل اس فکر کی اساس پر اُس وقت جو سیاسی جمعیت بنی تھی اس کی بہت سی مجبوریاں تھیں اور وہی اس کی ناکامی کا باعث بنیں۔ ایک تو اس سیاسی جمعیت کی قیادت باوجود اپنی تمام روحانی رفعتوں، عقائد کی بلندیوں اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگیوں کے ایک زوال پذیر جاگیرداری دور کی پیداوار تھی اور دوسرے اپنے سیاسی مرکز کے لئے جو سرزمین اس نے منتخب کی، اس میں ثبات و استقلال کی قدرتی صلاحیتیں سرے سے مفقود تھیں [1] اور وہاں بیٹھ کر ایک منظم اور باقاعدہ حکومت کا

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کے مقابلہ میں امیر معاویہ کی کامیابی کا ایک بڑا سبب عراق کی قبائلی زندگی کی انتشار پسندی کے خلاف شامیوں کی اجتماعیت پسندی اور ان کا فطری ثبات و استقلال تھا۔

مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ قبائل کی آپس کی منافقتیں انہیں ایک عمومی مقصد پر بمشکل ہی جمع ہونے دیتی ہیں۔ ان کی جو حالت ۱۸۳۲ء میں تھی۔ آج بھی کم و بیش ان کی وہی حالت ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے مقابلہ کرنا پڑا ایک ایسی طاقت کا جو مشینی انقلاب سے آشنا ہو چکی تھی۔ اور مشین جو نظم وضبط اور ڈسپلن دیتی ہے، اور اس کے استعمال سے ذہن و عمل میں جس قسم کی مستعدی و کارکردگی آتی ہے، اس کا آج ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کی معرکۂ بالاکوٹ میں شکست حقیقت میں اس سماج کی شکست تھی۔ جو اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ ان قوتوں کے مقابلہ کر سکے، جو یورپ کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی انقلاب کے بعد اُبھری تھیں۔ اور وہ ایک سیل جرار کی طرح سب کو بہا کر لے جا رہی تھیں۔

اور یوں بھی ایک فکر کی خواہ وہ کتنا بھی عالمگیر کیوں نہ ہو، جب عملی تعبیر ہوتی ہے اور ایک مخصوص زمانے اور ایک مخصوص ماحول میں وہ اساس اور محرک بنتا ہے کسی اجتماعی عمل کا، تو اسے لامحالہ اس زمانے اور ماحول کی بعض باتوں کو اپنانا پڑتا ہے اور سچ پوچھیے تو عمل تو نام ہی ہوتا ہے آئیڈیل اور وقتی حالات و ضروریات کے درمیان مفاہمت کا۔

مرزا غالب نے اسی حقیقت کو شاعری کی زبان میں یوں ادا کیا ہے کہ

ع۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

یہ عملی دنیا کی مجبوریاں ہیں اور جو اہل بصیرت ہوتے ہیں، وہ ایک فکر کی عملی تعبیروں میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتے بلکہ ان کی نظریں ان سے گزر کر اصل فکر تک پہنچتی ہیں، اور وہ ہر نئے زمانے میں اس کی نئی تعبیر کرتے اور اسے عمل کے لئے مشعل راہ بناتے ہیں۔ آج ہمارے ہاں بھی اسی کی ضرورت ہے۔ اور ہمیں فکر ولی اللٰہی کو اسی نظر سے دیکھنا اور اس سے اسی طرح استفادہ کرنا چاہیئے۔

اب میں مختصراً شاہ ولی اللہ کے فکر کے بعض عمومی و عالمگیر پہلوؤں کا ذکر کروں گا، جن کی میرے نزدیک آج بڑی اہمیت ہے۔ اور جن پر ذہنی و عملی دونوں لحاظ سے ہمیں اس وقت زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ شاہ صاحب ایک مسلم صاحب فکر ہیں، اور ان کا روئے سخن اولاً مسلمانوں ہی سے ہے۔ اب اس بارے میں شاہ صاحب کے فکر کی امتیازی خصوصیت

یہ ہے کہ ان سے پہلے تک مسلمانوں میں فقہ، کلام، تصوف اور مذہبی و سیاسی اختلافات کی وجہ سے جو چھوٹی چھوٹی وحدتیں بن گئی تھیں، اور ان میں باہم مناصمت پائی جاتی تھی، شاہ صاحب نے ان چھوٹی چھوٹی وحدتوں کو اسلام کی ایک بڑی وحدت کے اندر ہم نوا کرنے کا تصور دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ وہ ان کے باہمی تناقضات میں تطبیق دے کر ان سب کو ایک اصل کی فروع یا ایک حقیقت کے مختلف عکس ثابت کریں۔ اور اس طرح ملّت اسلامیہ کو وہ وحدت اور سالمیت دیں، جس سے وہ گزشتہ کئی صدیوں سے محروم تھی۔

یہ فکر ولی اللہی کا ایک اہم جزو ہے۔ اور اس فکر کی دوسری امتیازی خصوصیت اس کی نظریۂ وحدت الوجود کی خصوصی تعبیر ہے۔ اس سے ایک تو شاہ صاحب نے روح اور مادہ کی نام نہاد دوئی کو ختم کرنے کی کوشش کی، دوسرے انہوں نے اسے بنیاد بنایا وحدتِ ادیان اور وحدت انسانیت کے تصور کا نیز حکمت یعنی فلسفہ اور نبوت یا حکماء اور انبیاء میں جو مغائرت مانی جاتی ہے۔ اور اداک حقیقت کے معاملے میں سامی اور آریائی ذہن میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس کو وحدت الوجود کی اپنی تعبیر سے دور کرنے کی سعی کی۔ شاہ صاحب کے فکر کی تیسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود ایک عالم، صوفی اور صاحبِ ذکر و فکر ہونے کے انہوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ معاشی لحاظ سے ایک حد تک مطمئن معاشرے کے بغیر روحانیت کا حصول ناممکن ہے۔ اور معاشی استحصال بھی ظلم کی ایک صورت ہے اور اللہ تعالےٰ اس قسم کے ظلموں کو ختم کرنے کے لئے نبی مبعوث کرتا رہا ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اُس دور میں ایک فلاحی مملکت کا تصور دیا، لیکن ایسی فلاحی مملکت جو آبادی کی معاشی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی تقاضوں کا بھی خیال رکھے۔

میرے نزدیک آج ہمیں فکر ولی اللہی کے ان پہلوؤں کو خاص طور سے اجاگر کرنا چاہیئے، اور انہیں اپنے لئے مشعل راہ بنا کر اس مملکت کی تشکیل نو کی کوشش کرنی چاہیئے۔

تنقید و تبصرہ

مسلمانانِ ہند پاکستان کی تاریخِ تعلیم

زیرِ نظر کتاب کے مصنف سیفیہ کالج بھوپال کے وائس پرنسپل پروفیسر سید نوشہ علی ہیں۔ "پیش لفظ" پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر سید معین الحق نے لکھا ہے اور کتاب میں جہاں جہاں "حواشی و تعلیقات" کی ضرورت تھی، وہ مفتی انتظام اللہ شہابی نے پوری کردی ہے۔ گو مصنف اس مفید اور اہم موضوع کا پورا احاطہ نہیں کرسکے جس کا کہ موصوف نے خود اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے، اس لئے پروفیسر نوشہ علی کی یہ علمی کوشش ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے اور یقیناً علمی حلقے اس کا خیر مقدم کریں گے۔

"پیش لفظ" میں بالکل صحیح لکھا گیا ہے کہ "اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس میں انسان کی روحانی اور دنیوی زندگی کے ہر پہلو کی فلاح و بہبود کے لئے ہدایت موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں روحانیت اور لادینیت کا وہ فرق جو یورپ کے مذہبی تصورات میں اس قدر نمایاں نظر آتا ہے، موجود نہیں۔ اس لئے تعلیم میں دین کا عنصر شامل ہونے سے اس کے تصورات میں نہ تنگ نظری کا خطرہ ہے اور نہ تنگیٔ میدان کا۔ اس نظامِ تعلیم سے جس کی بنیاد دینی تصورات اور عوامل پر رکھی گئی ہے عظیم المرتبت مفکر، فلسفی، سائنس داں، ادیب، اور شاعر پیدا کئے۔ جن کی تخلیقات کسی نہج سے دینی نہیں کہی جاسکتیں"

اسلامی تاریخ کا وہ دور جب کہ تعلیم میں دین کا عنصر شامل تھا، اور اس کے باوجود اس کے تصورات میں تنگ نظری تھی اور نہ تنگیٔ میدان، واقعہ یہ ہے کہ علمی و ذہنی لحاظ سے مسلمانوں کا بہترین دور تھا۔ اس دور میں ایک تو دینی اور

دنیوی علوم میں اس طرح تفریق نہیں کی جاتی تھی، جیسی بعد کے دور میں، جسے دورِ زوال کہنا چاہیئے" کی جانے لگی۔ اس دور میں ہر دینی علم دنیوی بھی تھا۔ اور ہر دنیوی علم دینی بھی۔ اور یہ کہ "اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے" اس کی علمی تعبیر یوں ہوتی تھی۔ اور اسلام کو حقیقتاً "حسنۃً فی الدنیا" اور "حسنۃً فی الاخرۃ" کا حامل اور جامع سمجھا جاتا تھا اس دور میں اُس زمانے کے جو بھی معلوم مروج علوم تھے سب ایک ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ اور ان کی تحصیل کے بعد ایک آدمی "عالم دین" بھی ہوتا تھا، اور "سول سرونٹ" بھی۔ دوسرے اس دور میں جب کہ دینی اور دنیوی علوم کی موجودہ تفریق نہیں تھی، علمی و ذہنی لحاظ سے بڑی آزادی تھی اور بعد میں ہمارے ہاں تصورات میں جو تنگ نظری اور تنگیٔ میدان پیدا ہوئی وہ اس وقت نہیں تھی۔ دینی اور دنیوی علوم کو ایک جگہ پڑھانے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سے ذہن آزاد رہتا ہے۔ طلبہ اور اہل علم کے سامنے ہر قسم کے موضوع آتے رہتے ہیں اور ان کا زاویہ نگاہ محدود نہیں ہوتا۔

مثال کے طور سے امام غزالی کو لیجیئے۔ ان کے فکر کی جدت، عظمت اور اجتہاد و خلاقی تمام تر رہینِ منت تھی اُس دور کے بغداد کی، جس کی اس وقت مولانا شبلی کے الفاظ میں علمی و تعلیمی فضا یہ تھی :- "بغداد دنیا بھر کے عقائد و خیالات کا دنگل تھا۔ اس زمین پر قدم رکھ کر ہر شخص پورا آزاد ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ چاہتا تھا کہہ سکتا تھا" پیش لفظ میں مشہور مسلمان فلسفیوں الکندی، فارابی، ابن رشد، ابن سینا۔ اور البیرونی کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے فلسفہ و سائنس کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ڈاکٹر معین الحق کے الفاظ میں یا سی نظم تعلیم کا حاصل تھے جس میں دین کا عنصر شامل ہونے کے باوجود نہ تصورات کی تنگ نظری کا خطرہ تھا نہ تنگیٔ میدان کا۔ افسوس یہ ہے کہ برِ صغیر پاک و ہند میں اس نظم تعلیم کی جڑیں زیادہ نہ جم سکیں اور ہمارے ہاں سے اس بلند پایہ کے فلسفی پیدا نہ ہو سکے مصنفِ کتاب اس ضمن میں لکھتے ہیں :- "عام خیال لوگوں کا یہ ہے کہ ہندوستان نے اعلیٰ درجے کے علماء پیدا نہیں کئے۔ ہندوستانی مفکر بغداد، دمشق و قرطبہ کے علماء کی تقلید کرتے رہے۔ ہندوستان نے کوئی بلند پایہ عالم پیدا نہیں کیا۔" موصوف کے نزدیک "اس اعتراض کو دور کرنے میں بہت دشواریاں ہوں گی ۔۔۔ اس میں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک کی درس گاہوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔" بہر حال یہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ "ہندوستان نے بو علی سینا، غزالی اور ابن رشد پیدا نہیں کئے، مگر ان علماء کو ہندوستان میں کتب درسیہ کی شکل میں لانا اور اس تعلیم کو

زندہ رکھنا یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خاص طور پر جب کہ ملک کی زبان عربی فارسی نہ ہو"

یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ابتدا میں ایرانیوں نے دینِ اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی قبول کی اور اس میں نظم و نثر اور دوسرے علوم کے لازوال آثار چھوڑے، پھر انہوں نے عربی زبان ترک کر کے اپنی زبان فارسی کو زندہ کیا اور اس میں بھی عربی کی طرح اعلیٰ پائے کی علمی تخلیقات کیں، لیکن اس کے برعکس ہندپاکستان میں تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی، لیکن انہوں نے یہاں ایسی علمی یادگاریں نہ چھوڑیں کہ انکی تاریخِ تعلیم زیرِ نظر کتاب سے بہتر لکھی جا سکتی۔ مصنف کو اس کتاب کی ترتیب میں بڑی جان کاہی کرنی پڑی ہے۔ کیونکہ بقول ان کے "مفید مطلب واقعات مسلسل اور یکجا نہیں مل سکے۔ یہ تاریخی میدان میں بکھرے ہوئے موتی ہیں، جن کو ایک لڑی میں پرونا آسان کام نہیں ہے اس طرح بعض مرتبہ ایک بہت مفید مطلب کتاب کو چند شکوک کی بنا پر نظر انداز کرنا پڑا۔ اور سینکڑوں صفحات پڑھنے کے بعد چند سطور مفید مطلب نظر آئیں۔"

ہندوستان میں اتنے طویل اسلامی عہد میں عراق، ایران، وخراسان مصر و شام اور اسپین کی طرح اعلیٰ پائے کے کیوں فلسفی و مفکر پیدا نہ ہوئے یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر تحقیق ہو اور اس کے وجوہ معلوم کئے جائیں کہ آخر کیوں برصغیر کے ذہین اور دانشور غیر مسلم طبقوں نے بالعموم اس طرح اسلام اور اسلامی تہذیب کو نہ اپنایا جس طرح مثال کے طور سے ایرانیوں نے اپنایا تھا، نیز اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسلامی علوم کی جڑیں اس سرزمین میں زیادہ کیوں نہ پھیلیں۔ یہ علوم "اسلامی ہندی" کیوں نہ ہوئے اور ہمارے اہل علم و فکر کی نظریں ہمیشہ شمال کی طرف سے آنے والے علماء کی طرف کیوں لگی رہیں کیا یہ تکلیف دہ بات نہیں کہ مسلمانان ہند و پاکستان کی تاریخ تعلیم کے مصنف کو یہ لکھنا پڑا کہ اگرچہ ہندوستان سے بوعلی سینا غزالی اور ابن رشد پیدا نہیں کئے، لیکن اس کے علماء کا یہی کارنامہ بہت بڑا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو درس میں شامل کیا اور اس طرح انہیں زندہ رکھا۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر دہلی اور وسطِ ہند کی تعلیمی سرگرمیوں تک اپنی بحث کو محدود رکھا ہے اس میں سندھ، پنجاب اور مشرقی پاکستان کی تعلیمی زندگی کا کوئی ذکر نہیں، ضرورت ہے کہ کوئی صاحب اس کمی کو پورا کریں اور ان اطراف کی تاریخ تعلیم بھی مرتب کر دیں، خاص طور سے سندھ کی اس نوع کی

تاریخ لکھنا زیادہ مشکل نہیں، کیونکہ اس کے لئے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے، اور سندھی علماء کا سلسلہ شروع سے آخر تک ملتا ہے۔

کراچی کی سلمان اکیڈمی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے کچھ عرصے سے بڑی اچھی اور مفید کتابیں شائع ہورہی ہیں جو علمی بھی ہیں اور تحقیقی بھی۔ اور جن سے اس نئی مملکت میں صحیح معنوں میں علمی وفکری زندگی پیدا کرنے میں مدد مل سکتی ہے یہ کتاب سلمان اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ اور ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۵ سے مل سکتی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ ضخامت ۳۲۵ صفحے اور قیمت ۷۵۔۶ روپے ہے۔

طباعت اور کتابت زیادہ اچھی نہیں، کتابت کی بعض غلطیاں کافی تکلیف دہ ہیں ایک علمی و تحقیقی کتاب کی اشاعت پر زیادہ توجہ ہونی چاہیئے تھی۔

تاریخ شیر شاہی

از عباس خاں سروانی

مترجم۔ مظہر علی خاں

ہندوستان کے مشہور پٹھان بادشاہ شیر شاہ سوری کی اس تاریخ کے مصنف عباس خاں سروانی پٹھان تھے اور شیر شاہ کے خاندان سے ان کی قرابت تھی خود اکبر اعظم نے جس کے باپ ہمایوں کو شیر شاہ نے پے درپے شکستیں دے کر ہندوستان سے فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، مصنف کو ہدایت کی کہ وہ شیر شاہ کی تاریخ لکھے۔ ڈاکٹر سید معین الحق مقدمہ کتاب میں لکھتے ہیں :۔" تاریخ شیر شاہی شیر شاہ کی پہلی تاریخ ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی وفات کے پینتیس چالیس سال بعد لکھی گئی اس وقت تک بعض وہ لوگ بقید حیات تھے، جنہوں نے شیر شاہ کی فتوحات یا نظام سلطنت میں حصہ لیا تھا، ایسے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود تھے، جو اس عہد کے واقعات کی چشم دید گواہی دے سکتے تھے۔ عباس خاں نے ان ہی کے بیانات اور شہادت پر اپنی تاریخ تیار کی ۔۔۔ عباس خاں نے واقعات اور معلومات کی فراہمی میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ کتاب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عباس خاں بہت بڑا ادیب نہ تھا۔ لہٰذا عبارت آرائی کے ذریعہ اس نے واقعات کی شکل بدلتے یا ان کو کسی خاص رنگ میں پیش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی "

یہ اکبر کی شخصی عظمت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ ایک پٹھان مورخ کو ایک ایسے پٹھان بادشاہ کی

تاریخ لکھنے کا حکم دیتا ہے جس نے اس کے باپ سے تخت چھینا تھا اور اسے شکست دی تھی اور جس کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ عباس خاں نے اکبر کے حکم سے یہ تاریخ لکھی اور ظاہر ہے، اسے اکبر نے ضرور دیکھا ہوگا، اور شیر شاہ کے ہاتھوں جس طرح اس کے باپ کو شکستیں ہوئیں، وہ اس کی نظر سے گذری ہوں گی۔ مصنف نے جہاں شیر شاہ کی تعریف میں کسی قسم کے مبالغے سے کام نہیں لیا، جو اس کے لئے اُن حالات میں ناممکن تھا اس نے اکبر کو خوش کرنے کے لئے شیر شاہ کے ساتھ زیادتی بھی نہیں کی اور حتی الوسع اس کی تمام خوبیاں بیان کردی ہیں اس لحاظ سے تاریخ شیر شاہی کی بہت اہمیت ہے، اور تاریخ ہند کے ہر طالب علم کو اسے پڑھنا چاہیئے۔

شروع میں فریدخاں (شیر شاہ) کے خاندانی حالات ہیں۔ اور سوتیلی ماں کی وجہ سے اپنے والد کے ساتھ جو ناچاقی ہوگئی تھی اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر جس خوبی سے اس نے اپنے باپ کی جاگیر کا انتظام کیا اور بعد میں آہستہ آہستہ ترقی کرکے پورے بہار اور بنگال کا وہ حاکم ہوگیا، مصنف نے اس کا ذکر کیا ہے۔

جب فریدخاں اپنے باپ میاں حسن سے رخصت ہوکر جاگیر کو جانے لگا، تو اس نے بقول مصنف باپ سے جو عرض کیا، وہ دراصل بنیادی نقطہ ہے اس کی تمام بعد کی کامیابیوں کا اور اساس ہے اس کے نظام حکومت کا۔ فریدخاں نے اپنے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔ سپاہیوں میں اکثر تمہارے عزیز ہیں کہ وے لوگ دونوں پرگنوں میں ہیں۔ اور میں بہت سی زراعت اور عمارت کے زیادہ ہونے میں سعی کرونگا اور عمارت وزراعت کی زیادتی سوائے عدل کے میسر نہیں ہوتی۔ حکیموں نے کہا ہے اچھی خصلتوں سے عدل ہے کہ نتیجہ اس کا بقا پادشاہت کی اور وسعت ملک کی ہے۔ اور زیادتی خزانے کی اور آباد ہونا گاؤں اور شہر کا ہے، اور برُے کاموں سے ظلم ہے کہ ثمرہ اس کا زوال پادشاہت کا اور خرابی ملک کی اور موجب بدنامی کا دنیا و آخرت میں ہے اور آباد ہونا ملک کا دو چیز پر موقوف ہے اوّل تمام رعیت پر شفقت کرنا اور زیردستوں پر رحم کرنا کہ وے سپرد کئے ہوئے حق تعالےٰ کے ہیں تاکہ بیاملا وانہوں کی ظالموں کی جفا اور ستمگاروں کی ہلاکی شدت سے محفوظ رہیں۔

بیت

ملک گر آباد چاہے خلق کو معمور رکھ — اور بلا سے ظالموں کی ان کے تئیں نت دور رکھ

دوسری سیاست کہ آبادی ملک کی اس پر موقوف ہے۔ اگر وہ شہ ہاکام اس بندوبست پر نہ رہے اور کسی کی

پادشاہت میں جلدی خرابی پڑتی ہے۔

بیت

سیاست سے ہو ملک کا انتظام سوائے سیاست کے ہوئے خلل

اور بدوں قاعدے شریعت کے حق اپنے مرکز پر قرار نہیں پاتا کام شرع اور دین کا بے واسطے سیاست کے رونق نہیں پکڑتا۔"

اس کے بعد حاکم کے فرائض کی یوں نشان دہی کی :۔ "حاکم کو چاہیئے کہ سستی اور کاہلی کو کام نہ فرماوے اور بارعام کا حکم کرے تاکہ مظلوموں کے احوال سے بخوبی آپ واقف ہو اور عدالت کے باغ کو سیاست کی آب جو سے پانی دے۔ نہیں ہے ملک مگر عدل سے اور نہیں ہے عدل مگر سیاست سے، پادشاہت سوائے سیاست کے قبضے میں نہیں رہتی اور سوائے آبِ زلالِ سیاست کے فتنے کا غبار نہیں بیٹھتا۔

بیت

تیغِ سیاست ایسی ہے رُخسارِ ملک کو عالم فروز کرتی ہے مانند آفتاب"

شیر شاہ نے جونپور میں تعلیم پائی تھی، جو ایک سو سال سے بہت بڑا علمی مرکز چلا آتا تھا عباس خاں نے لکھا ہے کہ اس نے کافیہ قاضی شہاب الدین کے حاشیوں سمیت خوب یاد کیا اور علم بھی تحصیل کیا۔ گلستان، بوستان اور سکندر نامہ وغیرہ بھی پڑھا اور اس بادشاہ کے عہد میں علماء جو واسطے تلاش معاش کے آتے تھے، ان سے حاشیہ بندی کا پوچھتا اور اکثر اوقات تواریخ پادشاہان گزشتہ کی مطالعہ کرتا۔"

وہ کچھ عرصہ بابر کی فوج میں رہا، وہاں اس نے ایک مدت مغلوں میں رہ کر لڑائی کا طور اور تدبیر ملک داری کی اور سعید ارکانِ دولت کا معلوم کیا۔ پھر اکثر اوقات پٹھانوں کی مجلسوں میں کہتا "اگر میرے بخت نے ساعدت کی اور اقبال نے یاوری کی تو مغلوں کو ملک ہند سے بآسانی نکالوں گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس نے واقعی مغلوں کو ملک ہند سے نکال دیا۔

علہ سیاست سے یہاں مراد سرکشوں پر سختی سے ہے۔ (تبصرہ نگار)

بنگال سے واپسی پر چوسہ کی لڑائی میں جب شیرشاہ نے ہمایوں کو شکست دی اور مغل لشکر تتر بتر ہوگیا۔ تو اس نے ہمایوں کے حرم محترم کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ عباس خاں کی زبان سے سنئے:۔ "عباس احمد سروانی جو مولف تحفہ اکبرشاہی کا ہوں زبانی خان اعظم مظفرخاں کہ نواسہ مسند عالی ہیبت خاں اور نواسہ مسند عالی عمر خاں ککھور کا تھا سنا ہیں نے کہ کہتا تھا کہ میں شیرخاں کے پاس کھڑا تھا کہ بیگم اور جمیع حرم محترم ہمایوں بادشاہ کی بہت سے رنڈیوں کے ہمراہ لائے جس وقت شیرخاں نے ان کو دیکھا گھوڑے سے اتر کر بہت سی تعظیم و عزت کی اور دوبارہ وضو کر، دوگانہ شکرانے کا حق سبحانہ' تعالیٰ کی جناب میں ادا کیا اور ہاتھ مناجات کے واسطے اٹھا کر نہایت عجز و نیازی سے کہا یا الٰہ العالمین بزرگی اور دست قدرت تجھے سزاوار ہے کہ اس میں زوال و نقصان کو راہ نہیں کہ ادنی بندہ فرید کو سرفراز کیا اور ہزیمت ہمایوں بادشاہ کے لشکر میں کہ وہم و خیال میں نہ آتی تھی اور اس کے اہل و عیال کو میرا اسیر کیا۔ بعد اس کے نقیبوں کو حکم دیا کہ لشکر میں پکار دو کہ کوئی آدمی مغلوں کے زن و فرزند کو اسیر نہ کرے۔ رات کی رات اپنے اپنے ڈیرے میں رکھیں اور تڑکے ہی سب کو بیگم کے سراچوں پاس لادیں اور اس کے حکم کا دبدبہ پٹھانوں کے لشکر میں ایسا خوب تھا کہ کسی کو مقدور نہ تھا کہ اس کے خلاف کرے۔"

اس کے بعد ہمایوں سے شیرشاہ کی ایک اور جنگ ہوتی ہے، اس کا ایک واقعہ عباس خاں یوں بیان کرتا ہے:۔ "حمید خاں گاکر کہ مشیروں سے شیرخاں کے تھا، اس نے عرض کیا کہ ابھی سارا لشکر مغل کا نہیں اترا (دریائے گنگا سے پار نہیں ہوا) مارا چاہیئے شیرخاں نے کہا اس سے آگے میرے تئیں دست قدرت نہ تھی اور ہر ایک طرح کا مکر و حیلہ لڑائی میں کرتا تھا اور ان دنوں میں برکت سے لطف قادر قیوم کی لشکر میرا بادشاہ کے لشکر سے کم نہیں ہے، آپس کی مخالفت اور کم طالعی کے باعث پہلے مغلوب تھے اور میرے اقبال دولت کے سبب پٹھان جس مقام پر مغلوں سے لڑے غالب آئے اس قدرت پر میں عہد شکنی نہیں کروں گا۔"

غرض پوری کتاب اس طرح کے دلچسپ واقعات پر مشتمل ہے اور اسے پڑھ کر شیرشاہ کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

آخر میں شیر شاہ کے اخلاق و عادات اور اس کے نظام حکومت کا بیان ہے۔ مصنف لکھتا ہے۔
"شیر خاں بڑا عادل تھا اور اکثر اوقات فرماتا کہ عدل ہر دین میں بہتر ہے۔ اور کفر و اسلام کے بادشاہوں کے نزدیک بھی خوب ہے کوئی طاعت و عبادت برابر عدل کے نہیں ۔۔۔ اور جو کچھ بھی کاہلی ارکان دولت سے ظہور میں آوے، تو سبب ملک کے زوال کا ہے۔ اور طمع دنیوی کو سپاہی اور رعیت کے حق میں زور و قوت کے باعث اور فوج و حشم کی ہدایت سے راہ نہ دے اور مظلوم و ستم رسیدہ کے تیر آہ سے پرہیز کرے۔

بیت

فولاد کی زرہ سے اگر گزرے تیرا تیر پیکان آہ گزرے ہے کوہ حدید سے"

افسوس شیر شاہ کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا زیادہ موقع نہ ملا، لیکن اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کو جو امن ملا، وہ عباس خاں کی زبان سے سنئے۔

"جس روز سے شیر خاں نے مسند حکومت و سرداری پر قرار پایا کسی شخص کو مخالفت کی دم مارنے کی مجال نہ تھی اور کوئی شخص نشان زبردستی اور بغاوت کا اور کوئی خار دل آزار اس کے ملک کے گلشن میں نہ اگا اور کسی امیر و سپاسی یا چور و قضاق (قزاق) کا یہ زہرہ نہ تھا اور شیر خاں کے عصر میں مسافر و رہ گزر نگہبانی کی محنت سے بے پروا تھے اور چلنے کے وقت تعین منزل سے کچھ فکر و اندیشہ دل میں نہ رکھتے تھے اور جس مکان پر رات ہوتی، خواہ ویران ہو خواہ آباد، وہاں نڈر اتر پڑتے اور مال و اسباب اپنا بے اندیشے رکھ دیتے اور مرکب کو چراگاہ میں چھوڑ دیتے اور آپ بفراغت تمام اپنے گھر کی طرح سو رہتے اور اس اطراف کے زمیندار اس وہم سے کہ مبادا اُن کو آزار پہنچے اور وہ سبب اپنی گرفتاری و خواری کا ہو نگہبانی کرتے اور اس کے عصر میں کیسی ہی بڑھیا زر و زیور اپنے سر پر راہ میں لئے جاتی ہو تو کوئی چور یا کتوال کا پیادہ شیر خاں کے ڈر سے اس کے امن کے گرد نہ پھر سکتا۔

بیت

کیا سایہ عالم میں اس طور پر کہ رستم سے بڑھیا بھی ہے گی نڈر

مل کتاب فارسی میں تھی۔ مظہر علی خاں ولا نے جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا ایک انگریز کپتان کی فرمائش پر اس کا اردو میں ترجمہ کیا، سلمان اکیڈمی نے بجنسہ وہی ترجمہ چھاپ دیا ہے اور الفاظ و ترکیب کے علاوہ املا تک بھی ہی رہنے دی ہے۔ جیسے قبول نکیا۔ "سپاہی یونہیں"۔ "ہنو"۔ "نرہٹے"۔ "نتھا" "نڈروں گا" "تفناق" نلے سکے"۔ "رکھتے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

اگر ناشرین حضرات کسی وجہ سے مظہر علی خاں ولا کے ترجمے کی زبان اور اس کا اسلوب برقرار رکھنا ضروری سمجھتے تھے، تو وہ اسے ضرور برقرار رکھتے، لیکن اگر کم سے کم وہ طریقۂ املا ہی آج کے زمانے کے مطابق کر دیتے، تو س کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی۔ اور اسے پڑھنا اور سمجھنا آسان ہوتا۔ آخر یہ ادب کی کتاب تو ہے نہیں کہ فورٹ لیم کالج کے عہد کے لئے سند کا کام دیتی، یہ تاریخ کی کتاب ہے، اور اس کا عام فہم ہونا ضروری ہے۔

کتاب مجلد ہے، ضخامت ۱۵۶ صفحات، بڑا سائز $\frac{20\times26}{8}$، قیمت پانچ روپے

ناشر۔ سلمان اکیڈمی۔ حق نشان۔ ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۵

سیرت سیّد احمد شہیدؒ حصّہ اوّل

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی اس مشہور تصنیف کے حصّہ اوّل کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے جسے کچھ عرصہ ہوا رے اہتمام سے لاہور سے شائع کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے ولادت سے بیعت امامت تک کے حالات آگئے ہیں۔ حصّہ دوم بیعت امامت کے بعد سے معرکۂ بالاکوٹ اور شہادت کے حالات پر مشتمل ہوگا حصہ شاید اب تک شائع نہیں ہوسکا۔ زیر نظر کتاب کے بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ہیں حصّہ دوم کی ضخامت اس سے زیادہ ہوگی، اس میں سیّد صاحبؒ کے اوصاف و اخلاق اور صفات و خصوصیات کا بیان ہوگا۔ اور آپ کے مجددی اور اصلاحی کارنامے، آپ کی جماعت کی سیرت و اخلاق خلفا اور اہل ارادت پر مستقل ابواب ہوں گے۔

ان سالوں میں حضرت سید احمد شہید اور ان کی تحریک احیائے دین پر دو صاحبوں نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے ل تو اس کتاب کے مصنف ہیں، اور دوسرے مولانا غلام رسول مہر۔ ان دونوں بزرگوں کو سیّد صاحب سے انتہائی قیدت بھی ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر تحقیق کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی ...

سید صاحب اور ان کی تحریک پر جو بھی تاریخی مواد کہیں سے مل سکتا تھا اس سے استفادہ کیا۔ اور کئی سال اس میں لگائے۔ آخر اپنی تحقیق و تدقیق کا حاصل ان کتابوں میں پیش کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا غلام رسول مہر کی تصنیفات حضرت سید احمد شہید اور ان کی تحریک کا پورا احصا کرتی ہیں اور اس کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

زیر نظر کتاب کے مصنف کے نزدیک سید احمد شہید ان افراد امت میں سے ایک فرد ہیں "جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مکمل صحیفہ ہیں، جنہوں نے آپ کے کمالات میں سے انتخاب نہیں کیا، بلکہ ان کو مسلّم لیا۔ یہ وہ افراد ہیں، جن میں سے ہر فرد اپنی جامعیت میں ایک پوری امت ہے"۔ سید احمد شہید کے پیش نظر کیا مقاصد تھے۔ مصنف نے مختصراً انہیں یوں بیان فرمایا ہے:۔ "سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن وکاہ برآوردن" ثابت ہوں گی۔ صرف چند لوگوں کی اصلاح ہوگی۔ لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے آپ اسی نقشے پر کام کرنا چاہتے تھے، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے کیا، اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لئے وہی نظام عمل ہے"۔

سید صاحبؒ کی کوششوں کے عملی نتائج کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ "آپ نے تھوڑے زمانے میں ایک دینی فضا قائم کردی، جس کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ تیرہویں صدی میں صحابہؓ کا نمونہ تھے ایک رنگ میں رنگے ہوئے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے اللہ کے لئے جان دینے والے ...... تاریخ اسلام میں ایک جگہ اتنی بڑی تعداد میں اس پختگی اور جامعیت کی کوئی جماعت صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد مشکل سے ملے گی۔ کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں، لیکن ایمان و یقین اور خلوص و للہیت کی ایسی باد بہاری کہے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم و توکل، جوش جہاد، ایمان و احتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے آدم گری اور مردم سازی اصلاح انقلاب کے لیے محیرالعقول واقعات بھی اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں، تو کم یاب ضرور ہیں ۱۴۰ اور جہاں

تک سید صاحب کی اس دعوت و تحریک کا تعلق ہے مصنف کے الفاظ میں "ان آخری صدیوں میں ہم کو دنیائے اسلام میں کسی ایسی مذہبی تحریک کا علم نہیں ہوا، جو ہندوستان کی اس تحریک احیائے سنت و جہاد سے زیادہ منظم و وسیع ہو، اور جس کے سیاسی و مذہبی اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوں ...."

لیکن ان تمام فضائل اور کارناموں کے باوجود تاریخ کا یہ کتنا بڑا اور دردناک سانحہ ہے کہ اس تحریک کے داعی و قائد معرکۂ بالاکوٹ میں شہید ہوئے، اور یہ تحریک نہ تو اس سرزمین میں غلبۂ کفار کو روک سکی اور نہ اس سے احیائے دین کے سلسلہ میں وہ نتائج نکلے، جو اس کے دعاۃ اور کارکنوں کے پیش نظر تھے۔

جہاں تک حضرت سید احمد شہیدؒ کے سوانحِ حیات اور آپ کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کا تعلق ہے، مصنف نے واقعی اس کتاب میں اس کا پورا حق ادا فرمایا ہے، اور ان کی یہ سعی ہر لحاظ سے کامیاب ہے، لیکن سید صاحب کی دعوت کا جو تاریخی پس منظر انہوں نے پیش کیا ہے، ایک تو وہ بہت مختصر ہے، دوسرے اس میں عقیدت مندانہ جذبات ضرورت سے زیادہ ہے بے شک اس دنیا کی زندگی میں "ایمان و یقین اور خصوصی وللہیت" کی بہت اہمیت ہے، لیکن سیاسی، معاشی، اجتماعی اور طبقاتی ٹھوس حقیقتوں کی بھی اس زندگی میں اپنی جگہ ہے، جس کو نظر انداز کرنا گویا ناکامی کو دعوت دینا ہے۔ حضرت سید احمد شہید کے سوانح نگار ان حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر اس موضوع پر لکھیں، تو ہمارے خیال میں اس کے اثرات زیادہ نتیجہ خیز ہوں گے اور قارئین حضرت سید احمد شہیدؒ کی عظمتِ ذاتی اور ان کے ساتھیوں اور پیروؤں کے "عزم و توکل، جوش جہاد، ایمان و احتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت" کے محیر العقول واقعات کے ساتھ ساتھ ان کی ناکامی کے اسباب بھی جان سکیں گے اور یہ مطالعہ ان کے لئے سامان عبرت بھی ہوگا، اور مستقبل کے لئے مشعل راہ بھی، (ا - س)

کتاب مجلد ہے۔ قیمت : ۵۰ - ۸ روپے ہے اور اس پتے پر مل سکتی ہے۔

القادر - ناشران کتب اسلامی - ۱۸ ایمپریس روڈ ——— لاہور

افکار و آرا

مکرمی .....

"الرحیم" کے مطالعہ کے دوران ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ بعض ضروری اصطلاحات کے مرادفات کا انگریزی میں شاملِ متون ہونا نہایت مفید ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی ہے۔ اور متعدد علمی رسائل کا ایک عرصہ سے یہ دستور چلا بھی آرہا ہے۔ آپ بھی یہ طریقہ کار اختیار کریں بالخصوص اس دور میں جب کہ شاہ صاحب کی اصطلاحات علمیہ کا تعارف نہایت اہم اور ناگزیر ہے، یہ چیز اکیڈمی کے بنیادی مقاصد میں ہونی چاہیئے۔

ایک عرض اور ہے۔ رسالے کی زبان ذرا سہل کیجئے۔ بہت سے شائقین مضامین کو عربی کے ادق الفاظ سے مملو پاکر ان سے استفادہ نہیں کرسکتے۔ مقصد خیالات کی نشر و اشاعت ہونی چاہیئے نہ کہ لوگوں پر الفاظ کی بمباری اگرچہ "شذرات" میں شاہ صاحب کی علمی اصطلاحات اور دقیق مسائل کی تشریح کی ضرورت کا اظہار کیا گیا ہے لیکن جس زبان میں خود یہ "شذرات" ہیں اگرچہ وہ لکھنے والے کے مبلغ علم کے عمق و وسعت پر مشعر ہیں۔ لیکن عام قارئین کے لئے باعث گرانی ہیں۔

ایک حقیقت جس پر بار بار زور دینے کی ضرورت ہے وہ ہے تنگ نظری سے دست کشی اور وسعت نظری بدقسمتی سے ہمارے اکثر اہل علم حضرات میں تعصبات پائے جاتے ہیں اور وہی سب سے زیادہ نقصان موجب ہوئے ہیں۔ اگر شاہ صاحب کی تعلیمات کے طفیل ہمارے ہاں سے یہ تعصبات ختم ہو جاتے تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ بہر حال اب ہمیں شاہ صاحب کی تعلیمات کی اس روح کو خاص طور سے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

آج تقلیدی ذہن کو جھنجھوڑنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ نیز جن منابع (SOURCES)

سے شاہ صاحب نے استفادہ کیا ہے، جب تک ان تک موجودہ نسل کی رسائی نہیں ہوگی، شاہ صاحب کو ٹھیک طرح سمجھا نہیں جاسکتا۔ مزید برآں شاہ صاحب نے جس حد تک کام کو بڑھایا ہے، وہ آخری حد نہیں ہے۔ اس کام کو اور آگے بڑھانا چاہیئے۔ اور اس کے لئے باہمت نفوس کی ضرورت ہے، اور وہ جب ہی پیدا ہوں گے کہ تحقیق اور ریسرچ آزادانہ اور وسیع پیمانے پر ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ بے جا تقدس کو راستہ میں بلا وجہ اور بے فائدہ حائل نہ ہونے دیا جائے۔

(حکیم) محمد قاسم۔ مزنگ لاہور

"الرحیم" کے دوسرے شمارے میں "عرب قومیت، اشتراکیت اور اسلام" مضمون پڑھا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج دنیا میں بڑے پیمانے پر سیاسی، معاشی اور سماجی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور پس ماندہ اور محکوم قومیں ترقی اور آزادی کی منزل پر پہنچنے کے لئے کوشاں ہیں۔ صرف عرب ممالک میں ہی نہیں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دوسرے ممالک میں بھی آئے دن انقلابات رونما ہو رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ترقی یافتہ حکمراں قوموں نے پس ماندہ محکوم قوموں کو سیاسی آزادی دینے کے بعد بھی بدستور اپنی اقتصادی غلامی میں جکڑ رکھا ہے جس کے خلاف ان کے عوام میں سخت ہیجان برپا ہے اور وہ اپنے ہاں سیاسی آزادی کے بعد اقتصادی آزادی بھی بروئے کار لانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے اپنے سماج میں بنیادی اور دور رس تبدیلیاں لانے کے حق میں ہیں۔ یہ ساری کشمکش آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے،

سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں کیسی ہوں گی، اور انہیں کون لائے گا؟ کیا استحصال پسند طبقے اپنے اپنے ملکوں میں یہ تبدیلیاں لاسکتے ہیں اور آیا یہ تبدیلیاں دینی حدود کے اندر ہوں گی، یا ان کے لئے دین کا انکار کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان ملکوں کی سیاسی قیادتوں کو دین کی کوئی ایسی عملی تعبیر مل گئی، جو آج کے سماجی و سیاسی تقاضوں کو پورا کرسکے، تو وہاں جو انقلابات ہوں گے، ان میں مذہب کا انکار ضروری جزو نہیں ہوگا۔ اور ان کی قومی زندگی میں لازماً مذہب کی باقیات صالحات رہیں گی۔ ان دنوں جو کچھ عرب دنیا میں ہو رہا ہے وہ دیر یا سویر دوسرے ملکوں میں بھی ہو کر رہے گا۔ اور وہ اس لئے کہ صنعتی اور مشینی زندگی اپنے ساتھ سماجی اور سیاسی تبدیلیاں لازمی طور پر لاتی ہے۔ خدانخواستہ اگر ہم مذہب کا وہی جامد تصور پیش کرتے رہے جو کسی زمانے میں یورپ کے کلیسا نے

پیش آیا تھا، یعنی وہی ہوگا جو یورپ میں ہو چکا ہے، یعنی عوام کی انقلابی قوتیں مذہب سے بیزار ہو کر وہ تبدیلیاں لائیں گی جن کا تقاضا آج کا سماج کر رہا ہے۔ یہ خیال کہ محض اسلام کا نام اور عوام کی اس سے جذباتی عقیدت اس سیلاب کو روک سکے گی، محض خوش فہمی ہے، ہمارے ہمسائے ملک ہندوستان اور برما میں مذہب کا جو حشر ہو رہا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔

صدر ناصر اپنی سیاسی، سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کو اسلام کے ساتھ ہم نوا کرنے کی جو کوششیں کر رہا ہے وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں، ابھی اس کے بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آج برما میں بدھ مت بحیثیت ایک روحانی تحریک کے ختم ہو چکا ہے اور ہندوستان میں ہندو دھرم بس ایک ہندو سرمایہ دارانہ نظام کی شکل میں زندہ ہے ہمیں اس سے سبق لینا چاہیئے۔

میرے نزدیک ولی اللہی فکر اسلام کی ایک ایسی تعبیر ہے جسے اگر آج کے دور کی سیاسی، معاشی اور سماجی ضرورتوں اور فکری تقاضوں کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا جائے اور مولانا سندھیؒ کے الفاظ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کو "مجتہد مطلق" مان کر مولانا محمد قاسم کو اس ضمن میں "مجتہد فی المذہب" کا درجہ دیا جائے اور اس سلسلۂ فکر کو اور آگے بڑھایا جائے تو ایک ایسا نظریہ حیات مرتب ہو سکتا ہے، جو دینی بھی ہوگا، اور اس میں اتنی وسعت بھی ہوگی کہ وہ اس دور کے سماجی و سیاسی و اقتصادی تقاضوں کو پورا کر سکے۔

ع - ف - سواتی (مانسہرہ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا قیام اللہ تعالےٰ مبارک فرمائے

ہندوستان کی کئی صدیوں کی تاریخ علم و ادب میں شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی اور شخص ایسا نظر نہیں آتا کہ جس کے قلم نے جدت دکھائی ہو۔ اور اس سے مسلمانوں کے ادب میں کسی نئی تخلیق کا اضافہ ہوا ہو۔۔۔ اس رسالے میں شاہ ولی اللہ کی تعلیم سے ماخوذ ایسے مضامین کی کثرت ہونی چاہیئے جن سے مسلمان نوجوانوں میں کمیونزم اور الحاد و دہریت کی روک تھام ہو۔ اس وقت یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور یہاں کے درد مند مسلمان اہل علم و قلم کو

س جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کے کام میں خیر و برکت عطا فرمائے اور مسلمان پھر ایک بار حکمت حقہ کے علم بردار اور قائد ہو جائیں۔

(ڈاکٹر) محمد غوث (ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی) مدراس

جناب ایڈیٹر صاحب

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا شائع شدہ ٹریکٹ اور مقاصد و نظام کار اور اس کے ماہنامہ الرحیم کے دونوں شمارے پڑھے۔ ان سے میں نے جو تاثر لیا، اسے قلم بند کرکے بھیج رہا ہوں اس امید کے ساتھ آپ اسے شائع کردیں گے میں حضرت شاہ صاحب کی علمی عظمت کا معترف ہوں اور مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ وہ برصغیر کے عظیم ترین عالم، عارف اور حکیم تھے۔ اسلامی علوم میں بھی ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔ اور تصوف و حکمت میں بھی ان کی گہری نظر تھی اور یہ کہ وہ عالم کے ساتھ ساتھ محقق بھی تھے اور مجتہد بھی اور مجھے اس کے ماننے میں کوئی امر مانع نہیں کہ ان کے افکار و تعلیمات کی اشاعت کی جتنی ضرورت اس دور میں ہے شاید ہی کسی اور دور میں ہو۔

الرحیم کے پہلے شمارے میں آپ نے "کیا شاہ ولی اللہ اکیڈمی یہ کرے گی" کے عنوان سے جو مراسلہ شائع کیا ہے۔ اور اس میں یہ جو سوال پوچھا گیا ہے، وہ واقعی قابل توجہ ہے کہ آخر شاہ صاحب کے بعد ان کی کتابیں لوگوں کے زیر مطالعہ رہیں۔ ان کے ماننے والے ان کی تعلیمات کو فروغ دینے میں کوشاں رہے اور شاہ صاحب کے نام سے ایک مستقل سیاسی فکری تعلیمی علمی تحریک بھی چلی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اور آگے چلکر شاہ صاحب کی دعوت محدود ہو کر رہ گئی اس سے نہ تو ذہنی جمود ٹوٹا، نہ ہمارے ہاں کی تنگ نظری ختم ہوئی۔ اور نہ ہم اس قابل ہوئے کہ یورپ سے آنیوالے فکری سیلاب کا مقابلہ کرسکیں۔ بلکہ آپ ناراض نہ ہوں تو میں عرض کروں کہ شاہ صاحب کے نام لیوا جمود، رجعت پسندی اور اسلاف پرستی کے سب سے بڑے پشتیبان بن گئے اور ان کی تمام تر کوششیں اس کے لئے وقف رہیں کہ گردش ایام کو پیچھے کی طرف لے چلیں۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آج شاہ صاحب کے افکار و تعلیمات کی اشاعت کی ضرورت نہیں لیکن اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ رہتا ہے کہ شاہ صاحب کی فکری دعوت سے ہمارے ہاں کیوں ذہنی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے اس مسئلہ پر تھوڑا سا غور کیا ہے اور اس بارے میں میری جو رائے ہے، وہ بھی لکھتا ہوں۔ شاہ صاحب کی ایک مذہبی تجدیدی دعوت تھی اور ہر مذہبی تجدیدی دعوت کی طرح یہ دو اجزا سے مرکب تھی، ایک جزو اتباعِ سلف اور وجدانی اور جذباتی اپیل کا تھا۔ اور دوسرا عقلیت کا۔ بدقسمتی سے اس دعوت کی جو عملی شکل بنی اس میں تمام زور اول الذکر پر رہا، اور جزو ثانی سے بے اعتنائی برتی گئی۔ اور اس کا وہ نتیجہ نکلا جو آج ہمارے سامنے ہے۔

احمد سعید

سمن آباد، لاہور

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ماہنامہ الرحیم کا تیسرا نمبر موصول ہوا۔

فلسفہ ولی اللہی کے پیاسے مدت سے آس لگائے بیٹھے تھے کہ قدرت کی جانب سے اچانک ان کی تشنگی کو بجھانے کا سامان ایک مستقل ادارے کی طرف سے ہو رہا ہے، یہ خدا کا فضل ہے اور احسان۔

جو بھی کتابیں اور مطبوعات اس فلسفے کے متعلق آپ کی جانب سے شائع ہوں یا دوسرے اداروں کی ہوں یا حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے کتابچے جو شروع سے اب تک چھپے ہیں وہ سب چاہتا ہوں۔ الرحیم نیا ہے ابتدائی خامیاں آگے چل کر درست ہو جائیں گی حق جل مجدہ سے دعا ہے کہ یہ دارہ پھلے اور پھولے اور اس کا نور اکناف عالم کو منور کرے۔

ولی اللہی فلسفہ صرف پاکستانیوں کا حق نہیں ہے اور نہ فقط مسلمانوں کا ورثہ ہے بلکہ یہ تو نوع انسانی کا فلسفہ ہے جو اسے اخلاق کے ساتھ سمجھیں، وہی اس کے مستحق ہیں۔ والسلام

احقر حکیم عبدالغفور سرہندی شہداد پور، ضلع سانگھڑ

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا

[redacted]

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی



لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی - مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اُس کا ایک پرانا نسخہ ، جو اغلاط سے پُر تھا ، ملا - موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی ، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا - اور وضاحت طلب اُمور پر تشریحی حواشی لکھے - کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے -

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ''وجود'' اور اُس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے ، اُس پر بحث کی ہے ، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں - قیمت دو روپے

—— : o : ——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے ، اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے ، اور اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں - اُردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے -

کتاب مجلد ہے - قیمت ۷ء۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدرآباد - پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کر

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طبا
و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن
جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کر
کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

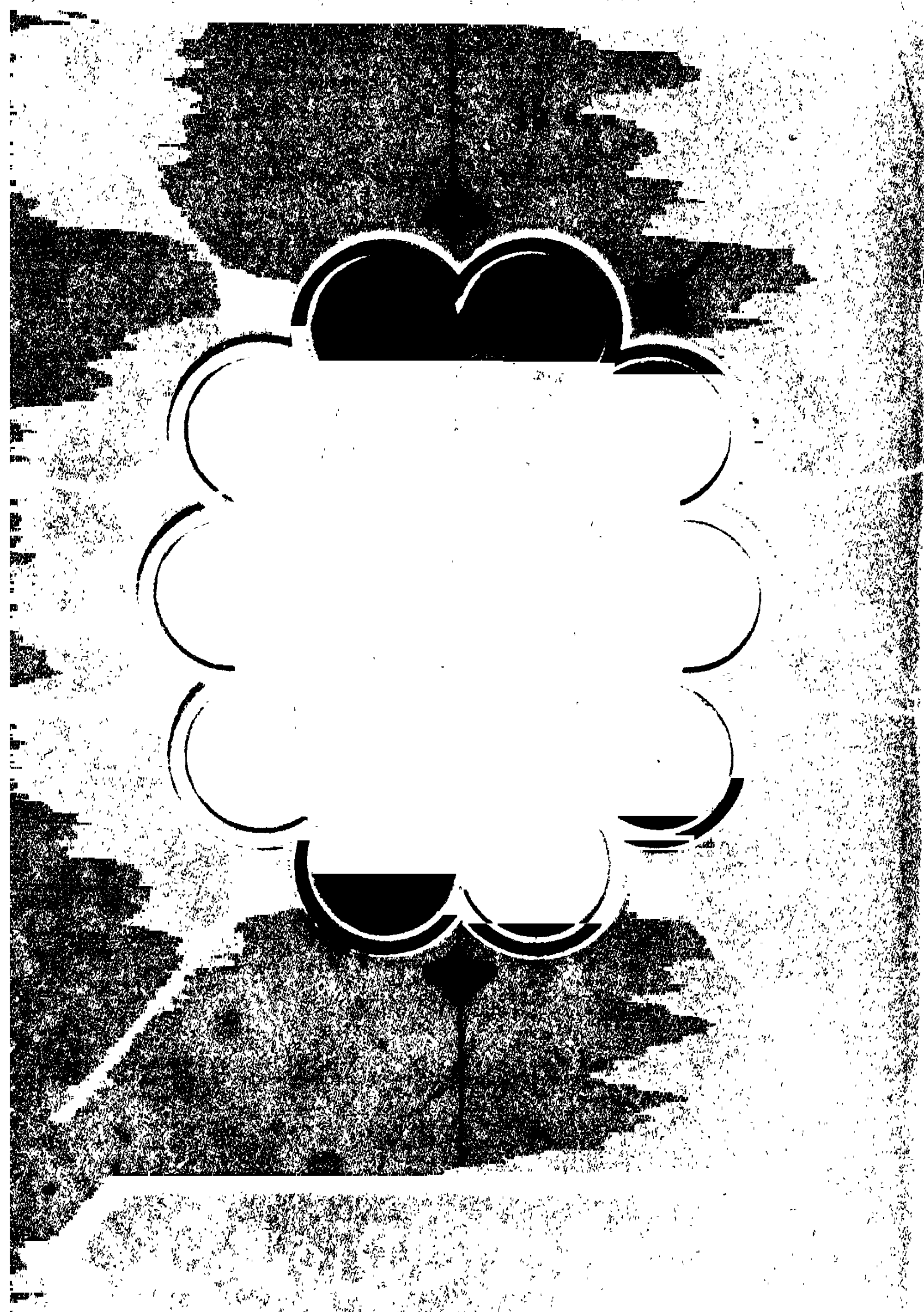
۴۔ تحریکِ ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم
کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمتِ ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے
غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائ





قیمت سالانہ :- آٹھ روپے

فی پرچہ :- پچھتر پیسے

الرحیم
حیدرآباد

جلد (۱) ذیقعدہ ۱۳۸۳ھ مطابق اپریل ۱۹۶۴ء نمبر (۱۱)

فہرست مضامین

شذرات

مارچ کی آخری تاریخوں میں پشاور یونیورسٹی میں مؤتمر علوم اسلامیہ کے اجلاس ہو رہے ہیں۔ جن میں جہاں ایک طرف عربی و دینی مدارس کے علمائے کرام شرکت فرما رہے ہیں، وہاں دوسری طرف جدید یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اصحاب علم بھی شرکت کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال تقریباً انہی دنوں سندھ یونیورسٹی حیدرآباد میں بھی علوم اسلامیہ کی یہ مؤتمر ہوئی تھی، اور دونوں مکاتب خیال کے علماء و فضلاء اس میں شریک ہوئے تھے۔ جدید علوم کی درس گاہوں میں قدیم اسلامی علوم کے متخصصین کے اس طرح کے اجتماع نہ صرف علمی و فکری لحاظ سے ہماری قومی زندگی میں بڑے دور رس اثرات کے حامل ہوں گے، بلکہ اِن سے ہماری معاشرتی زندگی میں اُس خلیج کو پاٹنے میں بھی بڑی مدد ملے گی، جس نے قدیم و جدید مکاتب خیال کو ایک دوسرے سے جُدا کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کے زوال، جمود اور اُن کی پس ماندگی کے بے شک اور بھی اسباب ہیں، لیکن گزشتہ ایک صدی میں اُن کے ہاں قدیم و جدید میں جو بُعد، بلکہ ایک حد تک منافرت پائی جاتی ہے، اِن اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔



عربی و دینی مدارس میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم و تدریس اور جدید سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامیات اور اسلامی علوم و ثقافت کی تعلیم کا انتظام ایک بڑا خوش آئند امر ہے۔ افسوس ہے کہ یہ کام بہت دیر میں شروع ہوا، لیکن خداوند کریم کا شکر ہے کہ آخر حاملین دین متین اور اصحاب علوم جدیدہ ہر دو کو اس ضرورت کا احساس ہوا، اور اب دونوں اس کی طرف متوجہ ہیں۔

حیدرآباد سے تھوڑی سی مسافت پر میرپور خاص ایک شہر ہے، وہاں پہلے ایک عربی و دینی مدرسہ تھا، پھر اُس کے پہلو بہ پہلو ایک ہائی سکول قائم کیا گیا۔ اب اس مدرسے اور ہائی سکول کے بانی جو خدا کے فضل سے ایک مستند اور مسلّم عالم دین ہیں، ہائی سکول کو کالج میں منتقل کرنے میں کس طرح کوشاں اور سرگرداں ہیں، اور اُن کے خلوص اور اُن کی ہمت اور شب و روز محنت کو دیکھ کر مخیر حضرات اس کار خیر میں جیسے مدد کر رہے ہیں، اُسے دیکھ کر یہ اُمید بندھتی ہے کہ ہمارے ہاں وہ دن دور نہیں، جب قدیم و جدید کا یہ بُعد اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے ایک قصہ ماضی ہو جائے گا۔

علمائے کرام جدید علوم کے سکول اور کالج کھولیں اور جدید علوم کے ارباب سند اسلامی علوم پڑھیں اور پڑھائیں، پاکستان کی قومی زندگی کا یہ ایک قابلِ فخر باب ہے، اور اس کا ہر بہی خواہِ قوم و وطن خیر مقدم کرے گا۔



جدید و قدیم علوم کی تعلیم کو ایک دوسرے سے قریب اور دونوں کو یکجا کرنے کے ساتھ ساتھ کم و بیش ہر اسلامی ملک میں اس ضرورت کا بھی احساس ہو رہا ہے کہ اگر اسلام کی تعلیمات اور شریعت کو عام مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا شعار اور اُن کی قومی حکومتوں کا لائحہ عمل بنانا ہے، تو اس کے لئے شریعت اور فقہ اسلامی میں اجتہاد کرنا ہوگا کہ اُس کے ذریعہ روح اور زندگی پیدا ہو، جس کا جاری ہونا اُمت میں شرعاً ضروری ہے۔ اور جو نئے وقتی مسائل کے شرعی حل تلاش کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور جس کے بغیر شریعت کے وقار کو بچایا نہیں جا سکتا۔"



دمشق کے ایک مشہور عالم دین کی یہ رائے ہے۔ اس سلسلے میں وہ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ یہ اجتہاد انفرادی کے بجائے اجتماعی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے لئے علماء و فقہاء کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے چند ایسے ماہرین بھی ہونے چاہئیں جن کے دین پر بھی پورا اعتماد کیا جا سکتا ہو اور جو ضروری عصری علوم مثلاً اقتصادیات، اجتماعیات، قانون اور طب میں ایسی دستگاہ رکھتے ہوں کہ علماء اور فقہاء کو اپنی فنی مہارت کی وجہ سے صائب مشورہ دے سکیں۔ اور اُن کے کام میں پوری مدد کر سکیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں علماء و فقہاء اور جدید علوم کے ماہرین کی متفقہ کوششوں کے بغیر کسی قسم کا اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ علماء و فقہاء کی علمی دسترس نہ عہدِ حاضر کے علوم پر ہے اور نہ اُس کی ضرورتوں اور تقاضوں پر اور جدید علوم کے ماہرین شریعت اور فقہ اسلامی میں درک نہیں رکھتے۔ چنانچہ جب تک ان میں افہام و تفہیم کے ذریعہ آپس میں فکری مؤانست اور یک جہتی پیدا نہیں ہوتی اور وہ باہم دلی احترام کرنا نہیں سیکھتے، ان میں علمی تعاون کی کوئی راہ نہیں نکل سکے گی اور جدید اجتہاد کی اس بیل کے منڈھے چڑھنے کا کوئی امکان نہیں۔



اس ضمن میں اگر نظری بحثوں سے بالکل صرفِ نظر کیا جائے اور جن عملی مسائل اور ٹھوس ضرورتوں سے عوام و خواص کو عموماً دو چار ہونا پڑ رہا ہے، انہی کے شرعی حل تلاش کرنے کی طرف زیادہ تر توجہ ہو تو ہمارے خیال میں تعاونِ عمل زیادہ آسان ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں اس کی مثالیں دینا نہیں چاہتے، لیکن اس بارے میں صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ جب کوئی چیز حقیقت واقعی بن جاتی ہے تو خالص نظری دنیا میں رہنے والا آدمی بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اُس کا نوٹس لے، اور اُس کے متعلق اپنا عملی نقطۂ نظر متعین کرے، لیکن نظریات میں بحث د

مناظرہ کے وسیع مواقع رہتے ہیں اور اس کا سلسلہ دور دور تک چلا جاتا ہے۔

عمل تحدید و تعیین کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور تحدید و تعیین میں اختلافات کا دائرہ سکڑ جاتا ہے، لیکن نظر و فکر کی دنیا لامحدود اور بے پایاں ہے، اس لئے قدرتاً اُس میں اختلافات کی بڑی گنجائش ہے



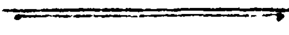
پاکستان کی قومی زندگی اس وقت اپنے ارتقائی دور کے ایک بڑے اہم مرحلے سے گزر رہی ہے۔ ہمارے ہاں صنعتی انقلاب کی طرح پڑ چکی ہے۔ دیہاتی زندگی بڑی سُرعت سے شہری زندگی میں تبدیل ہو رہی ہے، اور ہزاروں اور لاکھوں افراد گاؤں چھوڑ چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں صنعتی شہروں میں بس رہے ہیں۔ ایک قوم کی زندگی میں یہ بڑا نازک زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف آبادیوں کی اُکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ تہذیبی روایات، دینی معتقدات، اخلاقی قدروں اور معاشرتی رسوم و عوائد میں بھی خلفشار برپا ہو جاتا ہے۔ بہرحال نئی عمارتیں تو بنتے بنتے بنتی ہیں، اس صنعتی انقلاب کے شروع میں پرانی عمارتیں ایک ایک کر کے ڈھینے ضرور لگتی ہیں۔

ہمارے معاشرے کی پرانی زندگی کی عمارت اب ٹوٹ رہی ہے، اُس کی نئی تعمیر صرف اسی طرح ہو سکے گی کہ ہمارے علما و فقہا اور جدید علوم کے ماہرین میں سے اہل علم و فکر حضرات ایک دوسرے سے تعاون کریں اور قدیم و جدید کی ترکیب و ائتلاف پر نئی عمارت کی بنیاد رکھیں۔



حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے مکتب خیال سے پورے برصغیر پاک و ہند میں شروع ہی سے جو علمی شغف رہا ہے، وہ ایک جانی بوجھی بات ہے، اور اُسے دُہرانے کی ضرورت نہیں، لیکن اب کچھ عرصے سے مغرب کے علمی مرکزوں اور فضلا میں حضرت شاہ صاحب کے علوم و افکار کی طرف جو توجہ ہو رہی ہے اُس کا البتہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اس سے پہلے اُن دیار میں حضرت شاہ صاحب بہت کم متعارف تھے۔ ہم ان صفحات میں ہالینڈ کے ڈاکٹر بالجن کا ذکر کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ہمیں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایک پروفیسر فری لینڈ ایبوٹ کے تین مضامین کی کاپیاں ملی ہیں جو امریکہ کے مشہور رسالے "دی مسلم ورلڈ" میں چھپے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون شاہ صاحبؒ پر ہے۔ اور باقی دو مضمون سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد پر ہیں۔

پروفیسر موصوف نے حضرت شاہ صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قرون وسطیٰ اور عصر حاضر کی درمیانی شخصیت ہیں، جیسے یورپ میں دانتے تھا۔ "الرحیم" کے آیندہ شمارے میں ان مضامین کا خلاصہ اور اُس پر تبصرہ شائع ہوگا +



شاہ ولی اللہ کا نظریۂ انقلاب[1]

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم

تمدن انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اور اس کی تشکیل کے لئے وہ کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، اُن کا ظہور تمدن کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک الگ تھلگ جزیرے میں اگر مرد اور عورت ہوں، تو وہ خود اپنے طبائع سے تمدن کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

انسانی معاشرے میں اِس طرح جو تمدن معرضِ وجود میں آتا ہے، وہ اُس وقت تک صحت مند اور صالح رہتا ہے، جب تک کہ اُس سے افرادِ معاشرہ کی اکثریت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، لیکن جب اُن میں معاشرتی ناہمواری افراط و تفریط کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور ایک طبقے کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور دوسرا ادنےٰ ضرورتوں تک سے محروم ہو جاتا ہے، تو یہ تمدن برباد کیئے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرے کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑے تو پھر اس میں انقلاب کا آنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک کاسب طبقے کی کمائی پر غیر کاسب طبقے کا قبضہ کر لینا شریعت کے خلاف ہے، اسی طرح خود کاسبوں کے ایک گروہ کا اُن کے دوسرے گروہ کی کمائی کا زیادہ حصّہ ہتھیا لینا بھی ناجائز ہے۔

جب کسی معاشرے میں یہ حالت ایک وبائی شکل اختیار کر لے اور معاشی ناہمواری کی افراط و تفریط اُس کا عام معمول بن جائے، تو اُس میں حتمی طور سے انقلاب آجاتا ہے، چنانچہ اُس معاشرے کا ایک گروہ تو انقلاب کا مبلغ

---

[1] یہ مضمون مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی "امالی" سے مرتب کیا گیا ہے۔ (مدیر)

بنتا ہے اور دوسرے اُس کے ہمدرد ہوجاتے ہیں۔ بے شک اِن ہمدردوں کے اخلاق واطوار کا اثر اس انقلاب کے مظاہر پر پڑتا ہے، لیکن جہاں تک اس انقلاب کی روح کا تعلق ہے۔ اُس کا ترجمان وہی گروہ ہوتا ہے جو انقلاب کا مبلغ و قائد ہے۔

ہر انسان کو اپنا رزق خود پیدا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ کسی وجہ سے معذور ہے، تو وہ بات دوسری ہے۔ ایک انسان کا خود اپنی روزی پیدا کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ اب ایک گھرانا ہے جس میں کمانے والے کم اور کھانے والے زیادہ ہیں ظاہر ہے یہ گھرانا جلد یا بدیر تباہ ہوگا۔ اسی طرح جس معاشرے میں کاسب کم ہوں، اور کھانے والے زیادہ، وہ معاشرہ روگی ہے، اور اُس کا ختم ہونا لابدی ہے، لیکن اگر ایک معاشرے میں کاسب زیادہ ہیں لیکن اُن کی محنت سے جو دولت پیدا ہوتی ہے اُسے منتظمین کا ایک مخصوص طبقہ دوسروں سے زیادہ لے لیتا ہے۔ یعنی حقِ کسب سے حقِ انتظام بہت زیادہ ہے، تو اس صورت میں بھی یہ معاشرہ غیر صالح ہے۔ اور اس کا جان بر ہونا مشکل ہے۔

غرض انسانیت کے فساد کی سب سے بڑی وجہ یہی معاشی ناہمواری کی افراط و تفریط ہے، اس سے جہاں ایک طرف فقر و فاقہ اور عیش و عشرت عام ہوتی ہے وہاں دوسری طرف اخلاق بھی بگڑتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی حالات کے اثرات قبول کرتے ہیں، اسی لئے ہم عام مرفہ الحالی اور لوگوں کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کے معاملے میں بہت حد تک اشتراکیوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انسانوں میں جو اخلاق (اُن کے عام معنوں میں) اور تفکر کی قوتیں ہیں، اُن کی تربیت کیسے ہو، بے شک ہم چاہتے ہیں کہ انسانوں کی معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے، لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اُس عنصر کو جو اخلاق اور تفکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

بات یہ ہے کہ اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی نظام پائدار نہیں ہوسکتا چنانچہ جہاں ہم استحصال پسند سرمایہ داروں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُنہوں نے معاشرے کے بہت بڑے حصے کو معاشی لحاظ سے محتاج رکھ کر انسانیت کی سطح سے گرا دیا ہے وہاں ہمارا دوسرا الزام اُن پر یہ ہے کہ اُنہوں نے معاشرے کے اس بڑے حصے میں سے اُس طبقے کو جو اخلاق اور فکر کو ترقی دے سکتا تھا محتاج بنا کر اس قابل نہ رہنے دیا۔ چنانچہ اس لحاظ سے استحصال پسند سرمایہ داروں کا قصور دوہرا ہے۔ بدقسمتی سے جب کسی وجہ سے معاشرے کا وہ طبقہ جو اخلاق اور فکر کو ترقی دینے کی صلاحیتیں رکھتا ہے

اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لے سکتا، تو اس کی یہ صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صرف ہوتی ہیں، جن کی پہلی شکل تملق اور چاپلوسی ہے، اس کے ذریعہ وہ طبقہ بڑوں کی خوشامد کرتا اور اس طرح اپنی معاشی احتیاجات پوری کرتا ہے۔ یہی مرض آگے چل کر غیر اللہ کی عبادت کا موجب بنتا ہے۔ اس منزل میں نفس ناطقہ کے ذاتی خواص سارے تباہ ہو جاتے ہیں اور انسانیت فاسد ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی مسخ شدہ انسانیت کو برباد کرنے کے قدرتی اسباب پیدا ہوتے ہیں، اسے ہم انقلاب کا نام دیتے ہیں۔

قرآن مجید میں انبیاء کے جو قصے ہیں، وہ اسی قسم کے انقلاب کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عالمگیر انقلاب کے داعی تھے جس کا ایک مثالی نمونہ آپؐ نے اپنی زندگی میں سرزمین حجاز میں قائم کر کے دکھایا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ اس انقلاب کے دائرے کو اور وسیع کرتے ہیں۔ اور اُن کے عہد میں وہ سلطنتیں جو فسادِ انسانیت کا باعث تھیں، ختم ہو جاتی ہیں، اور صحت مند انسانیت کا کارواں آگے بڑھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتابوں میں آپ کو اسلام کے اس تاریخی کردار کے بارے میں اس طرح کے افکار ملیں گے، جنہیں وہ اپنی کتابوں میں بار بار بیان کرتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک انبیاء کا کام فسادِ انسانیت کو ختم کر کے صالح انسانیت کے لئے سازگار حالات پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ ائمۂ انقلاب ہوتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سب سے بلند ہے اور وہ اس لئے کہ آپؐ کی دعوت سب سے زیادہ عالمگیر ہے۔

اب ایک طرف آپ کو حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں یہ افکار ملتے ہیں اور دوسری طرف وہ اُن مفاسد کا ذکر کرتے ہیں، جو اُن کے زمانے میں عام ہو گئے تھے اور جنہوں نے انسانیت عامّہ کو خراب کر دیا تھا، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شاہ صاحب کے نزدیک ان مفاسد کا علاج وہی ہے جو اس سے پہلے انبیائے کرام کے ذریعہ ہو چکا ہے اور جس کا ایک اعلیٰ نمونہ اسلام کا وہ تاریخی کردار ہے جو عہدِ نبوی اور دورِ خلافتِ راشدہ میں وجود میں آیا۔ اسے ہم شاہ ولی اللہ کا نظریۂ انقلاب کہتے ہیں۔

اب ہم شاہ صاحب کی کتابوں سے اُن کے اِن افکار کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں:۔

حجۃ اللہ البالغہ دوم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی تو اُن کی معاش وروزی بھی زمین پر مقرر کی اور زمین کی اشیاء سے انتفاع اُن کے لئے مباح اور جائز گردانا۔ اور چونکہ حرص و آز کی وجہ سے اُن کے نزاعات وجھگڑے ہونے لگے، تو حکم الٰہی یہ قرار پایا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کی مخصوص ومختص چیز میں کسی قسم کی مزاحمت و مداخلت نہ کرے ....

"نیز چونکہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور بلا باہمی تعاون کے انسان کی معاشی ومعاشرتی تعمیر کی استقامت ناممکن ہے، اس لئے قضائے الٰہی سے انسانوں کے لئے باہمی تعاون واجب اور لازم کر دیا۔ نیز چونکہ نوع انسانی کا کوئی فرد بلا کسی سخت مجبوری کے تمدنی وعمرانی اور تمدنیات وعمرانیات کے دخل واثر سے علیحدہ بے تعلق اور بے اثر نہیں رہ سکتا اور اس کا اصل اور حقیقی سبب اور وجہ یہی ہے کہ ہر انسان کے لئے اپنے مباح مال کا تحفظ ناگزیر ہے۔ نیز اس مال مباح کا جو ہر انسان کے لئے مخصوص اور مختص ہو چکا ہے جس کے ذریعہ ہر انسان اپنی امداد واستعانت کرتا ہے، نمو اور اضافہ بھی ضروری ہے ...."

اب اس مال میں نمو اور اضافہ شاہ صاحب کے الفاظ میں "بلا باہمی تعاون معاشی کے متعذر اور محال ہے۔ اور اس تعاون کے کچھ ایسے طریقے ہیں کہ جن کے بغیر شہری زندگی کی استقامت متغیر اور دشوار ہو جاتی ہے ......" اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ "میں کہتا ہوں، اس کی حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا مال اور ملکیت ہے ...... اور کسی انسان کی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز سے انتفاع کا حق سب سے زیادہ اس کو ہے، دوسرے کو نہیں ..."

پھر فرماتے ہیں:- "میں کہتا ہوں۔ اصل اس بارے میں یہ ہے کہ جس مباح چیز میں بہت سے لوگوں کے حقوق علی الترتیب لازم ہوں، تو ایسی صورت میں واجب یہی ہے کہ ترتیب کی اسی قدر رعایت کی جائے کہ جس سے سب کو فائدہ پہنچے۔ اور یہ فائدہ ایسا ہو جو کم سے کم سمجھا جائے ......"

اس ضمن میں ایک حدیث بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے:-

"آنحضرت صلعم نے ابیض بن حمال المآربی کو نمک کا ایک چشمہ دار قطعہ عطا کر دیا تھا، کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ!

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ کے ان اقتباسات کا اُردو ترجمہ مولانا محمد اسمٰعیل گودھری مرحوم کے ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

آپ نے اس کو نہ ٹوٹنے والا، نہ ختم ہونے والا مادہ دے دیا۔ راوی کہتا ہے یہ سُن کر آں حضرت صلعم نے وہ قطعہ اُن سے واپس لے لیا ـــــ میں کہتا ہوں، اس امر میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ جن معادن اور کانوں میں زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت نہ ہو، ایسی معادن اور کانیں کسی ایک مسلمان کو دے دینا عام مسلمانوں کے حق میں مضرت رساں ہے۔ اور اُن کے حق میں ایک قسم کی ضیق اور تنگی ہے۔ پس آنحضرت صلعم نے اس قطعۂ نمک کو ابیض بن حمال مآربی سے واپس لے لیا۔"

اس تمہید کے بعد حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:-

کسی شہر کے اندر مثلاً دس ہزار آدمی اجتماعی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس وقت اس شہر کی مدنی شہری سیاست اور شہر کے باشندوں کے کسب اور پیشوں سے بحث ناگزیر ہوگی۔ وہ پیشے جن سے شہر کی معیشت متوازن نہ ہے، شاہ صاحب کے نزدیک فساد اور خرابی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس صورت میں عطیۂ حکمتِ الٰہی کے مطابق معروف و مستحسن طریقوں پر معروف و مستحسن کسب اور پیشے اُن کے لئے لازم کر دیئے جائیں اور رذیل و خسیس پیشوں سے اُن کو روک دیا جائے تو شہری باشندوں کی حالت یقیناً درست ہو جائے گی۔

معاش کا یہ فساد شاہ صاحب کے نزدیک "شہر و ملک کے لئے ایسا متعدی ضرر رساں مرض اور روگ ہے کہ شہر اور ملک کے تمام گوشوں میں پھیل جائے گا اور اس طرح عام ہو جائے گا کہ تمام باشندوں کو اپنی زد میں لے لیگا۔ اور یہ مرض اور اس کا زہر شہر و ملک میں اس طرح جاری و ساری اور پیوست ہو جائے گا، جس طرح کسی کو کتا کاٹ لیتا ہے۔ اور اُس کے سارے جسم میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اور یہی وہ مہلک و خطرناک مرض تھا، جو عجمی ممالک میں بلائے بے درماں کی طرح تمام پر مسلط ہو چکا تھا۔ چنانچہ خدائے قدوس نے اپنے پیغمبر صلعم کو القاء فرمایا کہ اِس مرض مہلک کا علاج کریں اور مرض کے اصل مادہ کا قلع و قمع کردیں......" (صفحہ ٢٨٢ - ٢٩٠)

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشرے کے اُن مفاسد کا ازالہ بھی تھا، جو معیشت کے خراب طریقوں کی وجہ سے پیدا ہو چکے تھے۔

خود شاہ صاحب کے زمانے میں معاشرے میں اسی قسم کے جو مفاسد پیدا ہو چکے تھے، آپ نے اُن کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"اس زمانے میں شہروں کی بربادی کے دو بڑے اسباب ہیں، ایک یہ کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ چونکہ وہ فوجی یا عہدے دار ہیں، اس لئے بیت المال پر اُن کا حق ہے۔ اور اس طرح اُن کا کسب معاش کا ذریعہ صرف بیت المال بن کر رہ گیا ہے۔ یا زہاد اور شعراء وغیرہ ہیں جن کو بادشاہوں کے صلہ کی عادت پڑ گئی ہے اور اپنی معاش کا ذریعہ صرف بیت المال ہی کو سمجھ بیٹھے ہیں، اور بغیر کسی خدمت کے بیت المال پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کے ہاں جاتے ہیں اور اُن میں کبیدہ خاطری پیدا کرتے ہیں اور شہری آبادی پر بار گراں بن کر رہ جاتے ہیں۔

"دوسرا سبب یہ ہے کہ کسانوں، تاجروں، پیشہ وروں اور دست کاروں پر گراں بار ٹیکس لگائے جا رہے ہیں، اور اُن پر حد سے زیادہ سختی کی جاتی ہے جس سے اطاعت گزار شہر پر مصیبت آتی ہے، اور برباد ہو جاتے ہیں، اور وہ لوگ جو جری ہوتے ہیں، وہ حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شہروں کی بہبود کا طریقہ یہی ہے کہ رعایا پر کم سے کم ٹیکس لگائے جائیں اور ضرورت کے مطابق محافظ و نگران مقرر کیے جائیں۔ اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ واللہ اعلم" (ص۱۲۳ حصہ اول)

شاہ صاحب کا یہ فرمانا ولیتنبہ اھل الزمان ھذہ النکتۃ (اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہونا چاہیئے) اپنے دور کے ارباب حکم کے لئے ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی دعوت اُمور دین کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی جملہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح پر بھی مشتمل تھی۔

رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بدولت قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے ختم ہونے کے معنی کیا تھے؟ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ حصہ اوّل میں اسے یوں بیان کیا ہے:۔

"آنحضرت صلعم کے عہد سعید میں وہ اقالیم صالحہ اور ممالک متمدنہ کہ جن میں معتدل مزاج کی تولید و پیداوار ہوا کرتی تھی، وہ دنیا کے دو بڑے زبردست بادشاہوں کے ماتحت تھے، ایک کسریٰ کہ عراق، یمن، خراسان، اور اُن کے متصل کے تمام ممالک پر اس کا تسلط و اقتدار قائم تھا۔ اور ماوراء النہر اور ہندوستان کے تمام بادشاہ، راجہ اُس کے محکوم و باجگزار تھے اور ہر سال اُنہیں کسریٰ کو ایک مقررہ خراج ادا کرنا پڑتا تھا۔

"دوسرا قیصر تھا۔ شام، روم اور اُس کے نواح کے تمام ممالک پر اس کا تسلط و اقتدار قائم تھا اور مصر، مغرب اور افریقہ وغیرہ کے تمام سلاطین اس کے زیر فرمان اور باج گزار تھے۔ ان دو زبردست شہنشاہوں کی دولت و طاقت کو توڑ دینا اور اُن کے ملک پر تسلط و اقتدار قائم کر لینا ایسا تھا گویا تمام روئے زمین پر تسلط و اقتدار قائم کر لیا گیا۔ ان سلاطین

کی غیر معتدل مرفہ الحالی اور مفرطانہ عیش پرستی کے جراثیم اور مہلک عادات و اطوار کی گندگیاں ان تمام ممالک میں سرایت کر چکی تھیں، جو اُن کے تسلّط و اقتدار کے زیر فرمان تھے۔ اور تمام باشندے اُن کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔ اس لئے آپ کی عادات و اطوار اور رسوم و رواجات کو تبدیل کر دینا اور اُن کو ان خطرناک مہلک جراثیم سے پاک صاف کر دینا گویا دنیا کے تمام ممالک کی اصلاح و درستگی تھی، اگرچہ بعد میں جا کر ان اُمور نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی......

"حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کیا کہ ملت و دین کی کجی کو دور کیا جائے اور ایک ایسی اُمت اور قوم تیار کی جائے، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری قوت سے انجام دے اور لوگوں کی فاسد رسوم کو یکسر تبدیل کر دے۔ تو یہ امر اس بات پر موقوف تھا کہ ان ہر دو بڑی سلطنتوں کو دنیا سے نیست و نابود کر دیا جاتا۔ اور اس مقصد کو سہولت و آسانی سے حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان ہر دو جابر سلطنتوں سے تعرض کیا جاتا۔ کیونکہ انہی دو سلطنتوں کے حالات تمام متمدن اور صالح ممالک میں سرایت کئے ہوئے تھے، یا سرایت کرتے چلے جاتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان ہر دو سلطنتوں کے زوال اور قلع قمع کا فیصلہ کیا اور خود آنحضرت صلعم نے اس کی خبر دی کہ هَلَكَ كسرىٰ ولا كسرىٰ بعده وهلك قيصر ولا قيصر بعده (کسریٰ ہلاک ہوا اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا، اور قیصر ہلاک ہو گیا، اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا)۔ اور حق اس طور پر نازل ہوا کہ روئے زمین سے باطل کی جڑیں اس طریقہ سے اُکھاڑ دی گئیں۔ آنحضرت صلعم اور آپؐ کے صحابہ کے ذریعہ عرب سے باطل کا قلع قمع کر دیا گیا۔ اور پھر عرب کے ذریعہ ان ہر دو جابر سلطنتوں کا قلع قمع کر دیا گیا، اور پھر ان کے ذریعہ تمام عالم کی باطل طاقتیں توڑ دی گئیں اور دنیا سے باطل، ناروا اُمور کا خاتمہ کر دیا گیا اور دنیا کو پاک و صاف کر دیا گیا۔ وللہ الحجۃ البالغہ......"

ایک اور جگہ شاہ صاحب سلاطین عجم و روم کی بد اعمالیوں کا مقابلہ اپنے دور کے بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں سے یوں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"معلوم ہونا چاہئے کہ سلاطین عجم و روم قرن ہا قرن سے سلطنتوں کے وارث چلے آ رہے تھے۔ اس لئے یہ لوگ سرتاپا دنیوی لذتوں اور عیش کوشیوں کے عادی ہو چکے تھے۔ آخرت کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔ شیطان اُن پر پوری طرح غالب ہو چکا تھا۔ اور انہی اُمور کو انہوں نے مقصد حیات سمجھ لیا تھا...... شدہ شدہ یہ حالت ہو گئی کہ وہ امیر، رئیس یا سردار جس کی کمر کی پیٹی اور تاج کی قیمت ایک لاکھ درہم سے کم ہوتی، اس پر طعن و تشنیع کیا کرتے، اسی طرح وہ شخص جس کے پاس عالی شان محل، شاندار قصر و ایوان، حوض، حمام، باغات، خوبصورت قیمتی چوپائے، گھوڑے، حسین غلام و خدام اور لونڈیاں

نہ ہوتیں...... اس پر طعن و تشنیع کیا کرتے۔ اس قسم کے اُمور کا ذکر بہت طویل ہے۔ اور ان کی داستانوں کے دہرانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اپنے ملک کے بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں کا حال ہی دیکھ لو۔

"غرض اس قسم کے مہلک اور خطرناک اُمور ان لوگوں کی معاشرت کے اُصول اور جزو زندگی بن گئے تھے اور ایسی خطرناک شکل اختیار کرلی تھی کہ اُن کے دلوں کے ٹکڑے کر دیئے جاتے تب بھی اُن کے دلوں سے ان کا نکلنا دشوار تھا۔ شہر و ملک کے تمام اطراف و جوانب میں یہ لاعلاج امراض اس طرح پھیل گئے تھے کہ لوگ ایک عام مصیبت میں گرفتار ہوگئے تھے...... تمام کے دامن اس سے اُلجھ گئے تھے اور تمام کو عاجز و مغلوب کر کے رکھ دیا تھا......"

"(آخر میں) جب دنیا میں یہ عظیم ترین مصیبت عام ہوگئی اور یہ مہلک و خطرناک مرض نہایت سخت ہوگیا۔ روم و عجم کے تمدن غیر صالحہ نے دنیا کی کمر توڑ دی تو اُن پر اللہ تعالےٰ اور اُس کے ملائکہ مقربین کی ناراضگی ظاہر ہوئی۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اسی میں تھی کہ اس مہلک مرض کا علاج کیا جائے...... اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ پیغمبر صلعم کی سلطنت قائم کر کے عجمیوں کی سلطنت ختم کردی جائے اور یہ شکل اسی طرح وقوع پذیر ہوئی کہ هلك كسرىٰ ولا كسرىٰ بعدهٗ وهلك قيصر ولا قيصر بعده۔"

شاہ صاحب نے "البدور البازغہ" میں معاشی فراغت (رفاہ) میں ایک حد اعتدال قائم کرنے کی تلقین کی ہے۔ فرماتے ہیں: "اس کے بارے میں دو متعارض قیاس ہیں، ایک یہ کہ معاشی فراغت اچھی چیز ہے۔ طبیعت اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سے مزاج، دماغ اور دل صحیح رہتا ہے، اخلاق اور علوم اس کی وجہ سے استقامت اختیار کرتے ہیں اور یہ کہ تمام کُند ذہنی اور بد خلقی، بُرے کھانے اور دوسری بُری تدابیر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نیز ذہانت، نیک خلقی اور لطف و مروت صحت مند تدبیروں کا حاصل ہے۔ اس ضمن میں دوسرا قیاس یہ ہے کہ معاشی فراغت بُری ہے کیونکہ اس کی وجہ سے جھگڑے ہوتے ہیں اور انسان دوڑ دھوپ میں پڑ کر آخرت سے مُنہ موڑ لیتا ہے[1]

شاہ صاحب ان دونوں پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ معاشی فراغت یعنی رفاہیت میں حدِ اعتدال ہی اچھی چیز ہے۔ جس سے کہ انسان جملہ خوبیوں کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ خرابیوں سے بچا رہے۔ رفاہیت میں افراط و تفریط دراصل معاشی ناہمواری سے پیدا ہوتی ہے اور یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

---

[1] البدور البازغہ صفحہ ۵۵-۵۶

آج کل کے سیاسی نظاموں میں اہل علم صرف ایک امیر کی اطاعت کو مرکزیت کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ اُنکے نزدیک اس سے خرابیاں پیدا ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔ شاہ صاحب اس کا علاج یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک "بورڈ" ہو جس کے ارکان کے ہاتھ میں الگ الگ اختیارات ہوں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں میں نے کسی مذہبی عالم کے ہاں اس طرح کا فکر نہیں پایا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک کامل ریاست میں جس میں بہت سے افراد ہوتے ہیں، نظام قائم رکھنے کے لئے ایک ایسا آدمی ہونا چاہیئے جو اکیلا سب اُمور کی کفالت کرے، اور وہ "الامام الحق" ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے " وقلما یوجد ذٰلک " اور ایسا آدمی کم ہی ملتا ہے چنانچہ اکثر دو تین امور ایک آدمی کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ اور باقی اُمور دوسرے کے پاس (البدور البازغہ ص۔)۔

شخصی حکومت کے بجائے عقلائے قوم کی حکومت کی یہ تجویز پارلیمنٹری نظام کا نقطہ آغاز ہو سکتی تھی، کاش اُس وقت اس کی طرف توجہ کی جاتی۔

"اقترابات" جن سے مراد قربِ الٰہی کے حصول کے ذرائع اور "ارتفاقات" جو عبارت ہیں معاشی، سیاسی و اجتماعی تدابیر سے، شاہ صاحب کے نزدیک اسلام ان دونوں کے لئے صراطِ مستقیم پیش کرتا ہے۔ اُس نے قیصریت و کسرویت کو ختم کر کے "ارتفاقات" میں راہِ وسط پیدا کی، اور ہر قسم کے شرک کی تردید کر کے "اقترابات" کا صحیح مقام معین کیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت آفریں طبیعت کا یہ خاص کمال ہے کہ اُنہوں نے اِس دَور میں اسلام کی اس ہمہ گیر روح کو بے نقاب کیا۔ ایک تو اُنہوں نے روحانی زندگی و مادّی زندگی (اقترابات اور ارتفاقات) کے ایک وحدت ہونے کا اثبات کیا، اور بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشی ناہمواریوں کا خاتمہ کرنا بھی تھا۔ دوسرے اُنہوں نے تمام مذاہب کے مشترک مبادی معین کیئے اور اس طرح مسلمانوں کے سامنے از سرِ نو وہ تمام ذہنی وسعتیں بے نقاب کیں، جو صدیوں سے اُن کی نظروں سے اوجھل تھیں۔

یہ اساسی نظریہ ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی اُس دعوت کا جسے میں اُن کی "دعوتِ انقلاب" کا نام دیتا ہوں۔

حرمین شریفین کی علمی شخصیتیں

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی [1]

مسجد الحرام کا تعلیمی نظام | مسجد الحرام اور مسجد نبوی اسلام کے ابتدائی دور ہی سے دین کی اشاعت کے مراکز اور منبع رہے ہیں اُن کی یہ علمی مرکزیت آج تک کسی نہ کسی صورت میں صدیوں سے برابر چلی آرہی ہے۔ میں نے مکہ مکرمہ میں اپنے قیام کے دوران مسجد الحرام کے مدرسین اور تعلیمی نظام کا بھی مطالعہ کیا، اس سلسلہ میں مجھے جو معلومات فراہم ہوئیں وہ قارئین کی نذر ہیں۔

جزیرۂ عرب میں تیل اور دوسرے معدنی ذخائر نکلنے کی وجہ سے جو مرفہ الحالی آئی ہے اس سے پہلے حرم میں تعلیم و تدریس کے لئے کوئی خاص منہج یا نصاب تعلیم نہ تھا، نہ حکومت کی طرف سے مدرسوں کو کوئی باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی، اور نہ طلبہ سے کوئی فیس ہی لی جاتی تھی۔ تعلیم حسبۃً للہ دی جاتی تھی۔ حجاز میں سعودی حکومت کے ابتدائی دور یا اس سے پہلی حکومتوں کے دور کے معظم علماء کی سوانح حیات کو دیکھا جائے تو انہوں نے دار آخرت کی طرف رحلت کے وقت ذکر خیر کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے۔ "والذکر للانسان عمر ثانٍ" یعنی ذکر خیر انسان کے لئے ایک دوسری زندگی ہے۔ مدرسہ صولتیہ مدرسہ فخریہ، مدرسۃ الفلاح، المدرسۃ الراقیہ وغیرہا سب حرم کی تعلیم کی بدولت وجود میں آئے، ان مدارس کے قائم کرنے والے حرم کی تعلیم سے مستفید ہو کر نکلے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حکومت کی طرف سے اس سلسلے میں بالکل بے توجہی ہوتی تھی، حکومت اپنی بساط کے مطابق علماء اور مدرسین حرم کی کچھ نہ کچھ اعانت بھی ضرور کرتی تھی، لیکن اکثر فاضل مدرسین ثواب کی خاطر ان چیزوں سے مستغنی رہتے تھے۔

حرم کے جملہ مدرسین، ائمہ، مؤذنین اور مطوفین کی نگرانی کے لئے حکومت کی طرف سے ایک مفتش ہوتا ہے، تقریباً چالیس سال قبل اس جلیل القدر عہدہ پر ایک سندھی عالم فائز تھے، جن کا نام شیخ محمد کامل سندھی تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے حالات پر چند سطور تحریر کی جائیں۔

شیخ محمد کامل سندھی کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہی ۱۲۸۵ھ میں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن اعلام سندھ کی اولاد

[1] مولانا کے سفر حجاز کی یہ تیسری قسط ہے۔

سے تھے جنہوں نے ایک دو صدی پہلے حجاز کی طرف ہجرت کی تھی۔ محمد کامل سندھی علماء کے نقیب اور حرم کے مدرسین ائمہ، مطوفین اور خدام حرم کے مفتش تھے، انہوں نے وقت کے متبحر علماء جیسے شیخ محمد صالح کمال، شیخ محمد سعید بابصیل اور شیخ عبدالرحمٰن دہان سے تعلیم پائی۔ ان کے ایک زائر نے شیخ کا حال بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔ یہ شیخ طویل قامت، معتدل جسم اور گھنی داڑھی والے تھے۔ وہ اپنے فرائض کی بجاآوری میں نہایت مستعد رہتے تھے، وہ حرم کے مدرسین کی دیکھ بھال کرتے، اسی طرح ائمہ اور مؤذنین میں سے جو غیر حاضر ہوتا اس پر نگاہ رکھتے اور طواف کی جگہ پر کھڑے ہو کر مطوفوں اور معلموں کی دعائیں سنتے اور ان کی نحوی اغلاط کو درست کرتے تھے، اس معاملہ میں وہ اتنے سخت تھے کہ کسی مطوف کو طواف کرانے کی اجازت ہی تب دیتے تھے، جب وہ اس سے صحیح ادعیہ سن لیتے۔ وہ خود بھی اچھے مدرس تھے۔ حرم میں فقہ حنبلی اور نحو کی کتابوں کا درس دیتے تھے، جس نے اس دور کو پایا اور حرم کے درس کو بھرا ہوا دیکھا ہے، اس نے شیخ محمد کامل سندھی کو اون کا جبہ پہنے ہوئے اور سر پر پگڑی یا عمامہ باندھے ہوئے درس کے وسط میں ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ ہمیشہ اسی ایک ہیئت میں رہتے تھے۔ شیخ محمد کامل سندھی نے ۱۳۵۳ھ میں وفات پائی اور اپنے پیچھے تین لڑکے چھوڑے۔ ا۔ شیخ عبدالسلام مراقب عام ادارہ حرم۔ ۲۔ شیخ عبداللہ موظف مجلس وزارت، ۳۔ شیخ سعید موظف وزارت داخلیہ[1]

اس وقت حرم میں تعلیم و تدریس کی پہلے سے زیادہ نگرانی ہو جاتی ہے اور خاص طور سے سلفیہ مسلک رکھنے والے علماء کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی حرم کے مدرسین میں سے جو اعلم حجاز کہلاتے ہیں اور جن کا علمی معیار بلند اور تحقیق و تدقیق عالمانہ ہے وہ سب پرانی تعلیم کے فیض یافتہ اور حنفی، مالکی یا شافعی فقہ کے پابند ہیں۔ جیسے سید امین کتبی حنفی، سید حسن مشاط شافعی اور سید علوی مالکی ہیں، ان کے علاوہ حرم کے جو دوسرے مدرس ہیں ان میں شیخ حمزہ عبدالرزاق کا بڑا بلند علمی مقام ہے، وہ اکثر قرآنی حقائق پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں، دو تین مرتبہ مجھے ان کے درس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، سلفی مسلک رکھتے ہیں اور ان کا بڑا اچھا مطالعہ ہے، میرے استاذ امام عبیداللہ سندھی کے معتقد ہیں۔

اپنے پاکستانی اور ہندوستانی علماء میں سے مولانا خیر محمد صاحب ساکن ٹھل حمزہ ریاست بہاولپور، مولانا عبدالحق صاحب بہاولپوری اور مولانا عبداللہ صاحب لکھنوی بھی حرم میں حسبۃً للہ تعلیمی خدمت ادا کر رہے ہیں۔

مولانا خیر محمد صاحب کافی مدت سے جوار حرم میں مقیم ہیں۔ ایک روز ان کے درس قرآن میں بھی حاضر ہوا عبادت

---

[1] دروس من ماضی التعلیم وحاضرہ للشیخ عمر عبدالجبار ص ۲۲۱

طاعت اور ریاضت نے ان کو نڈھال کر دیا ہے، کچھ معتقدوں نے ان کو سہارا دے کر بٹھایا، لیکن جب آپ کا درس قرآن شروع ہوا تو وہ کمزوری جاتی رہی، ان کے ایک ایک لفظ سے ایمانی قوت، تقویٰ اور سادگی ٹپک رہی تھی۔ تیس سال پہلے میں نے مولانا خیر محمد صاحب کو ان کے گاؤں ٹل حمزہ میں دیکھا تھا، وہاں مولانا کی بدولت ایک بڑا مدرسہ قائم تھا جہاں کئی منتہی شاگرد تعلیم پا رہے تھے اور مولانا کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ شاگردوں کے لئے گھروں سے کھانا خود لے آتے تھے، آپ درس سے فراغت کے بعد اپنی بھینسیں اور گائیں خود چرانے جاتے تھے۔

مولانا عبدالحق صاحب بہاولپوری کا حلقۂ درس کافی بڑا رہتا ہے، حدیث کا درس دیتے ہیں اور نہایت ہی سادہ مزاج اور پرہیزگار عالم ہیں۔ سلفیہ مسلک رکھتے ہیں لیکن تعصب نام کو بھی نہیں۔ مولانا پڑھانے سے زیادہ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ علم حدیث میں کئی کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔

مولانا عبداللہ صاحب لکھنوی اچھے محدث اور حسن اخلاق کا مجسمہ ہیں۔ ان سے کئی مرتبہ علمی ملاقاتیں ہوئیں حرم میں بھی اور دارالحدیث خیریہ میں بھی۔ ان کے درس کا بھی بڑا حلقہ رہتا ہے۔

پاکستانی علماء میں سے ایک صاحب مولانا امان اللہ پشاوری ہیں خوب طاقتور اور قدآور، ان کی اپنی زبانی معلوم ہوا کہ عرصہ پندرہ سال سے جوار حرم میں مقیم ہیں۔ یہ بزرگ اردو میں حرم کے اندر وعظ و تبلیغ کرتے رہتے ہیں، بڑی اونچی آواز میں بولتے ہیں۔ مغرب سے لے کر عشاء کی اذان تک اُن کی تقاریر کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

عرب علماء میں سے ایک نوجوان عالم شیخ علی بن زید رکن عراقی کے بالمقابل حدیث کا درس دیتے ہیں، اور زیادہ تر اپنے درس میں ردِ بدعات پر زور دیتے رہتے ہیں، ان سے بھی ملاقات ہوئی اور علمی باتیں ہوئیں۔

ایک روز ایک انڈونیشی عالم شیخ عبدالقادر کے درس میں حاضر ہوا، ان کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا۔ شیخ عبدالقادر انڈونیشی زبان میں پڑھا رہے تھے۔ ان کو بڑا نحوی عالم مانا جاتا ہے، ان کے مستفیدین سب انڈونیشی شاگرد معلوم ہوتے تھے، ایک خاص چیز ان کے درس میں یہ تھی کہ درس سے فراغت کے بعد سب شاگرد شیخ سے مصافحہ کر کے جاتے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ روزانہ ان کا یہی دستور ہے۔ اور یہ شافعی المذہب ہیں

جدہ میں شیخ محمد نصیف سے ملاقات

مکہ مکرمہ میں میں مناسک حج سے فارغ ہو چکا تھا اور وہاں کے علماء، صلحاء اور اکابر دین کی زیارتیں بھی ہو چکی تھیں، اب صرف مدینہ منورہ کی حاضری رہ گئی تھی، مجھے چونکہ

مشرق وسطیٰ کی سیاحت اور بیت المقدس کی زیارت کے لئے جانا تھا اس لئے ایک بار اپنے محترم رفیق پروفیسر ظہور احمد صاحب کی معیت میں شرق اردن کے سفارت خانے واقع جدہ میں عمان کا ویزا حاصل کرنے کے لئے جانا ہوا۔ وہاں ویزا حاصل کرنے میں یہ دقت پیش آئی کہ میں نے کراچی سے متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) کا ویزا لے لیا تھا۔ اس کو دیکھ کر عمانی سفارت خانے والے مجھ کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اُن سے غیر فصیح عام عربی زبان میں بات چیت کرنا بھی میرے لئے وبالِ جان بن گیا' دوسرے کچھ زائرین تھے ان کو تو ویزا مل گیا اور میرے لئے یہ شرط لگائی گئی کہ پاکستانی سفیر جب تک نہیں لکھے گا ویزا نہیں مل سکتا۔ یہ سُن کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ دفتری کاروبار کی وجہ سے میرا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں نے اس کے لئے میمن صاحب سفیر پاکستان کو تکلیف دینا مناسب خیال نہ کیا اور سیکریٹریوں سے اس بارے میں کہا لیکن ہمارے سفارتی حکام ایسے لاٹ صاحب تھے کہ سوائے نہ کے ان کے ہاں اور کوئی جواب نہ تھا' لامحالہ میمن صاحب سے ملا۔ صاحب موصوف کی ہردلعزیزی اور پاکستانی حجاج کے ساتھ ہمدردی کی کیا تعریف کروں' اُسی وقت میرے لئے خط ٹائپ ہوا جس کو لے کر میں عمانی سفارت خانے میں پہنچا اور ویزا حاصل کیا' اس سلسلے میں میں اپنے دوست قاری خیر محمد صاحب کی خصوصی معاونت کو بھی نہیں بھلا سکتا۔

جدہ میں دو دن قیام رہا اس موقع کو غنیمت پا کر عرب کے ایک مخیر اور علم دوست عالم شیخ محمد نصیف سے ملاقات کی۔ شیخ کے نام نامی سے تو میں پہلے سے آشنا تھا' عمر رسیدہ بزرگ ہیں کوئی نوّے سال کے لگ بھگ ہونگے۔ متانت' سنجیدگی اور اخلاق کے مجسمہ ہیں' کافی دیر تک ان سے علمی باتیں ہوتی رہیں' مولانا بنوری صاحب کا بھی تذکرہ کیا پھر مخدوم محمد معین ٹھٹھوی سندھی اور ان کی کتاب "دراسات اللبیب" کے متعلق بھی اپنے تاثرات ظاہر فرمائے' موصوف چونکہ سلفی مسلک کے ہیں اس لئے دراسات کی تعالیق اور حواشی کے سلسلے میں میرے فاضل دوست نعمانی صاحب سے ناراض نظر آتے تھے۔ عربی دستور کے مطابق قہوہ اور چائے نوشی جاری رہی اور مذاق میں قہوہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ یہ ہمارے ہاں کا "پان" ہے۔ کھانے کے لئے بھی اصرار فرمایا لیکن وقت کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں معذرت کرنی پڑی۔ شیخ محمد نصیف صاحب کی بڑی اچھی لائبریری ہے۔ آپ نے منہاج السنۃ جدید ایڈیشن ۴ تالیف شیخ الاسلام ابن تیمیہ' الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ' تالیف شوکانی اور دوسری کتابیں بھی مرحمت فرمائیں۔

ہمیں دو دن جدہ میں رہنا پڑا۔ پھر ہم مکہ مکرمہ واپس آگئے' میں نے پاسپورٹ اپنے معلم محمد ہاشم سندھی صاحب

کے حوالہ کیا، وہ اپنی بے حد مصروفیتوں کے باوجود جدہ گئے اور اپنی جیب سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ ۲۶۵/- ریال میں جدہ سے عمان تک کا لے آئے۔ اب میرے لئے یہ ٹکٹ دکھا کر مدینہ منورہ جانا آسان ہوگیا ورنہ میری باری تب آتی جب چوتھے جہاز کے کراچی کی طرف واپسی میں صرف دس بارہ دن رہ جاتے، کیوں کہ میں چوتھے نمبر جہاز میں ہی آیا تھا اور اسی سے مجھے لوٹنا تھا، کسی دوسرے ملک کو جانے کے لئے بحری جہازوں سے آنے والے حجاج کو صرف ہوائی جہاز کے ذریعہ جانے کی اجازت ہوتی ہے، غرض یہ ٹکٹ دکھا کر مجھے مدینہ منورہ جانے کی اجازت مل گئی۔

مدینہ منورہ کو روانگی مکہ مکرمہ سے "خروج" کی اجازت ملتے ہی میں حرم میں طوافِ وداع کے لئے گیا، یہ طواف واجب ہے اور کعبہ سے رخصت کا طواف ہے، اس موقع پر مجھے اپنے، اپنے خویش واقارب اور دوسرے احباب کے لئے جتنی دعائیں کرنی تھیں وہ سب پورے خلوص سے کیں۔ حرم سے جدائی کے وقت اس بندۂ آثم پر جو رقت طاری ہوئی وہ حد بیان سے باہر ہے۔

اب مجھ سے بس کا انتظار بھی نہ ہو سکتا تھا کیونکہ بس تو تب جائے جب حجاج سے بھر جائے۔ آخر حکومت سے "تنازل" حاصل کیا اور اپنے معلم اور دوسرے احباب کو الوداع کہہ کر ٹیکسی کے لئے جیاد پہنچا۔ مدینہ جانے کے لئے میری عجلت کا یہ عالم تھا کہ میرے دو رفقاء میں سے پروفیسر سید فخر الحسن صاحب کو ان کی بوڑھی والدہ کی بیماری کی وجہ سے پہلے ہی مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے جانے کی اجازت مل گئی اور وہ مدینہ چلے گئے تھے، لیکن پروفیسر ظہور احمد صاحب تا حال مکہ میں میرے ساتھ تھے وہ سپتال گئے ہوئے تھے۔ ان کے واپسی کا بھی انتظار نہ کر سکا تاکہ ان کو بھی الوداع کہوں۔ درحقیقت یہ کوئی میری خصوصیت نہ تھی، مکہ مکرمہ سے "خروج" کی اطلاع اس طرح ملتی ہے کہ حجاج جلدی میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

غرض محلہ جیاد سے جدہ کے لئے تین ریال کرایہ دے کر ٹیکسی پر سوار ہوا، جیسے ہی جدہ کے بس اسٹینڈ پر پہنچا تو مدینہ منورہ جانے کے لئے ایک ٹیکسی تیار کھڑی تھی، جدہ سے مدینہ منورہ تک کا چھ ریال کرایہ دیا۔ یہ کرایہ حجاج کے لئے نہیں ہوتا، جیسے کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، بلکہ مقامی لوگوں سے لیا جاتا ہے، میں چونکہ "ورقہ تنازل" حاصل کر چکا تھا اس لئے اب میری حیثیت بھی مقامی آدمیوں جیسی تھی۔

جدہ سے مدینہ منورہ تک ۴۲۴ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ٹیکسی بڑی تیز چل رہی تھی، سڑک نہایت ہی عمدہ اور نئی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی، راستے میں کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں نظر آئیں، ظہر کی نماز رابغ میں ادا کی۔ رابغ بحر قلزم پر ایک چھوٹی

سی بندرگاہ ہے۔ یہ شامی اور مصری حجاج کے لئے میقات احرام ہے۔ یہاں بدوی بچے اُبلے ہوئے انڈے بیچ رہے تھے دس قروش میں تین انڈے ملے۔ وہاں چائے نوشی بھی کی۔ رابغ کے بعد بدر کا مقام آیا، یہاں بھی قہوہ خانے تھے، کافی دیر تک وہاں ٹھہرے۔ معرکہ بدر جہاں واقع ہوا تھا وہ جگہ اس بستی سے مغرب کی طرف تھوڑے فاصلے پر ہے۔ وہیں شہدائے بدر کی قبریں بھی ہیں، عربوں نے دور سے ہمیں وہ جگہ بتائی۔ بدر سے آگے حسینیہ، مسجد، بئر الراحۃ اور بئر علی کی بستیاں آئیں، بئر علی سے مدینہ منورہ صرف پانچ میل رہ گیا اور یہ وقت مغرب کا تھا لہٰذا مدینہ منورہ کی روشن بتیاں دور سے نظر آرہی تھیں۔ اس جگہ کو ذوالحلیفہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جو اہل مدینہ کے لئے میقات ہے اور حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں رضوان اللہ علیہم نے یہیں احرام باندھا تھا۔ اب جیسے جیسے یثرب کی آبادی قریب آرہی تھی، شوق دیدارِ گنبد خضرا بڑھ رہا تھا۔ ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتشِ شوق تیز تر گردد

حدودِ شہر میں داخل ہوتے ہی معلّم کا تعین ضروری ہو گیا۔ یہاں مکہ مکرمہ کی طرح معلّم کے تعین میں حجاج کو اختیار نہیں ہے، بلکہ ہر خطہ کے لئے معلم مقرر ہوتے ہیں۔ کراچی کے لئے شیخ حمزہ زللی معلم تھے، ہمیں اُن کو ہی اپنا معلّم مقرر کرنا پڑا۔ حرم کے قریب ٹیکسی کو رُکوا کر اُتر پڑا، شوق زیارت کا یہ عالم تھا کہ سامان اُتارتے وقت ایک بوری سامان کی (جسمیں اکثر امانتیں اور احباب مدینہ کے لئے کچھ تحائف تھے) ٹیکسی سے اُتار نا رہ گئی، بوری پر میں نے اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا، جب حرم پہنچا تب سامان یاد آیا، لیکن اب تو رات ہو گئی تھی۔ معلّم کو خبر کی، اس نے بھی یہ عذر پیش کیا کہ اگر آپکا پتہ لکھا ہوا ہوتا تو سامان مل جاتا۔ میں نے ٹیکسی کا نمبر بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور اس کے شوفر کی یہ حالت تھی کہ جدہ سے لے کر مدینہ منورہ تک ریڈیو سنتے اور ہاتھ سے تالیاں بجاتے آئے تھے، نماز کی پابندی بھی ان لوگوں میں نہ تھی۔

صبح کو مسجد نبوی میں جا کر نماز باجماعت ادا کی اور صلوٰۃ وسلام پڑھا، اس وقت کی کیفیت قید کتابت میں نہیں آسکتی۔ اس کے بعد بس اسٹاپ پر چلا گیا، بیسیوں ٹیکسیاں اور بسیں کھڑی تھیں۔ وہاں پولیس کو بھی اطلاع دی۔ ان کی طرف سے بھی یہی جواب ملا کہ ڈرائیور کو شناخت کیجئے، لیکن بیسیوں آدمیوں میں شناخت کرنا مشکل ہو گیا۔ آخر دو گھنٹے کے انتظار کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب کے ہاتھ میں وہی بوری سامان کی ہے اور اعلان کرتا پھر رہا ہے،

بڑی خوشی ہوئی کھویا ہوا سامان مل گیا، ڈرائیور اور شوفر کے متعلق جو میری بدگمانی تھی وہ جاتی رہی، حسن معاملگی اسی کا نام ہے، ظاہری تقویٰ میرے خیال میں کسی کام کا نہیں ہے۔

ملاقاتیں جمعہ کا روز تھا، میں ۳ گھنٹے پہلے "روضہ من ریاض الجنۃ" میں پہنچ گیا، نماز سے فراغت کے بعد مولوی محمد قاسم اور مولوی حبیب اللہ صاحب بلوچستانی سے ملاقات ہوئی، یہ دونوں بزرگ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں درجہ عُلیا میں تعلیم پاتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ صاحب صدر مدرس مظہرالعلوم کراچی نے انہیں پہلے ہی میرے متعلق اطلاع دی تھی۔ ان دونوں دوستوں کی وجہ سے فضلائے مدینہ اور مقامات متبرکہ اور آثار قدیمہ دیکھنے میں میرے لئے آسانی پیدا ہوگئی۔ اسی روز عصر کے بعد جنت البقیع گئے، جہاں حضرات عثمان، ابوسعید خدری، حلیمہ سعدیہ، امام نافع، امام مالک، آٹھ اُمہات المومنین، بنات النبیؐ، سیدہ خاتون۔ امام حسن، امام محمد باقر، امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم کے مزارات کی زیارت حاصل ہوئی۔ مزارات کیا تھے صرف معمولی نشانات باقی تھے، واپسی میں سندھ کے ایک درویش صفت عالم مولانا محمد کامل صاحب سے جو کہ پندرہ سال سے ترک وطن کرکے مع اہل و عیال جوار سرورِ کائنات میں سکونت فرما ہیں، اُن کے دولت خانے پر ملاقات ہوئی، مولانا موصوف صبر و شکر کے مجسمے ہیں، اب تو انہوں نے اپنا ایک مکان بھی بنوا لیا ہے، لیکن اس سے قبل جن صعوبتوں کا ان کو سامنا پڑا آپ وہ سب بخوشی برداشت کرتے رہے، ان کے دوستوں سے معلوم ہوا کہ وہ کبھی مدینہ منورہ کی زندگی سے دل برداشتہ نہ ہوئے۔ مزدوری کرکے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتے رہے، اب بھی خیاطی کر رہے ہیں اور اس سے جو وقت بچتا ہے وہ کتابوں کے مطالعہ اور مسجد نبوی میں عبادت کرتے ہیں، میرے تو وہ قدیم دوست اور کرمفرما تھے، مدینہ منورہ میں وہ اکثر میرے ساتھ رہے۔

مدینہ منورہ کے مشاہیر علماء سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، مولوی محمد قاسم اور مولوی حبیب اللہ متعلمان جامعہ اسلامیہ مدینہ کی رفاقت میں علامہ شیخ ابن باز پرو وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے دولت خانے پر حاضر ہوا، شیخ ابن باز کے حسن اخلاق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ موصوف کا پانچ ہزار ریال کا مشاہرہ ہے لیکن مہمانوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ سُننے میں آیا کہ اتنا مشاہرہ ہوتے ہوئے بھی مقروض رہتے ہیں۔

موصوف میرے ساتھ علمی گفتگو کرتے رہے۔ ان کو مملکت اسلامیہ پاکستان سے بھی بڑی ہمدردی ہے۔ پاکستانی علماء کی علمی سرگرمیوں کے متعلق بھی سوالات کرتے رہے۔ آپ نے سندھ کے قدیم محدثین اور علماء کی بڑی تعریف فرمائی۔

میں نے انہیں اپنی کچھ تالیفات بھی پیش کیں غرض موصوف نے جس کرمفرمائی اور حسن اخلاق کا مظاہرہ فرمایا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے یاد رہیگا۔ میرا ارادہ مشرق وسطیٰ کی سیاحت کا تھا علامہ موصوف سے میں نے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بکمال شفقت ایک خط دیا تاکہ اگر مجھے واپس حجاز آنا پڑے تو سفارت کی طرف سے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

الحاج سید شیر محمد خلیفہ مولانا تھانوی کی زیارت | مدینہ منورہ کے زندہ بزرگوں میں سب سے نمایاں شخصیت سید شیر محمد گھوٹکی (؟) سندھی بزرگ ہیں، عرصہ دراز سے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے ہیں۔ آپ کے ہاں ہر ملک کے علماء اور فضلاء زیارت کے لئے آتے ہیں، اور مسائل حج میں آپ کی شخصیت مستند سمجھی جاتی ہے میرے لئے آپ کی ذات گرامی ناآشنا نہ تھی کیونکہ سید صاحب اپنے وطن گھوٹکی سندھ میں اپنے بڑے بھائی الحاج سید فخرالدین شاہ مرحوم خلیفہ ارشد مولانا اشرف علی کی معیت میں مدرسہ قاسم العلوم گھوٹکی چلاتے تھے، اس دور میں مدرسہ قاسم العلوم کا میں مدرس اول تھا، سید صاحب کی زیارت سے بڑا قلبی سکون حاصل ہوا موصوف کی اس وقت ۸۳ سال عمر ہے اور اس پیرانہ سالی میں بھی اپنا خود کھانا پکاتے ہیں، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو ان کی خدمت کے لئے بیسیوں معتقدین تیار ہیں، لیکن وہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔

دوران گفتگو موصوف نے فرمایا کہ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب استاذ العلماء مولانا قمرالدین نبوی، مولانا نظر محمد صاحب مَنگ والے سے تعلیم پاتے تھے۔ فقیہ سندھ مولانا محمد قاسمؒ ساکن گڑھی یاسین کے متعلق فرمایا کہ ان میں حق طلبی اور انصاف کا مادہ تھا، اسی طرح فرمانے لگے کہ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے سندھ کے مفتی مولانا عبدالغفور صاحب ہمایونی کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ میرے کچھ خطوط بھی سید صاحب کی معرفت آئے تھے ان کو حاصل کیا اور پھر ایک دوسرے سندھی تاجر الحاج علی محمد خیاط سے ملاقات کی۔

الحاج علی محمد سندھی بھی عرصہ پندرہ سال سے ترک وطن کر کے مدینہ منورہ میں مع اہل و عیال سکونت پذیر ہیں، ان کا بھائی محمد بخش نامی بھی ان کے ساتھ ہجرت کر کے گیا تھا، لیکن چند سال کے بعد وہ اس لئے واپس آگیا کہ وہاں کے لوگوں کی وہابیت سے وہ متنفر تھا۔ لیکن الحاج علی محمد بڑے صبر اور شکر سے مدینہ منورہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو ہر لحاظ سے قابل رشک ہے۔ الحاج علی محمد کی دکان مسجد نبوی کے بالکل قریب تھی اس لئے میں نے انہی کے ہاں رہنے کو پسند کیا۔

زیارتیں | ۲ر جون کو جبلِ اُحد اور دوسری زیارتوں کا پروگرام بنایا، پہلے جبلِ اُحد گیا، جنگ اُحد کی وجہ سے

اس جبل کی جو تاریخی اہمیت ہے وہ سب کو معلوم ہے، یہ جبل مدینہ سے شمال کی جانب تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح مورچہ قائم کیا تھا، اور کہاں پہ پچاس تیر اندازوں کو متعین فرمایا تھا، اور پھر کس طرح پسپائی ہوئی، ان تمام چیزوں کو رفقاء کی رہنمائی میں غور سے سمجھتا رہا، حضرت حمزہؓ کے مزار کی زیارت بھی نصیب ہوئی، وہاں سے مسجد قبلتین گئے، پھر خندق کو دیکھا جہاں پانچ مسجدوں کی بھی زیارت کی، پھر مسجد قبا کو چلے گئے وہاں نوافل ادا کئے، مسجد قبا کے قریب بیرِ اریس کو بھی دیکھا۔ یہ وہ کنواں ہے جس کا پانی آنحضرت صلعم کی لعاب کی برکت سے میٹھا ہوا تھا اور حضورؐ کی انگوٹھی حضرت عثمانؓ سے اس کنوئیں میں گر پڑی تھی، یہ تمام زیارتیں کرکے واپس آگیا، دوسرے دن مولوی محمد قاسم اور مولوی حبیب اللہ صاحبان کی رفاقت میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ گیا، جہاں جامعہ کے تلامذہ اور اساتذہ سے کافی دیر تک ملاقات رہی۔

جامعہ کے امین عام علامہ شیخ عبودی سے اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے ملاقات ہوئی لیکن عمر بھر میں ان کی گرمجوشی کو بھول نہیں سکتا، موصوف خالص علمی انسان اور کتابوں کے دلدادہ تھے، علمی جذبے کی بنا پر میری اُنہوں نے جو معاونت فرمائی اس کا بدلہ تو پروردگار سے ہی ان کو ملے گا۔ وہ اپنی موٹر پر بٹھا کر مجھے مسجد نبوی میں لائے۔

اسی روز شام کو بیرِ رومہ کو بھی دیکھا، پانی نہایت ہی میٹھا تھا، یہ تاریخی کنواں ہے جس کو حضرت عثمانؓ نے یہودیوں سے خرید فرما کر وقف کیا تھا، آج تک اس کا پانی میٹھا چلا آرہا ہے۔ یہاں ڈیری فارم بھی ہے، اس کے پاس بڑا اچھا خوش کن باغیچہ ہے۔ یہ کنواں مدینۂ منورہ سے شمال مغرب کی طرف تقریباً تین میل فاصلے پر ہے +

(عربی)

المسوّیٰ من احادیث الموطا

امام ولی اللہؒ دہلوی

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں مولانا کے تشریحی حاشیے ہیں۔ ولایتی کپڑے کی نفیس جلد قیمت بیس روپے۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر حیدرآباد سے طلب کیجئے

دینی تعلیم میں اصلاح کی ضرورت[1]

مولینا منت اللہ قاسمی

آج سے تقریباً سو سال پہلے ہندوستان میں ایک طرف تو انگریزی حکومت اپنے پنجے مضبوط کر رہی تھی۔ دوسری
رف عیسائی مشنریوں کا جال پھیلایا جارہا تھا اور یورپین مبلغین ہر طرف گھوم گھوم کر عیسائی مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے۔
ی زمانہ میں حکومت کو کچھ ایسے مسلمان بھی مل گئے جن کے نزدیک دینی اور دنیاوی ترقی کا مدار اسی پر تھا کہ نسل تو
دوستانی رہے لیکن ظاہر و باطن یورپین ہو جائے۔ حکومت نے ایسے مسلمانوں سے پوری طرح کام لیا۔ غرض اسوقت
ای کی زنجیریں مضبوط کی جارہی تھیں۔ الحاد و بے دینی کی آندھی چل رہی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا ملک عیسائی
جائے گا اور ہندوستان کو کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی۔

اسی کے ساتھ دینی تعلیم کی مسندیں خالی ہو چکی تھیں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ کے علوم و معارف
 وارث بھی ختم ہوتے نظر آرہے تھے۔ ان حالات میں خدا کے ایک برگزیدہ کو دار العلوم کا خیال آیا۔ اور حضرت نانوتوی
الرحمۃ نے فیصلہ کیا کہ اس وقت دین کی حفاظت اور مسلمانوں اور اُن کے آنے والی نسلوں کو باقی رکھنے کا کام ایک
العلوم ہی انجام دے سکتا ہے۔ جہاں کتاب و سنت کی تعلیم ایسے نہج پر دی جائے کہ یہاں کے فارغین، سلف کا نمونہ
کر ملک کے کونہ کونہ میں پھیل جائیں۔ خود نجات پائیں اور دوسروں کو نجات کا راستہ بتلائیں۔

---

[1] مولانا منت اللہ صاحب قاسمی امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے یہ بیان چند سال ہوئے دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے سامنے
ھا تھا۔ اس بیان میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، حسن اتفاق سے شوریٰ نے حال ہی میں انہیں منظور کر لیا ہے۔ ایک نصاب کمیٹی بنادی
ہے جو نصاب میں ضروری ترمیم کرے گی۔ معلوم ہوا ہے شوریٰ نے دار العلوم دیوبند میں انگریزی کو بحیثیت ایک مضمون کے داخل
ب کر لیا ہے۔ یہ بیان مدینہ بجنور سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

دارالعلوم اسی مقصد سے قائم ہوا اور آج تک اسی راہ پر چل رہا ہے۔ اور پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور آج پورے ملک میں انتہائی ناموافق حالات کے باوجود جو دین اور دینداری موجود ہے وہ دارالعلوم ہی کا طفیل ہے، اس لمبے چوڑے ملک میں آج سینکڑوں مدارس ہیں جہاں مسلمانوں کی اولاد خدا کا دین سیکھتی ہے، دارالعلوم ہی کے فارغ التحصیل حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آزادی کے بعد اس ملک میں علماء اور دینداروں کی جماعت، برادران وطن کی نگاہوں میں بھی عزت کا مقام رکھتی ہے۔ یہ صرف اسی لئے کہ حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ، حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے اکابر اور دارالعلوم کے موجودہ شیخ نے صرف درس و تدریس کا کام انجام نہیں دیا بلکہ یہ حضرات جنگ آزادی کے بھی ہیرو ہیں، اگر دارالعلوم اور اس کے فضلاء نے جنگ آزادی میں پورا حصہ لیا ہوتا تو آج ہندوستان میں علماء کی وہی حالت ہوتی جو انقلاب کے بعد ترکی یا دوسرے ممالک میں ہوئی۔

دارالعلوم نے ہمیشہ ملک کے حالات کو کتاب و سنت کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ملک کی ہر تحریک اور ہر اقدام کا اسی نقطہ نگاہ سے جائزہ لیا ہے اور پھر اس میں شرکت ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کی رہنمائی کی ہے۔ دارالعلوم کی پالیسی کبھی جامد نہیں رہی ہے اس نے ہمیشہ ترقیاتی منصوبوں کا ساتھ دیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کے مقصد کے معاون ہوں یا کم از کم معارض نہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آج بھی دارالعلوم ہر جدید کو اسی شرط کے ساتھ لبیک کہے گا۔

دین کی تعلیم و اشاعت کا سلسلہ خیر القرون سے آج تک جاری ہے لیکن علوم، طریقۂ تعلیم اور کتب درسیہ ہر زمانہ میں مختلف رہیں۔ اور یہ اختلاف مسلمانوں کے ماحول، ملک کے حالات اور رجحانات کے تابع رہا۔ بہت سے علوم و فنون خیر القرون میں مدون ہی نہیں ہوئے تھے یا اس دور میں اس کی تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، منطق، فلسفہ، ہیأت، اور علم معانی کی ترتیب و تہذیب بعد میں ہوئی۔ اصول فقہ کی تعلیم امام شافعیؒ کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ دوسری صدی ہجری کے نصف تک تعلیم کا طریقہ زبانی روایت و املا تھا جو علامہ سیوطیؒ اور . . . . تک جاری رہا۔ ایک زمانہ میں مختلف ملکوں کے طریقہ تعلیم میں بھی فرق تھا۔ اندلس میں پہلے قرآن مجید پڑھاتے اور اس کے بعد اشعار اور فن انشاء کے مسائل بتلاتے۔ افریقہ میں قرآن کے ساتھ حدیث کا درس دیتے۔ ابوبکر ابن العربی نے تعلیم کا کچھ اور طریقہ اختیار کیا اور اسی زمانہ

کے طریقۂ تعلیم پر کہ پہلے قرآن پڑھایا جائے یا دو علوم ایک ساتھ پڑھائے جائیں توجہ کی۔ کتب درسیہ میں تو بہت زیادہ تبدیلی ہوتی رہی۔ پہلے امام محمدؒ کی کتاب اصل درس تھی پھر ابوزید دبوسی اور بزدوی کی تصانیف کا رواج ہوا۔ پھر ابن السمعانی کی کتاب البدایہ تمام مدرسوں میں جاری ہوئی اس کے بعد ہدایہ، شرح وقایہ نصاب میں داخل ہوئیں۔ یہی حال ادب، علم کلام اور فن منطق وغیرہ کا رہا۔ لیکن ایک بڑا فرق یہ ہے کہ متقدمین اس کو محض آلہ اور ذریعہ کی حیثیت سے پڑھاتے تھے، متاخرین نے اس کو مستقل علم بنا لیا ہے اور مقصودیت کی شان پیدا کر دی ہے۔

ہندوستان میں ملّا نظام الدین نے پچھلے تمام طریقوں سے ہٹ کر ایک نیا نظام اور نصاب درس بنایا جسے قبول عام حاصل ہوا، لیکن خود ملّا صاحب نے درس نظامی سے ہٹ کر طلبار کو فصوص الحکم اور بخاری شریف کا درس دیا اور ملّا صاحب کے بعد صحاح ستہ، ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک، غلام یحییٰ وغیرہ درس نظامی میں داخل کی گئیں اور آج تک پڑھائی جاتی ہیں۔

غرض ہر دور میں وقت کی ضرورت اور زمانہ کے حالات کے مطابق نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ آج بھی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ تعلیمی نصاب پر دوبارہ غور کیا جائے اور خصوصاً تقسیم ہند کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں نظام تعلیم میں اُن کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

میرے خیال میں اس مسئلہ پر غور کرتے وقت حسب ذیل اُمور کو سامنے رہنا چاہئے:۔

(۱) ہر طالب دین کو عربی زبان اور عربی نصاب کے ذریعہ دین سکھلانا، نہ صرف یہ ضروری نہیں بلکہ اکثر اس طریقہ کار سے علوم دینیہ کا استخفاف ہوتا ہے۔ علم اور علمی جماعت کی ساکھ پر سخت ضرب پڑتی ہے جیسا کہ ان دنوں عام طور پر مشاہدہ ہو رہا ہے۔ ہر طالب علم دین کو میزان سے بخاری شریف تک پڑھانا اُستاد اور طالب کے وقت اور قوم کے روپئے کو ضائع کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ دین اور مدارس دینیہ کا اعتماد لوگوں کی نظر میں کم ہو جائے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جس میں مادری زبان کے ذریعہ طلباء کو دینی تعلیم دی جائے اور پھر ان میں سے طلباء کا انتخاب کیا جائے اور انہیں عربی نصاب کے ذریعہ دین کی تعلیم دی جائے۔

(۲) نصاب تعلیم کا محور اور مرکز قرآن، حدیث اور فقہ ہو اور جو کچھ بھی پڑھایا جائے وہ انہیں کو جاننے اور سمجھنے کے لئے۔

(۳) نصاب میں ایسی کتابوں کو نظرانداز کر دیا جائے جن میں اصل مسئلہ سے قیل و قال ہو یا طرز ادا مشکل اور پیچیدہ ہو، لیکن

نئی کتابوں کے انتخاب کے وقت یہ امر پیش نظر رہے کہ قدماء کا مقصد قرآن و حدیث کی خدمت تھا، اس لئے انہوں نے علوم کی ایجاد و ترتیب اور کتابوں کی تصنیف اسی نظریہ سے کی ہے۔ لیکن ان دنوں مصر وغیرہ میں مصنفین کا مقصد زبان عربی اور مختلف علوم جدیدہ کی براہ راست خدمت ہے، اس لئے جدید تصانیف بالعموم اسی نظریہ کے ماتحت ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتابیں دینی نصاب تعلیم کے لئے کچھ زیادہ کارآمد نہ ہونگی۔

(۴) سیرت نبویؐ اور خلفاء راشدین کی سوانح کو اسلام میں آئینی حیثیت حاصل ہے اور ضروری ہے کہ ایک عالم کی نظر پوری اسلامی تاریخ پر گہری ہو۔ اس لئے تاریخ اسلام کو داخل نصاب کیا جائے اور وہ پہلو اجاگر کیئے جائیں جن کی اس زمانہ میں سخت ضرورت ہے۔

(۵) منطق اور فلسفہ کی کتابیں اسی قدر داخل نصاب ہوں جس سے اس فن کے مصطلحات پر عبور ہو سکے اور متاخرین کے علمی ذخیرے سے استفادہ میں دقت نہ ہو۔

(۶) موجودہ علم کلام ان شبہات کا جواب دیتا ہے جو یونانی فلسفہ نے پیدا کئے تھے۔ اب اعتراضات اور شبہات کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ اس لئے علم کلام کی ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جو دور حاضر کے پیدا کردہ اعتراضات اور شبہات کو دور کر سکیں۔

(۷) عربی ادب کی تعلیم اسی حد تک ہو جس سے قرآن و حدیث و فقہ اور اس سے متعلقہ علوم و فنون کو بے تکلف سمجھا جا سکے۔ عربی ہماری مذہبی زبان ہے، لیکن مادری زبان نہیں۔ عربی گفتگو اور تقریر و تحریر کی مشق پر زیادہ زور دینا طلباء کو ایک ایسے کام پر لگاتا ہے جو دارالعلوم کی چہاردیواری سے آگے نہیں بڑھ سکتا، عربی تحریر و تقریر کی ساری مشق گھر جا کر ختم ہو جائے گی جہاں برس ہا برس اور اکثر فارغین کو زندگی کی آخری سانس تک نہ کوئی عربی بولنے والا ملے گا اور نہ سمجھنے والا۔ ہاں مادری زبان میں تقریر و تحریر کی مشق پر زور دیا جائے کہ یہی زبان دین کی اشاعت اور علوم کی ترویج کا ذریعہ ہے ہاں نصاب میں اس کی گنجائش ضرور رکھی جائے کہ اگر کچھ طلباء فراغت کے بعد علوم و فنون میں جن میں ایک عربی ادب بھی شامل ہے مہارت حاصل کرنا چاہیں تو انھیں اس کا موقع حاصل ہو۔

(۸) علم جغرافیہ، فلسفہ جدید اور سائنس کی بھی ایسی کتابیں رکھی جائیں جس سے طلباء کو اس فن کی عام اور ضروری معلومات حاصل ہو جائیں اور وہ ان علوم کو اور ان مسائل کو اجنبی محسوس نہ کریں۔

(۹) علم اخلاق کو بھی داخل کیا جائے جس میں امراض قلبیہ اور نفسیہ اور اس کے علاج سے بحث کی جاتی ہے کہ ظاہری و باطنی اخلاق کی اصلاح ہو سکے۔

(۱۰) ملک کی سرکاری زبان بھی ضروری حد تک لازم کی جائے۔

(۱۱) قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ دور حاضر کے نئے مسائل سے طلباء پڑھنے ہی کے زمانے سے واقف ہوتے جائیں۔ درس کی وہ تقریریں جو عام طور پر کی جاتی ہیں اس دور میں کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ دور بدل چکا، آج کے مسائل بھی دوسرے ہیں، اور اعتراضات اور شبہات بھی دوسرے۔ غور و فکر کا طریقہ بھی نیا ہے اور طرز تعبیر بھی نیا۔ اب نہ وہ بحثیں ہیں اور نہ وہ حجتیں اور نہ مجادلے ہیں نہ مناظرے۔ ایک زمانہ تھا کہ کتاب کا مسئلہ شروح، تعلیقات، منہیات اور بین السطور و حواشی کے بغیر حل ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ زمانہ ہے کہ ایسی بات تبلایئے جو دین و دنیا میں کارآمد ہو، اور ایسے سلجھے ہوئے اور صاف انداز میں کہیئے کہ طبع سلیم کو اپیل کرے اور دل میں گھر کر جائے۔ اس لئے درس کا انداز ایسا اختیار کرنا ہوگا کہ طلبہ فراغت کے بعد عہد حاضر کی دینی ضرورت کو پورا کر سکیں اور جب اُن کو نئے مسائل سے سابقہ پڑے، تو اپنے کو بے بس محسوس نہ کریں۔

تعلیم کے ساتھ طلباء کی تربیت کا بھی ایک مضبوط نظام قائم کیا جائے اور ڈھنگ سے ان کی تربیت کی جائے کہ ان کا مقصد تعلیم دین سے حصول معاش نہ ہو۔ ان کا مقصد دین کی خدمت ہو اور اس راہ میں مصائب کا جھیلنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھیں، اُن کی نظر حکومت کے عہدوں اور بڑی بڑی تنخواہ پر نہ ہو۔ معاشی تنگی کے باوجود دین کی خدمت اس طرح کر سکیں جس طرح اونچے عہدوں اور بڑی تنخواہوں کے بعد وہ کر سکتے۔ سرکاری مدارس کے فارغین کا ہمیں کافی تجربہ ہے۔ چونکہ انہیں سرکاری ملازمتوں میں کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اس لئے ان کے پڑھنے اور پڑھانے کا مقصد صرف سند اور اس کے ذریعہ ملازمت کا حصول ہوتا ہے، اور بس، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر دین کی خدمت نہیں کر سکتے۔ دینی تعلیم کا ایسا نظام جس کے ذریعہ فارغ طلباء کو وہی حقوق حکومت کے مناصب اور ملازمتوں میں حاصل ہو سکیں جو سرکاری کالجوں کے فارغین کو حاصل ہوتے ہیں وہاں قائم کیا جا سکتا ہے جہاں کی دینی و سرکاری زبان ایک ہو اور حکومت اسی دین پر یقین رکھتی ہو جس دین کی تعلیم کا ادارہ اور نظام ہے، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں یہ نظریہ اسلام کے لئے نہ مفید ہے نہ ممکن۔

دین کے دو جزو حکمت اور فقہ

محمد سرور

گو قرآن مجید کے اوّلیں مخاطب قریش مکہ اور اُن کے بعد عرب تھے، لیکن وہ تھا ساری انسانیت کے لئے پیام ہدایت۔ وہ کسی ایک ملک، قوم یا زمانے کے لئے مخصوص نہیں۔ قرآن مجید کی تعلیم اتنی ہی عالمگیر اور ہمہ گیر ہے، جتنی کہ خود انسانیت ہے[1]۔

شاہ ولی اللہ صاحب البدور البازغہ (ص۱۹۸) میں "مقاصد شرع صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے انکشاف کے طالب کو سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آپؐ کی بعثت ملّتِ حنیفیہ کے ساتھ ہوئی تھی تاکہ وہ اُس کی کجی کو سیدھا اور اُس میں جو تحریف ہوئی تھی اُس کی اصلاح کریں اور اُس کے نور کو عام کریں۔ چنانچہ وہ مقدمات جن پر ملّتِ حنیفیہ کی بنیاد ہے اُنہیں اُس کی تفصیلات میں جانے سے پہلے بطور مسلّمات کے مان لینا چاہئے۔ اسی طرح (اعمال و شعائر کی) وہ ہیئتیں اور صورتیں جو اس ملّت کے ماننے والوں میں وراثت کے طور پر چلی آتی تھیں، اُن کی بھی

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب "البدور البازغہ" (ص۱۹۱) میں فرماتے ہیں:۔ واعلموا ان رضاء اللہ تعالیٰ وامرہٗ منحصرٌ فی الملۃ الحنیفیۃ لا یتجاوزھا لانھا بنیت علیٰ موافقۃ الصورۃ الانسانیۃ واستخراج المعارف والعلوم منھا.....
(تمہیں جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کا امر ملّت حنیفیہ میں منحصر ہے اور وہ اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ اور یہ اس لئے کہ ملت حنیفہ کی بنا صورت انسانیت پر رکھی گئی ہے اور اُسی سے معارف و علوم کا استخراج ہوتا ہے)۔ قرآن مجید اسی ملّت حنیفیہ کا آخری صحیفہ، اور دین اسلام اُس کی آخری شکل ہے۔

اُس کے لئے حیثیت مسلّم ہو" اس کے بعد شاہ صاحب نے وہ بڑے بڑے مقاصد بتائے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے پیش نظر تھے۔ اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُصول دین میں سے ملّتِ حنیفیہ کو باری تعالیٰ کی وحدانیت اور یوم الآخرت و معاد کا پابند بنانا ہے اور آپؐ کے دین کے یہ دو اہم اُصول ہیں کہ جو ان دو کی تصدیق نہیں کرتا اُسے دینِ حنیفی پر عامل ہونے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور ان دو کا اقرار اس ملّت کی ضروریات اور اُصول میں سے ہے[1]

ملّتِ حنیفیہ کے انہی بنیادی اُصولوں کا نام دین ہے۔ اور وہ ایک ہے۔ اور قرآن مجید اُسی دین کا شارع و پیغام بر ہے۔ البتہ اس دین کی اساس پر مختلف زمانوں میں جو شرائع مرتب ہوتے رہے وہ مختلف تھے۔ اس کی وضاحت حجۃ اللہ البالغہ میں یوں کی گئی ہے:۔

" جاننا چاہیئے کہ اصل دین ایک ہے اور تمام انبیاء اس پر متفق ہیں .... (انبیاءؑ میں اختلاف اگر ہے تو طاعات و عبادات اور اُن کے آداب و ارکان کے بارے میں ہے .... وہ خاص خاص صورتیں اور مخصوص ہیئتیں جن پر مختلف قسم کی نیکیوں اور تدابیر نافعہ و معاش اور اُمور معاشرت کی آسانیوں کی عمارت قائم کی جاتی ہے، اُنہی کا نام شریعت اور منہاج ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن طاعتوں اور عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے، اور وہ تمام ادیان و مذاہب میں یکساں ہیں حضرت شاہ صاحب کے نزدیک " وہ وہی اعمال ہیں جو نفوس انسانی کی حالتوں اور ہیئتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور آخرت میں انہی اعمال کی بھلائی بُرائی کے اثرات نفوس انسانی کے سامنے پیش ہوں گے۔ اور انہی اعمال سے نفوس انسانی کے اندر انقباض یا انشراح پیدا ہوتا ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ص۲۲۳۔ اردو ترجمہ)

غرض ان طاعات و عبادات کی اصل ایک ہے، البتہ ان کی اساس پر جو شریعتیں بنیں، اُن میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:۔ انبیائے کرام کے شرائع میں چند اسباب و مصالح کی بنا پر

---

[1] وحدانیت باری تعالیٰ میں، بے شک اُس کی صفات اور اُس کی طرف سے انبیاء کے مبعوث کرنے پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔

(البدور البازغہ ص۳۰۲)

اختلاف ہوا کرتا ہے..... (کیونکہ) شرائع کی مقدار اور اندازے کی مشروعیت میں بھی مکلفین کے حالات، عادات، اور اطوار کا لحاظ کیا جاتا ہے....... انبیاءِ کرام کا بڑے سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اِن ارتفاقات اور تدابیرِ نافعہ معاشرت کی اصلاح کی جائے، جو اُن کے مخاطبین کے پاس موجود ہیں اور اسی لئے اُن کو اُن کی مالوفات اور شب و روز کی عادی چیزوں سے جدا کر کے غیر مالوف چیزوں کی طرف دعوت نہیں دی جاتی۔ الاّ ماشاء اللہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مصالح کے مواقع باعتبار زمانہ اور عادتوں کے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر شریعتوں میں نسخ صحیح اور جائز ہے۔ اس کی مثال طبیب کی سی ہے کہ وہ ہر حال میں مزاج کا اعتدال اور اُس کا تحفظ چاہتا ہے۔ اور اس لئے مختلف اشخاص اور مختلف اوقات کے لحاظ سے اُس کے احکام اور طبی طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں"۔

بے شک اللہ کے دین میں دوام، ہمہ گیریت اور عالم گیریت ہے۔ اور وہ کسی قوم، ملک اور زمانے تک محدود نہیں اور وہ جن عبادات وطاعات کی تلقین کرتا ہے، اُن میں اُتنی ہی عمومیت ہے، جتنی خود انسانیت میں، کیونکہ وہ انسانیت کے جبلی تقاضوں کا خیال رکھتا ہے اور اُنہیں کی اصلاح و تزکیہ چاہتا ہے، لیکن اللہ کے دین کی یہ عمومیت مخصوص شرائع کی تدوین و ترتیب کے منافی نہیں اور یہ اس لئے کہ

"اللہ تعالیٰ گو زمان و مکان سے بلند و برتر ہے، لیکن کسی نہ کسی نہج اور کسی نہ کسی وجہ سے اُس کو زمان و مکان سے ربط و تعلق ہوتا ہے"۔[1]

چنانچہ کسی خاص زمان و مکان سے اللہ تعالیٰ کے ربط و تعلق سے شرائع وجود میں آتے ہیں، اور اِن کے نزول میں "زیادہ تر اعتبار ان امور کا ہوا کرتا ہے، جن پر لوگوں کی نشاۃ ہوا کرتی ہے اور جن کی طرف اُن کی عقلیں سوچ سمجھ کر یا بلا سوچے سمجھے منتقل ہوا کرتی ہیں"۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں "معلوم ہونا چاہیے کہ نبوت اکثر و بیشتر کسی نہ کسی ملت کے ماتحت ہوا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ملۃ ابیکم ابراھیم (تمہارے لئے وہی دین تجویز کیا گیا ہے، جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کا تھا) اور جیسا کہ فرمایا ہے، وان من شیعتہ لا براھیم (اور نوحؑ ہی کے طریق پر چلنے والوں میں ایک ابراہیم بھی تھے) اور

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ اُردو ترجمہ صفحہ ۲۳۰۔

اس کا راز یہ ہے کہ جب لوگ ایک عرصۂ دراز تک کسی مذہب کی پابندی کرتے چلے آتے ہیں اور اس مذہب کے شعائر کی عظمت وحرمت اُن کے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہے اور اس کے احکام و اوامر اُن کے نزدیک اس قدر مشہور و معروف اور عام طور پر شائع ہو جاتے ہیں کہ اُن کا شمار بدیہیات میں ہو جاتا ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا[1]

جب اس ملت میں خرابیاں سرایت کر جاتی ہیں اور اُس کے نبی کی روایات میں خلط ملط ہو جاتا ہے تو دوسری نبوت آتی ہے جو اس ملت کے مشہور و معروف احکام کی تفتیش کرتی ہے۔ پھر جو احکام کہ سیاست ملیہ کے قواعد و ضوابط اور اُس کے اُصول کے موافق صحیح ہوتے ہیں، اُن میں وہ کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتی بلکہ اُس کی دعوت دیتی ہے ...... اور وہ اُمور جو نادرست ہوتے ہیں اور اُن میں تحریف ہو چکی ہوتی ہے اُن کو بقدر ضرورت تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور جو اُمور قابل اضافہ ہوں اُن میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، اور یہ نبی اکثر و بیشتر ان لوگوں کی پہلی شریعت کے بقیہ اُمور کو اپنے مطالب و مقاصد میں بطور استدلال پیش کرتا ہے ...." (حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۳۲)

اس طویل تمہید کے بعد — جس سے غرض دینِ اسلام جو تمام مذاہب و ادیان کی اصل ہے اور وہ ایک ہے، اُس میں اور اُس کی اساس پر مختلف زمانوں میں جو شرائع مرتب ہوئے، اُن میں فرق ظاہر کرنا تھا — ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

دین اسلام کی اِس عالمگیر تعلیم کو جو تمام مذاہب و ادیان کی اصل ہے، سب سے پہلے سرزمین حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا یہ جامہ اس عالمگیر تعلیم کا ایک خاص زمان و مکان سے اُس کے ربط و تعلق کا عملی مظہر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اِس میں اُس زمان و مکان اور اہل حجاز کے طبائع و حالات کا یقیناً خیال رکھا گیا۔ اس عملی مظہر کو جسے سنت کا نام دیا گیا ہے دینِ اسلام کی عمومی و ابدی تعلیم کا درجہ دینا ٹھیک نہیں، لیکن اُسے جو بہر حال ایک محدود قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اس عالمگیر تعلیم کے خلاف یا اُس پر زائد سمجھنا بھی غلط ہے، سنّت اس عالمگیر تعلیم کے حجازی جامے کا نام ہے اور اس سے اس عالمگیر تعلیم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بعد میں جب اسلام دوسرے ملکوں میں پھیلا اور عربوں کے علاوہ غیر عرب قومیں بھی مسلمان ہو گئیں تو قرآن کی عمومی تعلیم اور اُس کی حجازی تعبیر کی روشنی میں فقہ کے دوسرے مذاہب وجود میں آئے۔ اب اسلام ایک

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ اردو ترجمہ ص ۲۳۲

اختلاف ہوا کرتا ہے..... (کیونکہ) شرائع کی مقدار اور انداز ے کی مشروعیت میں بھی مکلفین کے حالات، عادات، اور اطوار کا لحاظ کیا جاتا ہے...... انبیائے کرام کا بڑے سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اِن ارتفاقات اور تدابیرِ نافعہ معاشرت کی اصلاح کی جائے، جو اُن کے مخاطبین کے پاس موجود ہیں اور اسی لئے اُن کو اُن کی مالوفات اور شب و روز کی عادی چیزوں سے جدا کر کے غیر مالوف چیزوں کی طرف دعوت نہیں دی جاتی۔ اِلاّ ماشاء اللہ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مصالح کے مواقع باعتبار زمانہ اور عادتوں کے مختلف ہوا کرتے ہیں، اور اسی بنا پر شریعتوں میں نسخ صحیح اور جائز ہے۔ اس کی مثال طبیب کی سی ہے کہ وہ ہر حال میں مزاج کا اعتدال اور اُس کا تحفظ چاہتا ہے۔ اور اس لئے مختلف اشخاص اور مختلف اوقات کے لحاظ سے اُس کے احکام اور طبی طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں۔"

بے شک اللہ کے دین میں دوام، ہمہ گیریت اور عالم گیریت ہے۔ اور وہ کسی قوم، ملک اور زمانے تک محدود نہیں اور وہ جن عبادات و طاعات کی تلقین کرتا ہے، اُن میں اُتنی ہی عمومیت ہے، جتنی خود انسانیت میں، کیونکہ وہ انسانیت کے جبلی تقاضوں کا خیال رکھتا ہے اور اُنہیں کی اصلاح و تزکیہ چاہتا ہے، لیکن اللہ کے دین کی یہ عمومیت مخصوص شرائع کی تدوین و ترتیب کے منافی نہیں اور یہ اس لئے کہ

"اللہ تعالیٰ گو زمان و مکان سے بلند و برتر ہے، لیکن کسی نہ کسی نہج اور کسی نہ کسی وجہ سے اُس کو زمان و مکان سے ربط و تعلق ہوتا ہے۔"[1]

چنانچہ کسی خاص زمان و مکان سے اللہ تعالیٰ کے ربط و تعلق سے شرائع وجود میں آتے ہیں، اور اِن کے نزول میں "زیادہ تر اعتبار ان امور کا ہوا کرتا ہے، جن پر لوگوں کی نشأۃ ہوا کرتی ہے اور جن کی طرف اُن کی عقلیں سوچ سمجھ کر یا بلا سوچے سمجھے منتقل ہوا کرتی ہیں۔"

شاہ صاحب فرماتے ہیں "معلوم ہونا چاہیئے کہ نبوت اکثر و بیشتر کسی نہ کسی ملت کے ماتحت ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ملۃ ابیکم ابراھیم (تمہارے لئے وہی دین تجویز کیا گیا ہے، جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کا تھا) اور جیسا کہ فرمایا ہے، وان من شیعتہ لابراھیم (اور نوح ہی کے طریق پر چلنے والوں میں ایک ابراہیم بھی تھے) اور

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ اُردو ترجمہ صفحہ ۲۳۰۔

اس کا راز یہ ہے کہ جب لوگ ایک عرصۂ دراز تک کسی مذہب کی پابندی کرتے چلے آتے ہیں اور اس مذہب کے شعائر کی عظمت و حرمت اُن کے دلوں میں راسخ ہو جاتی ہے اور اس کے احکام و اوامر اُن کے نزدیک اس قدر مشہور و معروف اور عام طور پر شائع ہو جاتے ہیں کہ اُن کا شمار بدیہیات میں ہو جاتا ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا[1]

جب اس ملت میں خرابیاں سرایت کر جاتی ہیں اور اُس کے نبی کی روایات میں خلط ملط ہو جاتا ہے تو دوسری نبوت آتی ہے جو اس ملت کے مشہور و معروف احکام کی تفتیش کرتی ہے۔ پھر جو احکام کہ سیاست ملیہ کے قواعد و ضوابط اور اُس کے اصول کے موافق صحیح ہوتے ہیں، اُن میں وہ کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتی بلکہ اُس کی دعوت دیتی ہے...... اور وہ اُمور جو نادرست ہوتے ہیں اور اُن میں تحریف ہو چکی ہوتی ہے اُن کو بقدر ضرورت تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور جو اُمور قابل اضافہ ہوں اُن میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، اور یہ نبی اکثر و بیشتر ان لوگوں کی پہلی شریعت کے بقیہ اُمور کو اپنے مطالب و مقاصد میں بطور استدلال پیش کرتا ہے.........“ (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۳۲)

اس طویل تمہید کے بعد — جس سے غرض دینِ اسلام جو تمام مذاہب و ادیان کی اصل ہے اور وہ ایک ہے، اُس میں اور اُس کی اساس پر مختلف زمانوں میں جو شرائع مرتب ہوئے اُن میں فرق ظاہر کرنا تھا — ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

دین اسلام کی اِس عالمگیر تعلیم کو جو تمام مذاہب و ادیان کی اصل ہے، سب سے پہلے سرزمین حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا یہ جامہ اس عالمگیر تعلیم کا ایک خاص زمان و مکان سے اُس کے ربط و تعلق کا عملی مظہر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اِس میں اُس زمان و مکان اور اہل حجاز کے طبائع و حالات کا یقیناً خیال رکھا گیا۔ اس عملی مظہر کو جسے سنت کا نام دیا گیا ہے دین اسلام کی عمومی و ابدی تعلیم کا درجہ دینا ٹھیک نہیں، لیکن اُسے جو بہر حال ایک محدود قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اس عالمگیر تعلیم کے خلاف یا اُس پر زائد سمجھنا بھی غلط ہے، سنّت اس عالمگیر تعلیم کے حجازی جامے کا نام ہے اور اس سے اس عالمگیر تعلیم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بعد میں جب اسلام دوسرے ملکوں میں پھیلا اور عربوں کے علاوہ غیر عرب قومیں بھی مسلمان ہو گئیں تو قرآن کی عمومی تعلیم اور اُس کی حجازی تعبیر کی روشنی میں فقہ کے دوسرے مذاہب وجود میں آئے۔ اب اسلام ایک

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ اردو ترجمہ صفحہ ۲۳۲

قوم اور ایک ملک تک محدود نہ رہا تھا، بلکہ دنیا کی دوسری بڑی بڑی قومیں بھی مسلمان ہو چکی تھیں۔ اس لئے ہر قوم اور ملک میں وہاں کے خاص حالات اور طبعی رجحانات کے مطابق فقہ کے مذاہب وجود میں آئے۔ ان فقہ کے مذاہب کی حیثیت شرائع اور مناہج کی ہے۔ اور قرآن مجید نے جو اُصول ومبادی بیان کیے ہیں اُن پر اصل دین مشتمل ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک وہ امام راشد جو دنیا کی تمام اُمتوں ملتوں اور قوموں کو ایک ملت اور ایک دین پر جمع کرنا چاہتا ہو، اگرچہ اُس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اُن علوم اور نیز ان کے طریقِ معاشرت کا بھی لحاظ کرے جو اُس کی اپنی قوم کے پاس موجود ہیں اور اس بارے میں وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنی قوم کے حالات کی رعایت بہت زیادہ کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بعد والوں کے لئے بھی شریعت کے مقابلے میں زیادہ تنگی و دشواری پیدا نہ کرے۔ اور کچھ نہ کچھ اُن کی عادات و رسوم کو بھی ملحوظ رکھے۔

اب دین اسلام صرف قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے حدیث قرآن ہی سے مستنبط ہے اور فقہ قرآن و حدیث دونوں سے استنباط کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید سے خود سمجھ کر (جیسے شاہ صاحب فرماتے ہیں) یا مستقل وحی سے اخذ کر کے (جیسے عام اہل علم کہتے ہیں) قرآن پر عمل کرنے کا مفصل پروگرام بنایا، جسے علمائے حدیث نے مرتب کیا، مولانا سندھی کے الفاظ میں اسلام کی تعلیم قرآن مجید میں منضبط ہے۔ اور وہ غیر متبدل ہے۔ جہاں کہیں اساسی تعلیم پر عمل ہوتا ہے، مخاطبین کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفصل قوانین بنائے جاتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک یہ سنت تھی اور اس کا صحیح ترین مجموعہ مؤطا امام مالک ہے۔ آگے چل کر قرآن مجید اور سنت پر فقہ کی بنیاد پڑی اور جیسے جیسے دوسری قومیں مسلمان ہوتی گئیں، اُن کے ہاں فقہی قوانین بنتے گئے جن میں اُن کے خصوصی طبائع وحالات کا خیال رکھا گیا۔ فقہ کا ان خطوط پر ارتقا ایک فطری بات تھی، اور ہر وہ دین جو سب قوموں اور سب زمانوں کے لئے ہے، اُس کے بنیادی اُصولوں میں ایک طرف یہ عمومیت وعالمگیریت اور دوسری طرف ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کی ضرورتوں کی رعایت لازمی ہے، فقہ کے پیش نظر یہ زمانی و مکانی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اور قرآن مجید اساسی تعلیم سے بحث کرتا ہے۔[۱]

---

[۱] ... ہر توقیت و تعیین اور ہر تقیید کسی نہ کسی نہج پر لوگوں کے حق میں ضیق اور تنگی ہے۔ اور جب ان کا سلسلہ ممتد ہو گا تو لوگوں کے لئے معاملہ اور عمل کی راہیں نہایت تنگ ہو جائیں گی۔ اور ظاہر ہے کہ احکامِ شریعت کے مکلف ادنیٰ اعلیٰ تمام ہوا کرتے ہیں..... حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۹۰

غرض دینِ اسلام مجموعہ ہے حکمت اور شریعت و فقہ[1] کا۔ حکمت دین کی عمومی حیثیت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی حکمت میں جتنی عربیت ہے اُتنی ہی عجمیت، ترکیت و فرنگیت بھی ہے۔ اس حکمت سے ایک عرب جس طرح مستفید ہو سکتا ہے، اُسی طرح دوسری قوم کا آدمی بھی جس کی زبان عربی نہ ہو، اس سے انسان میں تلاش و تفحص، نظر و فکر اور تقدم و تبدیلی کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اُسے اس محدود دنیا سے ماورائیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے اُس کی نظر کے سامنے وسیع و عمیق آفاق وا ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن حکمت کے زیرِ اثر سوچنے پر مجبور ہوتا ہے، وہ اپنی ارد گرد کی دنیا پر نظر ڈالتا ہے۔ اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور نئی نئی راہیں ڈھونڈھتا ہے، مختصراً حکمت میں عمومیت، حرکت و تقدم ہے۔

فقہ نام ہے نظام کی مدوّن شکل کا۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے، اُس کے مطابق اُسے قواعد و ضوابط بنانے پڑتے ہیں۔ اگر زندگی ان قواعد و ضوابط سے آزاد ہو جائے اور انسان کسی ایسے ضابطۂ قانون کا پابند نہ رہے، جو اُس کے اعمال کو قاعدے میں رکھے، تو اس کا نتیجہ بدنظمی اور نراج ہوتا ہے۔ فقہ کی روح حکمت ہے لیکن اُس کا ڈھانچہ عملی مظہر ہوتا ہے ایک خاص ماحول اور ایک خاص زمانے میں اُس حکمت کی تعبیر کا۔ اب حکمت میں جہاں عمومیت اور دوام ہے، وہاں فقہ میں مقامیت اور تحدید ہے۔ اور اس جہانِ آب و گل میں ہر کمال کے لئے تحدید ضروری ہے۔ چنانچہ کوئی حکمت اُس وقت تک فائدہ بخش نتائج نہیں پیدا کر سکتی، جب تک کہ وہ ایک خاص ماحول اور ایک خاص زمانے میں عملی ضابطوں کی شکل اختیار نہ کرے۔ اور اس ضمن میں اُس ماحول اور اُس زمانے کی ضرورتوں کا خیال نہ رکھے۔

غرض زندگی میں فقہ یعنی مدوّن قانون کی بھی ضرورت ہے اور حکمت کی بھی۔ اگر دونوں میں توازن اور ہم آہنگی رہے تو انسان آگے بھی بڑھتا ہے اور ماضی و حال سے بھی اُس کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ حکمت حرکت و اقدام اور فقہ اثبات و استحکام کا باعث بنتی ہے۔ اگر فقہ سے بے اعتنائی ہو، تو زندگی میں نظم و ضبط نہیں رہتا۔ اور اگر فقہ ہی فقہ زندگی پر حاوی ہو جائے تو اس کا نتیجہ جمود و قدامت پرستی اور فکر و نظر کی موت ہے۔

اب قرآن مجید جس حکمت کا حامل اور پیغامبر ہے، وہ اس کی متقاضی تھی کہ اُس میں زیادہ سے زیادہ عمومیت اور

---

[1] ...... ہر قوم و ملت کے لئے ایک سنت و شریعت اور کچھ شرائع و احکام ہوا کرتے ہیں، جن میں وہ اپنے اسلاف اور بزرگوں کی عادات و اطوار کی پیروی کرتے ہیں...... اس طرح ملت و مذہب کی بنیادیں اُستوار ہو جاتی ہیں...... حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۰۴

ہمہ گیریت ہو، لیکن دوسری طرف اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس حکمت کے اُصولوں پر قانون مدوّن ہو۔ اور اس کی تدوین میں جن لوگوں کے لئے اور جس زمانے کے لئے یہ قانون مدون ہو، اُن کی خصوصیات اور طبعی رجحانات کا خیال رکھا جاتا۔

اسلام کی تعلیمات کی عمومیت پر بحث کرتے ہوئے مولانا شبلی "الکلام" میں لکھتے ہیں:۔

مذہب کے متعلق بہت بڑی غلطی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ انبیاء کے اصول طریقۂ تعلیم کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ علم کلام کی کتابوں میں اس ضروری نکتہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، لیکن امام رازی نے مطالب عالیہ میں، ابن رشد سے کشف الادلہ میں، اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیل کے ساتھ یہ اُصول بیان کیئے ہیں، ان میں سے ضروری الذکر یہ ہیں:۔

(۱) انبیاء کو اگرچہ عوام وخواص دونوں کی ہدایت مقصود ہوتی ہے، لیکن چونکہ عوام کے مقابلے میں خواص کی تعداد اقل قلیل ہوتی ہے، اس لئے اُن کے طرزِ تعلیم اور طریقۂ ہدایت میں عوام کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے۔ البتہ ہر جگہ ضمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں، جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں ......

ابن رشد فصل المقال میں لکھتے ہیں:۔ "شریعت کا مقصود اوّلی جمہور عوام کے ساتھ اعتنا کرنا ہے۔ تاہم خواص کی تنبیہ سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاتی۔

(۲) انبیاء لوگوں کی عقل وعلم کے لحاظ سے اُن سے خطاب کرتے ہیں، لیکن اس علم وعقل کے لحاظ سے جو اکثر افراد میں پائی جاتی ہے ...... شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں ۔ اور انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اُن کی خلقی عقل کے موافق خطاب کرتے ہیں ......

(۳) سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ انبیاء تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس کے سوا، اور قسم کے مسائل اور مباحث وحقائق سے متعرض نہیں ہوتے۔ اور اس قسم کے اُمور کے متعلق جو بیان کرتے ہیں، تو انہی کی روایات اور خیالات کے مطابق۔ اور اس میں بھی استعارات ومجازات سے کام لیتے ہیں ......

(۴) ایک عام اُصول جس پر تمام انبیاء کا عمل رہا، یہ ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں، اُس کے اکل وشرب، لباس، مکان، سامان آرائش، طریقۂ نکاح، زوجین کے عادات، بیع وشرا، معاصی پر دار وگیر، فصل قضایا غرض اس قسم کے تمام اُمور پر نظر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں ویسی ہی ہیں، جیسا اُن کو ہونا چاہئے تو پھر کسی قسم کا تبدل وتغیر نہیں کرتے، بلکہ

ترغیب دلاتے ہیں کہ یہ رسوم و آئین صحیح اور واجب العمل اور مبنی علی المصالح ہیں۔ البتہ اگر ان میں کچھ نقص ہوتا ہے۔ مثلاً وہ آزار رسانی کا ذریعہ ہوں یا لذات دنیوی میں انہماک کا باعث ہوں، یا اُصول احسان کے مخالف ہوں یا انسان کو دنیاوی اور دینی مصالح سے بے پروا کر دینے والے ہوں، تو اُن کو بدل دیتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح نہیں کہ سرے سے انقلاب کر دیں، بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرتے ہیں، جس کے مشابہ کوئی چیز قوم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ بیان لوگوں کے حالات میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں، جن کو قوم اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتی آتی ہے۔ شاہ صاحب یہ اُصول نہایت تفصیل سے بیان کر کے لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے انبیاء کی شریعتیں مختلف ہیں اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح، طلاق، معاملات، آرائش، لباس، قضا، تعزیرات، غنیمت میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کی، جس کو وہ لوگ سرے سے نہ جانتے ہوں یا ایسی جس کے قبول کرنے میں اُن کو پس و پیش ہو۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جو کجی تھی سیدھی کر دی گئی اور جو خرابی تھی دفع کر دی گئی۔

(۵) انبیاء پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، اُس کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک وہ عقائد و مسائل جو مذہب کے اُصول کلیہ ہوتے ہیں۔ اس حصے میں تمام شریعتیں متحد ہوتی ہیں۔ مثلاً خدا کا وجود، توحید، ثواب، عقاب، شعائر اللہ کی تعظیم، نکاح، وراثت وغیرہ۔ دوسرے وہ احکام اور سنن جو خاص خاص انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور جن کی بناء پر کہا جاتا ہے کہ شریعت موسوی مثلاً شریعت عیسوی سے مختلف ہے، شریعت کا حصہ خاص خاص ملکوں اور قوموں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اُس کی بنیاد زیادہ تر ان خیالات، عقائد، عادات، معاملات رسوم، طریق معاشرت اور اُصول تمدن پر ہوتی ہے، جو پہلے سے اس قوم میں موجود تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔ "اسی طرح شریعت میں ان علوم اور اعتقادات و عادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو قوم میں مخزون اور جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا اور بنی اسماعیل پر حرام نہ ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہود کے ہاں نہیں۔"

آگے چل کر مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اُصول تمام انبیاء میں مشترک ہوتے ہیں، لیکن جس نبی کی رسالت عام ہوتی ہے اور تمام عالم کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوتا ہے اُس کی ہدایت اور تلقین میں بھی بعض زائد خصوصیات ہوتی ہیں، جو اور انبیاء میں نہیں پائی جاتیں۔ اس اُصول کی وضاحت شاہ ولی اللہ صاحب رح یوں

فرماتے ہیں:۔ "یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے، اس کو اور چند اصولوں کی جو اصول مذکورہ بالا کے علاوہ ہیں، حاجت پڑتی ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر چلاتا ہو، اس کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کو پاک بنا دیتا ہے۔ پھر اُس کو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اُس کی شریعت کی اصل بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو۔ اس کے ساتھ خاص اُس کی قوم کے عادات اور مسلّمات کے اصول بھی لیے جائیں اور اُن کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوائے قوم کو ہر زمانے میں یہ اجازت دی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنا لیں۔ اس سے تو شریعت کا جو مقصود ہے وہ بھی فوت ہو جائے گا۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا پتہ لگایا جائے اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ خاص اس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔"

اس کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اس اُصول سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ شریعتِ اسلامی میں چوری، زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، اُن میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔ (یہاں مولانا شبلی کا بیان ختم ہوتا ہے)

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں اُس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ رکھا گیا ہے جس میں وہ نازل ہوا، اور جو اُس کے اولین مخاطبین تھے، لیکن اس سے قرآن مجید کی عمومیت اور ہمہ گیریت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ ایسے احکام جو ان عادات اور حالات کی بنا پر ہوتے ہیں، اُن کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مولانا سندھیؒ اس بارے میں فرماتے تھے کہ قرآن میں کہیں کہیں جو اس قسم کے احکام ہیں، اُن کی حیثیت ایک عملی مثال کی ہے، یعنی عرب کے اُن حالات میں قرآن مجید کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔

مولانا سندھیؒ کے نزدیک وہ علماء جن کے پیش نظر عام انسانیت کی مجموعی ترقی اور بہبود ہوتی ہے، وہ انبیاء کی تعلیمات کے عمومی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور اُن کے ہاں انبیاء کے وہ احکام اور قوانین جو کسی خاص قوم اور ایک خاص زمانے

مخصوص حالات کے تحت مرتب ہوتے ہیں، وہ عالمگیر اور دائمی نہیں ہوتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا شمار انہی علماء میں ہوتا ہے۔ آپ نے اوّل تو تمام انبیاء کی تعلیمات کی مشترکہ اساس متعین کی، جو آپ کے نزدیک انسانیت عامہ کے مطابق ہے اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی اس حکمت کو ماننے سے میرے دل پر یہ اثر ہے کہ اگر میں کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو، یا اس شخص کو جو کسی مذہب کو سرے سے نہیں مانتا" انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود کا کام کرتا دیکھوں، تو میرے دل میں اُس کی عزت اور محبت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کی حکمت سے میں یہ سمجھا ہوں کہ انبیاء کی تعلیم کا اصل مقصد انسانیت کی بھلائی اور ترقی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خدمت سر انجام دیتا ہے، تو میں اُس سے کیسے نفرت کروں"۔

غرض حکمت عام ہے اور وہ انسانیت عامہ کی اساس ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر جو قانون بنتا ہے، اُس میں احوال و ضروریات ملحوظ ہوتی ہیں۔ بقول مولانا سندھی:- ایک خاص زمانے میں جو نظام بروئے کار آتا ہے، وہ آخری نہیں ہوتا۔ وہ انسان کو زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں جانے کے قابل بناتا ہے۔ جہاں تک اس خاص مرحلے کا تعلق ہوتا ہے، اُس کے لحاظ سے تو اس نظام کی حیثیت آخری ہوتی ہے، لیکن مجموعی انسانیت کے لئے یہ ایک مثال یا نمونہ ہوتا ہے۔ لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کُلی حقیقت کا مرادف سمجھ لیتے ہیں اور ہر زمانہ اور ہر قوم و ملک میں اس نظام کو بجنسہٖ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے ذہین طبقوں میں اس نظام سے بے دلی پیدا ہونے لگتی ہے جسے غلطی سے اُس اصل اُصول سے بے دلی سمجھا جاتا ہے، جس کا یہ نظام ایک عملی مظہر ہوتا ہے۔ اب اگر نظام کو ایک مثال کی حیثیت دی جاتی اور افراد کو اجازت ہوتی کہ وہ اس نظام کے اندر رہ کر اُس کو ضرورتوں کے مطابق بدل سکتے اور زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُس میں بھی ارتقا ہوتا، تو انسانیت شاہراہِ ترقی پر برابر گامزن رہتی۔ زندگی آگے بڑھ رہی ہے اور آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حد تک تسلسل بھی چاہتی ہے، اگر نظام میں تغیر و تبدل کا یہ راستہ اختیار کیا جائے تو زندگی کا تسلسل بھی قائم رہتا ہے اور ترقی بھی نہیں رُکتی۔

حکمت اور فقہ دین کے دونوں جزو ہیں، اور زندگی میں دونوں کی ضرورت ہے، لیکن اگر فقہ کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور اُسے اُسی شکل میں قائم رکھنے پر اصرار ہو، جو ایک زمانے میں اُس کی متعین ہوئی تھی، تو نہ صرف ایسی فقہ حکمت سے بے تعلق ہو جائے گی بلکہ عملی زندگی میں اُس کی کوئی جگہ نہیں رہے گی۔

فرماتے ہیں :- "یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے، اس کو اور چند اصولوں کی جو اصول مذکورہ بالا کے علاوہ ہیں، حاجت پڑتی ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہو اس کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کو پاک بنا دیتا ہے۔ پھر اُس کو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اُس کی شریعت کی اصل بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو۔ اس کے ساتھ خاص اُس کی قوم کے عادات اور مسلمات کے اصول بھی لیئے جائیں اور اُن کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوائے قوم کو ہر زمانے میں یہ اجازت دی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں۔ اس سے تو شریعت کا جو مقصود ہے وہ بھی فوت ہو جائے گا۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا پتہ لگایا جائے اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ خاص اس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔"

اس کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اس اصول سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ شریعتِ اسلامی میں چوری، زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، اُن میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔ (یہاں مولانا شبلی کا بیان ختم ہوتا ہے)

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں اُس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ رکھا گیا ہے جس میں وہ نازل ہوا اور جو اُس کے اولین مخاطبین تھے، لیکن اس سے قرآن مجید کی عمومیت اور ہمہ گیریت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ ایسے احکام جو ان عادات اور حالات کی بنا پر ہوتے ہیں، اُن کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مولانا سندھیؒ اس بارے میں فرماتے تھے کہ قرآن میں کہیں کہیں جو اس قسم کے احکام ہیں، اُن کی حیثیت ایک عملی مثال کی ہے، یعنی عرب کے اُن حالات میں قرآن مجید کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔

مولانا سندھیؒ کے نزدیک وہ علماء جن کے پیش نظر عام انسانیت کی مجموعی ترقی اور بہبود ہوتی ہے، وہ انبیاء کی تعلیمات کے عمومی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور اُن کے ہاں انبیاء کے وہ احکام اور قوانین جو کسی خاص قوم اور ایک خاص زمانے

مخصوص حالات کے تحت مرتب ہوتے ہیں، وہ عالمگیر اور دائمی نہیں ہوتے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا شمار انہی علماء
ہوتا ہے۔ آپ نے اوّل تو تمام انبیاء کی تعلیمات کی مشترکہ اساس متعین کی، جو آپ کے نزدیک انسانیت عامہ کے مطابق
اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی اس حکمت کو ماننے سے میرے دل پر یہ اثر
ہے کہ اگر میں کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو، یا اس شخص کو جو کسی مذہب کو سرے سے نہیں مانتا، انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود
م کرتا دیکھوں، تو میرے دل میں اُس کی عزت اور محبت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کی حکمت سے میں یہ
ا ہوں کہ انبیاء کی تعلیم کا اصل مقصد انسانیت کی بھلائی اور ترقی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خدمت سرانجام دیتا ہے، تو
اُس سے کیسے نفرت کروں۔

غرض حکمت عام ہے اور وہ انسانیت عامہ کی اساس ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر جو قانون بنتا ہے، اُس میں ماحول
ضروریات ملحوظ ہوتی ہیں۔ بقول مولانا سندھی:۔ ایک خاص زمانے میں جو نظام بروئے کار آتا ہے، وہ آخری نہیں
ا۔ وہ انسان کو زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں جانے کے قابل بناتا ہے۔ جہاں تک اس خاص مرحلے کا
ق ہوتا ہے، اُس کے لحاظ سے تو اس نظام کی حیثیت آخری ہوتی ہے، لیکن مجموعی انسانیت کے لئے یہ ایک مثالی یا نمو
ہے۔ لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کُل حقیقت کا مرادف سمجھ لیتے ہیں اور ہر زمانہ اور ہر قوم و ملک
اس نظام کو بجنسہٖ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے ذہین طبقوں میں اس نظام سے بے دلی پیدا ہونے
ہے، جسے غلطی سے اُس اصل اُصول سے بے دلی سمجھا جاتا ہے، جس کا یہ نظام ایک عملی مظہر ہوتا ہے۔ اب اگر نظام کو ایک
ل کی حیثیت دی جاتی اور افراد کو اجازت ہوتی کہ وہ اس نظام کے اندر رہ کر اُس کو ضرورتوں کے مطابق بدل سکتے اور
نے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُس میں بھی ارتقا ہوتا، تو انسانیت شاہراہِ ترقی پر برابر گامزن رہتی۔ زندگی آگے بڑھ رہی ہے
ر آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک حد تک تسلسل بھی چاہتی ہے، اگر نظام میں تغیر و تبدل کا یہ راستہ اختیار کیا جائے تو
رگی کا تسلسل بھی قائم رہتا ہے اور ترقی بھی نہیں رُکتی۔

حکمت اور فقہ دین کے دونوں جزو ہیں، اور زندگی میں دونوں کی ضرورت ہے، لیکن اگر فقہ کو سب کچھ سمجھ لیا جائے،
ر اُسے اُسی شکل میں قائم رکھنے پر اصرار ہو، جو ایک زمانے میں اُس کی متعین ہوئی تھی، تو نہ صرف ایسی فقہ حکمت سے
ادامن ہو جائے گی بلکہ عملی زندگی میں اُس کی کوئی جگہ نہیں رہے گی۔

حضرت ابوہریرہؓ اور مستشرقین

استاذ محمد عرفہ وکیل کلیۃ الشریعۃ جامعۃ الازہر[1]

مستشرق گولڈسیہر نے دائرہ المعارف الاسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) مجلد اول عدد ہفتم میں جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں چند خیالات کا اظہار کیا ہے جن کی کوئی تاریخی و علمی حیثیت نہیں۔ ہم یہاں مستشرق مذکور کے یہ خیالات نقل کرتے ہیں اور بعد میں اُن پر محاکمہ کرکے بتائیں گے کہ وہ کس قدر بے سروپا ہیں۔

گولڈسیہر دائرۃ المعارف اسلامیہ کے عدد ہفتم ص۴۱۸ میں حضرت ابوہریرہ کے ذکر میں لکھتا ہے۔

"اُن کا احادیث کو روایت کرنے کا طریقہ جن میں کہ معمولی سے معمولی چیزوں کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے، بتاتا ہے کہ اُن میں ظرافت و مزاح کی روح تھی، اور یہی بات بہت سے مروی شدہ قصوں کا سبب بنی ہے (ابن قتیبہ[2]) نیز اُن کا احادیث کا وسیع علم، جو اُنہیں ہمیشہ یاد رہتی تھیں (مسند امام احمد بن حنبل ۲۱۴ صفحوں سے زیادہ پر ابوہریرہؓ کی مروی شدہ احادیث ہیں) اُن لوگوں کے دلوں میں بھی جنہوں نے خود اُن سے براہ راست احادیث روایت کی ہیں، شک شبہ پیدا کر دیتا تھا۔ اور اُنہوں نے تمسخر کے انداز میں اپنے ان شکوک کے اظہار میں تردد نہیں کیا (دیکھئے البخاری فضائل الاصحابؓ) بدیں وجہ اُنہیں بعض دفعہ لوگوں کی اِن باتوں کے متعلق جو وہ اُن کے بارے میں کرتے تھے، اپنی مدافعت کرنی پڑی۔ یہی احالات ہیں، جن کی بناپر ابوہریرہؓ کی احادیث کے معاملے میں ہمارا موقف احتیاط و شک کا ہو جاتا ہے۔"

---

[1] جامعہ ازہر قاہرہ کی کلیہ شریعۃ (شریعت کالج) کے وکیل (نائب پرنسپل) کا یہ مضمون قاہرہ کے دینی رسالے نور الاسلام میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کی علمی افادیت کے پیش نظر مولانا محمد اسمٰعیل بن مولانا محمد صادق مرحوم مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے ——— (مدیر)

شپرنگر ابوہریرہؓ کے ذکر میں لکھتا ہے کہ "وہ نیکی کے جذبے کے تحت احادیث کو وضع کرنے میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بہت سی حدیثیں جو اُن سے منسوب ہیں، بعد کے زمانے میں مصر میں وضع ہوئی ہیں"۔

حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں یہ جو بات کہی گئی ہے اُس میں آپ پر کئی مطاعن و اعتراضات وارد ہوتے ہیں، در رہ سب اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ احادیث کی روایت میں امین نہ تھے۔ چنانچہ گولڈ سیہر کا کہنا ہے کہ وہ حدیثیں وضع کرتے تھے اور اس میں حد سے متجاوز تھے اور وہ یہ سب نیکی و ورع کے جذبے کے تحت کرتے تھے۔ نیز جن لوگوں نے خود اُن سے احادیث روایت کی ہیں، وہ بھی ان روایتوں میں شک کرتے تھے اور اپنے ان شکوک کا اظہار اُنہوں نے استہزائی انداز میں کیا ہے۔ اور یہ کہ اُن کی روایتوں میں معمولی معمولی چیزوں کا ذکر بڑے مؤثر اسلوب میں کیا گیا ہے، جو اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُن میں ظرافت و مزاح پایا جاتا تھا اور یہی بات بہت سے قصوں کے ظہور کا باعث بنی ــــ حضرت ابوہریرہؓ پر اِن اعتراضات کا موجد مصنف اپنے ثبوت میں بعض اسلامی کتابوں کا حوالہ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے اعتراضات کو ایک دل کش جامے میں پیش کرکے لوگوں کے دل میں یہ ڈال سکے کہ اُس کے اعتراضات صحیح ہیں۔ اس طریقۂ بحث میں فریب اور ملمع سازی ہے۔ ہم خدا کی توفیق سے اس فریب کا پردہ چاک کریں گے۔

ابوہریرہؓ جن پر اُنہوں نے یہ رکیک حملے کیے ہیں اور جن کی طرف اس قسم کی بے سروپا باتیں اُنہوں نے منسوب کی ہیں وہ ایک جلیل القدر صحابی تھے اور روایت میں تمام صحابہ سے بڑھے ہوئے تھے، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ابن عمرؓ کے سوا سب سے روایات میں بڑھے ہوئے تھے، اس بحرِ علم پر جرح کرنا جو علم سے بھرپور تھے۔ پھر اُنہوں نے اُنہیں علم سونپا جو اُن سے اسے اخذ کرنے آئے اور ان سے پھر ہم تک پہنچا، دراصل اس بے پایاں علم کو مجروح کرنا ہے، اور اس کی تمام مرویات سے اعتماد کو ختم کرنا ہے۔ یہ بڑی خرابی کا باعث ہے۔ پھر بھی اگر اس اعتراض کی کوئی صحیح وجہ ہوتی تو اس کو برداشت کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ طعن و اعتراض سرتاسر باطل ہے، اور اس میں کوئی صداقت نہیں۔

امام بخاری کے قول کے مطابق اس امام سے آٹھ سو علماء نے روایت کی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سب ان پر پورا اعتماد کرتے تھے، اس لئے کہ اگر ان سب کا اعتماد ان پر نہ ہوتا تو وہ کبھی ان سے روایت نہ کرتے۔ حضرت ابوہریرہؓ پر تمام صحابہ اور محدثین کو پورا پورا اعتماد تھا جیسا کہ آنے والے اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ابوہریرہؓ مجھ سے بہتر ہیں اور جو روایت کرتے ہیں اس کا انہیں بخوبی علم ہے۔ طلحہؓ بن عبیداللہ (عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں) فرماتے ہیں کہ بلاشبہ ابوہریرہؓ نے حضورؐ سے وہ کچھ سنا ہے جو ہم نے نہیں سنا۔ نسائی کی روایت کہ ایک شخص زیدؓ بن ثابت کے پاس آیا اور ان سے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا۔ زیدؓ نے فرمایا تم ابوہریرہؓ سے دریافت کرو، کیونکہ ایک مرتبہ میں ابوہریرہؓ اور ایک اور شخص مسجد میں بیٹھے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے تھے۔ اور اس سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے آئے اور ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ اب ہم خاموش ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا تم جو ذکر کر رہے تھے وہ کرتے رہو۔ زیدؓ نے فرمایا کہ میں نے اور میرے ساتھی نے ابوہریرہؓ سے پہلے دعا کرنی شروع کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری موافقت فرماتے رہے۔ پھر ابوہریرہؓ نے دعا کی اور کہا۔ اے اللہ! میں تم سے وہی دعا مانگتا ہوں جو میرے دونوں ساتھیوں نے مانگی، اور میں ایسا علم بھی اللہ تعالیٰ سے چاہتا ہوں جو بھولے نہیں۔ آپؐ نے فرمایا آمین۔ اس پر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم بھی اللہ تعالیٰ سے ایسا علم چاہتے ہیں جو بھولے نہیں، آپؐ نے فرمایا یہ دوسی لڑکا تم پر سبقت لے گیا۔

اُن کا حافظہ نہایت عمدہ تھا، جس کی وجہ سے وہ احادیث کو بہت اچھی طرح ضبط کرتے تھے۔ اس کی گواہی قابل اعتماد علماء دے رہے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ابوہریرہؓ اپنے زمانے کے راویان حدیث میں احفظ (زیادہ حافظہ والا) تھے۔ اعمش ابوصالح سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے کہا:۔ ابوہریرہؓ صحابہ میں سب سے احفظ تھے۔ ابوزعیزعۃ (مروان کے سیکرٹری) کہتے ہیں کہ مروان نے ایک مرتبہ ابوہریرہؓ کو بُلایا، وہ آ کر احادیث بیان فرمانے لگے۔ مروان نے مجھے پلنگ کے پیچھے بٹھا دیا تھا اور وہ جو احادیث بیان فرماتے گئے میں لکھتا گیا۔ جب دوسرا سال شروع ہوا تو مروان نے پھر انہیں بلایا اور کہا کہ آپ وہ احادیث بیان فرمائیں اور مجھے حکم دیا کہ میں دیکھتا جاؤں، جب میں نے دیکھا تو ان میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں جنہیں ہم طول دینا نہیں چاہتے۔ انہیں قارئین اسماء الرجال کی کتابوں میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔

یہ ثقہ علماء کی آراء ہیں اور جس کی اُنہوں نے توثیق کی، وہ قابل اعتماد ہے۔ اور اس پر جرح نہیں کی جا سکتی، اور جس کی اُنہوں نے توثیق نہ کی، وہ ایسا کھوٹا ہے جس پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔ جس کے حصے میں ان علماء اور افاضل کی تعریف ہو اس کے بعد اس کے بارے میں جو بھی کہا جائے وہ لغو اور لایعنی ہوگا، جس سے اسے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ اس ضمن

میں یہ اجمال کافی تھا۔ لیکن ضروری ہے کہ ہم وہ اعتراضات و مطاعن کا تفصیلی جائزہ لے کر ان کا خاتمہ کردیں۔

اصحاب دائرہ معارف اسلامیہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے احادیث کے وسیع علم نے ان لوگوں کے دلوں میں بھی شکوک ڈال دیئے جنہوں نے ان سے احادیث روایت کیں اور یہ کہ انہوں نے اپنے ان شبہات کے اظہار میں کوئی تردد نہ کیا اور پھر قارئین کے لئے بخاری کی کتاب فضائل الاصحاب ۱۱ کا حوالہ دیا ہے۔ ان کا مطلب بخاری کی اس حدیث سے ہے جو ابوسعید المقبری نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں:۔ ابوہریرہؓ بہت روایت کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں تو حضورؐ کے ساتھ ہر وقت بھرے پیٹ رہتا تھا۔ اس حالت میں کہ نہ میں خمیری روٹی کھاتا تھا اور نہ ہی میں کڑھی ہوئی چادر پہنتا تھا۔ نہ میرا کوئی خادم تھا نہ خادمہ۔ اور میں بھوک کی وجہ سے پیٹ سے پتھر باندھ لیتا تھا۔ الحدیث۔

یہی بخاری کی وہ حدیث ہے جس کو اصحاب دائرہ معارف اسلامیہ نے ابوہریرہ پر طعن و اعتراض کی بنیاد بنایا ہے۔ اور ایک انصاف پسند شخص اس حدیث سے اچھی طرح جان سکتا ہے کہ اصل بات یہ ہے بعض لوگوں نے کہا کہ ابوہریرہؓ بہت روایت کرتا ہے اور جب یہ انہوں نے ان کے حافظہ اور کثرت روایت پر تعجب کرتے ہوئے کہا اور ان کو یہ حق تھا کہ وہ اس پر تعجب کرتے اور یہ اس لئے کہ ابوہریرہؓ نے حضورؐ کی صحبت میں گو صرف تین سال گذارے تھے لیکن ان سے روایت میں سب سے زیادہ تھے۔ اور تعجب کرنے والے کو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس سے سبب بیان کیا جائے اور جبکہ سبب ظاہر ہو جائے تو تعجب ختم ہو جاتا ہے، پھر جب انہوں نے اپنی کثرتِ روایت اور زیادتی حفظ کی وجہ ان پر ظاہر کی اور بتایا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اور اپنے پیٹ سے مارے بھوک کے پتھر باندھ رکھتے تھے اور انہیں کوئی تجارت یا زراعت حضورؐ کی خدمت سے نہیں روکتی۔ بدیں وجہ انہوں نے وہ سب کچھ حفظ کرلیا جو دوسرے حفظ نہ کرسکے۔ اور جو کچھ انہوں نے سنا وہ دوسرے نہ سن سکے ۔۔ جب متعجبین پر یہ سبب واضح ہوگیا تو وہ چپ ہو رہے۔

اچھا ہم تھوڑی دیر کے لئے اصحابِ دائرہ کا یہ دعویٰ تسلیم کرلیتے ہیں کہ جب لوگوں نے کہا کہ ابوہریرہؓ بہت زیادہ روایت کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد ان پر شک کرنا تھا نہ کہ تعجب۔ مگر اس واقعہ کی تاریخ کا واقف اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ جب انہوں نے سبب واضح کردیا تو وہ خاموش ہوگئے، اور انہیں روایت کرنے سے نہ روکا بلکہ ان سے خود روایت

بھی کرنے لگے، اب اگر اُن کا شک قائم رہتا تو انہیں روایت کرنے سے ضرور روک دیتے اور ان سے روایت بھی نہ کرتے۔ غرض یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ صحابہ کس قدر روایتوں کا اہتمام کرتے تھے۔ اور انہیں کتنی احتیاط اس بارے میں تھی۔ اس احتیاط اور چھان بین سے انہیں کوئی امر مانع نہ ہوتا تھا۔ اس لئے جب اُنہوں نے دیکھا کہ ابوہریرہؓ کا زمانہ صحبت کم ہے اور جب اُن کی روایات بکثرت ہیں تو انہوں نے بلا کسی رورعایت کے ابوہریرہؓ پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا اور جب ابوہریرہؓ نے اس کی معقول وجہ بتائی تو اُنہوں نے تسلیم کر لیا اور انہیں روایت حدیث سے نہ روکا بلکہ خود بھی آپ سے روایت کرنے لگے۔ ایک حضرت علیؓ کی مثال لیجئے کہ وہ ہمیشہ اُس شخص کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتا قسم دیتے تھے اور جب وہ حلف اُٹھا لیتا تو اسے سچا سمجھتے تھے۔

اگر اصحابِ دائرہ اس حدیث سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے ابوہریرہؓ سے روایت کی انہیں خود بھی ان پر شک تھا، جسے اُنہوں نے استہزا آمیز انداز میں ظاہر کیا، تو کیا اُن پر یہ واجب نہ تھا کہ وہ ابوہریرہؓ کو روایت حدیث سے روک دیتے۔ حالانکہ وہ اپنی پوری زندگی روایت کرتے رہے اور وہ حضورؐ کے بعد تقریباً پچاس سال زندہ رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے ابوہریرہؓ کی دلیل مان لی تھی اور جب اُنہوں نے ان سے کثرتِ روایت کا سبب بیان کر دیا تو ان کے دلوں میں جو خلش تھی وہ دور ہو گئی۔ ابوہریرہؓ اور عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ اور عائشہؓ کے مابین جو واقعات ہوئے تھے، وہ ہم گولڈ سیہر سے زیادہ جانتے ہیں، لیکن جب روحِ تاریخ کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اُن کی توثیق کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ان کی روایات میں کوئی خرابی سمجھتے تو انہیں روایات بیان کرنے سے روک دیتے اور لوگوں سے انہیں دور رکھتے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ حضرات تھے جو حدیث رسولؐ کی پوری حفاظت کرتے تھے۔ اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ حدیث میں لوگ کوئی وسعت نہ کرلیں، اور یہ کہ حدیث میں ملاوٹ اور کذب وغیرہ نہ داخل ہو جائے۔ اور مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ ابوہریرہؓ کی احادیث میں معمولی معمولی اشیاء کا مؤثر اسلوب میں ذکر ہے اور یہ اُن کی روحِ مزاح وظرافت پر دلالت کرتا ہے اور یہی بہت سے قصوں کے ظہور کا سبب ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اس دعوے کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ ایسی بات ہے جو وہم اور گمراہی میں ڈال دیتی ہے۔

ہمیں علم نہیں کہ ابن قتیبہ نے ان مطاعن میں سے کوئی چیز ابوہریرہؓ کی طرف منسوب کی ہو۔ بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابن قتیبہ ان کی طرف سے دفاع کرتے ہیں جو اُن کی سچائی اور امانت کو واضح کرتا ہے، اور جن لوگوں نے ابوہریرہؓ پر

تنقید کی ہے جیسے نظام، اُن کا وہ رد کرتے ہیں۔ ابن قتیبہ نے ان کا جس قدر اہتمام سے ذکر کیا ہے اور ان کی عظمت اور بزرگی کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ ہم یہاں ذکر کر دیتے لیکن ان محدود صفحات میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے ہم قارئین کو ابن قتیبہ کی تالیف (تاویل مختلف الحدیث ص ۴۸ اور مابعد) کا حوالہ دیتے ہیں کہ وہ پوری تفصیل سے اس کا مطالعہ کریں۔

اور ہمیں معلوم نہیں کہ کون سی احادیث ہیں جن میں معمولی معمولی چیزوں کا ذکر ہے اور جو بہت سے قصص کے ظہور کا باعث ہوئیں۔ اصحاب دائرہ پر لازم تھا کہ وہ اس کی وضاحت کرتے تاکہ ان پر گفتگو کی جاتی اور جب اُنہوں نے ابن قتیبہ کا حوالہ دیا ہے تو اس کتاب کا نام لیتے کہ وہ کون سی کتاب ہے۔ ابن قتیبہ کی تو کئی مؤلفات ہیں جن میں سے کئی طبع بھی ہو چکی ہیں، اگر وہ ابن قتیبہ کی کسی کتاب کا نام لیتے تو ہم اس کی طرف رجوع کرتے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم ان پر یہ بات واضح کر دیتے کہ اس میں وہ نہیں ہے جو وہ سمجھے ہیں۔ کیونکہ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک طرف تو ابن قتیبہ ابوہریرہؓ کی اتنی زبردست تعریف کرے اور دوسری طرف اُن سے وہ باتیں منسوب کرنے لگ جائے جیسا اصحاب دائرہ کرتے ہیں۔

باقی جو وہ اسپرنگر سے نقل کرتے ہیں کہ ابوہریرہؓ احادیث گھڑنے میں حد سے تجاوز کر گئے تھے اور یہ بطور ورع اور نیکی کے تحت تھا۔ تو ہم کسی بھی اسپرنگر یا دوسرے کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں جن کا اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ وہ حضورؐ کے اصحاب پر الزام لگاتے رہیں تاکہ مسلمانوں کو گمراہ کریں اور حقیقت اور واقعہ کو چھپائیں۔ اس ضمن میں یہ کافی تھا کہ ہم کہہ دیتے کہ یہ ایسے طعن ہیں جن کی کوئی سند نہیں۔ لیکن ہم یہاں ابوہریرہؓ کی ذہنی افتاد کو بتانا ضروری سمجھتے ہیں اور عادتاً یہ چیز ناممکن ہے کہ ایسا شخص جھوٹا ہو اور حضورؐ پر بہتان تراشی کرے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جو اس موضوع میں بڑا مفید رہے گا۔

ابوعثمان نہدی کہتے ہیں کہ میں ابوہریرہؓ کے یہاں سات مرتبہ مہمان ہوا ہوں، میں نے یہ دیکھا کہ ابوہریرہؓ، اُن کی بیوی اور اُن کا خادم رات کو باری مقرر کر لیتے تھے۔ ایک پہلے عبادت کرتا پھر دوسرے کو جگاتا پھر وہ عبادت کرتا اس کے بعد تیسرے کو جگاتا۔ اسی طرح رات گزارتے تھے۔ اُنہوں نے اور بیان کیا کہ ان کے پاس ایک دھاگہ تھا جس میں ایک ہزار گانٹھیں تھیں جب تک اس کی تسبیح نہ پڑھ لیتے سوتے نہیں تھے۔

جو شخص ایمان اور تقوی کے اس مرتبہ میں ہو کیا وہ اس بات کی جرأت کر سکتا ہے کہ ایک کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور کبیرہ گناہ بھی ایسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جھوٹ گھڑے۔ اور اسی پر مرتے دم تک مصر رہے۔

حالانکہ وہ جانتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹی روایت کرنا دین میں مفسدہ پردازی کا موجب ہے اور دین میں ایسی بات داخل کرنا ہے، جو اس میں نہیں ہے۔

مستشرقین کا یہ کہنا کہ ابوہریرہ نیکی اور ورع کے تحت حدیثیں گھڑنے میں حد سے متجاوز تھے، تو یہ ایک بے سروپا بات ہے. کیونکہ نیکی اور ورع کا تقاضا تو یہ ہے کہ آدمی عام لوگوں سے بھی غلط روایت نہ کرے، کجا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلط روایتیں کی جائیں، اور ابوہریرہؓ کس طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جھوٹی روایتیں کرسکتے ہیں، جب کہ وہ خود اس حدیث کے راوی ہیں من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار (رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا کہ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے) ابوہریرہؓ کا یہ معمول تھا کہ جب وہ کسی سے حدیث بیان کرنے لگتے، تو پہلے اوپر کی حدیث کا ذکر کرتے۔

اب جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنی ہو اور اُسے اُس نے یاد کیا ہو، پھر وہ اُسے دوسروں سے بیان کرتا ہو، اُسے وہ حدیث برابر یاد رہتی ہو اور وہ اسی کا برابر ذکر بھی کرتا رہتا ہو۔ جب وہ کسی شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرے، تو اُس سے پہلے آپؐ کی اسی حدیث کا ذکر کرتا ہو۔ پھر وہ مومن نیکوکار اور متقی ہو، کیا ایسے شخص کے لئے عادتاً محال نہیں کہ وہ رسول اللہؐ پر جھوٹ بولے اور اس میں حد سے تجاوز کرے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھے کہ آپؐ کی طرف غلط بات منسوب کرنا اور آپؐ پر جھوٹ بولنا دین اور نیکی کی بات ہے۔

باقی ان مستشرقین کا یہ کہنا کہ بہت سی حدیثیں جو ابوہریرہؓ کی طرف منسوب ہیں، بعد کے زمانے میں مصر میں گھڑی گئی ہیں اور اُنہیں غلط طور پر بڑے بڑے محدثین کی طرف منسوب کردیا گیا ہے، جیساکہ ابوہریرہؓ کی طرف، لیکن علمائے فقہ حدیث نے اس پر پوری بحث کی گھڑی ہوئی حدیثوں کا پتہ لگایا اور اُن کا جھوٹ ان علماء پر مخفی نہ رہا۔ اور اس طرح جھوٹی احادیث گھڑنے والوں کے تمام فریب بے نقاب ہوگئے۔

دائرۂ معارف اسلامیہ والوں کی اس طرح کی بحثوں سے غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اُن بزرگوں کو جن سے اُنہیں عقیدت ہے بُرے رنگ میں پیش کریں تاکہ وہ ان بزرگوں کے بارے میں اُن کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرسکیں۔ بمثال کے طور پر سید احمد بدوی[1] کو لیجئے اُن کی عفت اور نیکوکاری پر تعریض کرتے ہوئے فولرز لکھتا ہے:۔ "میں اب اس رائے کی طرف

[1] مصر کے اس مشہور و معروف بزرگ کا مزار طنطا میں ہے، اور عام اہل مصر کا ان کی طرف ایسے ہی رجوع ہے جیسے برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کا حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی طرف (مدیر)

مائل ہوں کہ وہ چپقلش جو سید احمد بدوی اور ایک عورت فاطمہ بنت بری کے درمیان وقوع پزیر ہوئی، اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے لیکن اُس پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ محض اس حد تک محدود نہیں کہ ایک سرکش بدوی اور جنگلی عورت کو ریاضت کرانا مقصود تھا۔ بلکہ یہ واقعہ اس سے زیادہ عمیق اور دوررس ہے "

علاوہ ازیں ان مستشرقین نے سید احمد بدوی کی شخصیت، عقل وخرد اور اُن کے علم پر بھی زبانِ طعن دراز کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔ " احمد بدوی کے سلوکِ تصوف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کم درجے کے درویشوں میں سے تھے، جو ہندوستان کے یوگیوں سے زیادہ ملتے ہیں، اسی طرح عقلی اور ادبی لحاظ سے بھی اُن کی شخصیت بہت معمولی ہے۔"
یہ اور اس طرح کی اور چیزیں دائرۂ معارف اسلامیہ میں سید احمد بدوی کے متعلق مرقوم ہیں۔

اب جو شخص بھی سید احمد بدوی کے سوانح حیات کا مطالعہ کرے گا، وہ دیکھے گا کہ آپ بڑے عبادت گزار تھے اکثر خاموش رہتے، اور دل کی بات کہنی ہوتی تو اشاروں سے کام لیتے۔ آپ عزلت پسند بزرگ تھے؛ اور کثرت سے روزے رکھتے تھے، وہ اور اُن کے رفقاء اکثر چھتوں (سطوح) پر عبادت کرتے، اسی لئے اُنہیں "سطوحیۃ" کا لقب دیا گیا۔ سید احمد بدوی اللہ کی محبت میں سرشار رہتے تھے۔ جس شخص کا پرہیزگاری اور زہد میں یہ حال ہو، یقیناً اُس پر مستشرقین سے جو تیر بھی پھینکے جائیں گے، وہ ناکام رہیں گے اور وہ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔

غرض اگر دائرہ معارف اسلامیہ والوں نے دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) اسی لئے مرتب کیا ہے کہ وہ اُس کے ذریعہ علوم و معارف اسلامیہ کو صحیح شکل میں پیش کریں تو یہ اس مقصد سے کتنا دور رہے۔ اس کا اندازہ ہو گیا ہو گا لیکن اگر اس دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) کی تالیف سے اُن کا مقصد اہل مغرب کی نظروں میں مسلمانوں کی حالت کو بُرے رنگ میں پیش کرنا اور عام مسلمانوں کے عقائد میں شکوک و شبہات پیدا کرنا اور اُن کے نوجوانوں کو اپنے دین سے گمراہ کرنا ہے، تو پھر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہے

میں جب کبھی بھی یہ سوچتا ہوں کہ آگے چل کر اسی دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) کی عام اشاعت ہو گی اور جدید مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خاطر اس کی طرف رجوع کریں گے، تو میں خوف کے مارے کانپ اُٹھتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر لوگوں کے سامنے ایک ایسا " دائرہ معارف اسلامیہ " ہو جسے اُن اہل علم نے مرتب کیا ہو، جن پر اُنہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ علوم و معارف اسلامیہ کو صحیح صحیح نقل کریں گے، اور پھر یہ دائرہ (انسائیکلوپیڈیا)

ایسی زبان میں ہو، جسے جمہور سمجھ سکیں، تو یہ جو دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) مستشرقین کا مرتب کردہ ہے، اس کے مضر اثرات کم ہو سکتے ہیں۔

لیکن جب لوگوں کے سامنے اس قسم کا کوئی دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) نہیں اور اسلامی علوم پر جو کتابیں ہیں، وہ سوائے اُن کے جنہیں اُن کے مطالعہ کی مشق ہے، دوسروں کے لئے مشکل ہیں، اور پھر وہ اِس دور کے آسان انداز میں جو آج کی روحِ عصر سے مناسب ہو، لکھی بھی نہیں گئیں، اس پر مستزاد یہ کہ وہ متفرق ہیں، مجتمع نہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے نوجوانوں کے سامنے نہ صرف اس دور میں بلکہ آئندہ ادوار میں بھی اسلامی معلومات کے لئے لے دے کے صرف یہی دائرہ (انسائیکلوپیڈیا) مرجع رہ جاتا ہے اور اس میں جو اغلاط ہیں، چند کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔

موجودہ دائرہ معارف اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) کے ضرر کی کس طرح تلافی ہو یا اُسے کس طرح کم کیا جائے، میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ اس بارے میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس وقت جب کہ اس انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت ہو رہی ہے، بس یہی ہو سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ کرنے والوں کے ساتھ ایک یا دو عالم منسلک ہوں، اور ترجمے کی طباعت و اشاعت سے پہلے یہ اُسے دیکھ لیا کریں، اور اگر وہ کہیں معلومات میں غلطی دیکھیں تو انسائیکلوپیڈیا کے اُسی مضمون کے حاشیے میں صحیح معلومات کا اندراج کر دیا جائے اس سے دو فائدے ہوں گے ایک یہ کہ نقلِ معلومات میں دیانت و امانت رہے گی، دوسرے موجودہ اور آیندہ نسلوں کے سامنے معلومات کی تصحیح ہو جایا کرے گی۔

"حکمت الہٰی نے افراد کی طرح جماعتوں کی زندگی و قیام کے لئے بھی ایک خاص نظام مقرر کر دیا ہے۔ اور اُسی کے مطابق ایک جماعت کی جگہ دوسری جماعت سے اور ایک قوم کی زندگی دوسری قوم کی زندگی سے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ افراد کے نظامِ حیات کی طرح جماعات کا نظامِ حیات بھی جدوجہد، سعی و طلب اور فکر و عمل کی صلاحیت کا نظام ہے اور یہاں بھی بقائے انفع کا قانون کام کر رہا ہے۔"

الاسلام دین الاشتراکیۃ

محمد سرور

یہ کتاب مجموعہ ہے چند تقریروں کا، جو قاہرہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوئیں، اور بعد میں انہیں کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ حضرات مقررین میں علمائے دین بھی ہیں اور جدید درسگاہوں کے پروفیسر بھی۔

صدر جمال عبدالناصر کی زیر قیادت مصر میں ایک نئے معاشی نظام کا تجربہ کیا جارہا ہے جسے وہاں عربی اشتراکیت اور کبھی کبھی اسلامی اشتراکیت کا نام دیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں کمیونزم کے لئے شیوعیت کی اصطلاح ہے۔ اور سوشلزم کے لئے اشتراکیت کی اصطلاح مروج ہے۔ مصر کے اس عرب سوشلزم میں ذاتی ملکیت بحال رکھی گئی ہے، اور چھوٹے پیمانے کے کاروبار بھی افراد کی ملکیت ہیں۔ اسی طرح اراضی کسانوں کے پاس رہنے دی گئی ہے، البتہ بڑی زمینداریاں ختم کردی گئی ہیں، لیکن بڑی بڑی صنعتیں اور سکنی جائدادیں، بڑے بڑے تجارتی ادارے، یہاں تک کہ اخبارات بھی قومیا[1] لیے گئے ہیں۔ یہ ہے مصر کا عرب سوشلزم۔ زیر نظر کتاب پر مشتمل تقریروں میں اسی سوشلزم کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام دین اشتراکیہ ہے۔

کتاب کے مرتب احمد فراج تمہید میں لکھتے ہیں کہ عہد قدیم سے لے کر اب تک، جو بھی فلسفے اور اقتصادی و اجتماعی نظام وجود میں آئے ہیں، اُن سب میں اقتصادی مسئلے کی حیثیت بنیادی پتھر کی رہی ہے اور یہ کہ گو تاریخ کے ایک خاص دور میں پوری دنیا میں "آزاد کاروبار" کا مسلک غالب رہا ہے لیکن اب کچھ عرصہ سے اشتراکیت کی طرف زیادہ توجہ ہے، اور اسے اقتصادی مشکلات کو حل کرنے اور پیداوار کو بڑھا کر اقوام عالم کو خوش حال بنانے کا وسیلہ قرار دیا جارہا ہے۔ مرتب کا کہنا ہے کہ اس وقت اشتراکیت کی متعدد عملی تعبیریں ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر روسی اشتراکیت بعض امور میں

[1] قومی ملکیت میں لینے کے اس عمل کو "تاميم" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی کسی چیز کو امت کے لئے بنانا۔

چینی اشتراکیت سے مختلف ہے۔ اسی طرح یوگوسلاوی اشتراکیت کی اپنی جُدا نوعیت ہے۔ اور برطانوی لیبر پارٹی کی اپنی اشتراکیت ہے۔ موصوف کے الفاظ میں: اشتراکیت کی عملی تعبیروں کا یہ اختلاف اُن ملکوں کے مخصوص حالات کی رو سے ہے جہاں یہ نظام بروئے کار آیا ہے۔ اسی سلسلے میں مرتب لکھتے ہیں کہ جو ملک اقتصادی و سیاسی لحاظ سے کافی ترقی کر چکے تھے، اُن کے ہاں تو اشتراکی تعلیمات کے زیر اثر بعض مفید اصلاحات ہوئیں، لیکن جو ملک اقتصادی و سیاسی لحاظ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اُنہیں اصلاحِ احوال کے لئے انقلاب (ثورۃ) کو ذریعہ بنانا پڑا ہے۔ اسی قسم کا انقلاب ۱۹۵۲ء میں مصر میں ہوا، اور ایک اشتراکی ڈیموکریٹی (دیموقراطی) اور تعاونی معاشرہ کی تعمیر قوم کا نصب العین بنا۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس معاشرے کی تعمیر کے اُصول اور اُس کے لئے محرک جذبہ کہاں سے آئے؟ مرتب لکھتے ہیں کہ جہاں تک علمی اشتراکیت (اس سے مراد روسی و چینی اشتراکیت ہے) کا تعلق ہے، اُس کے ہاں انفرادی ملکیت کی اجازت نہیں اور پیداوار کے تمام ذرائع حکومت کی ملکیت ہیں، لیکن ہماری اشتراکیت انفرادی ملکیت کی نہ صرف اجازت دیتی ہے، بلکہ اُس کا احترام کرتی ہے، البتہ وہ اس حق پر چند پابندیاں عائد کرتی ہے۔ چنانچہ ہر فرد پرائیویٹ سیکٹر (قطاع خاص) میں اپنی اقتصادی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا ہے، اس کے ساتھ ہی عام بہبود کے ادارے جن کا تعلق پبلک سیکٹر (قطاع عام) سے ہے، وہ پوری قوم کی ملکیت ہیں۔ یعنی انفرادی ملکیت سے جب مصلحت عامہ پر زد پڑے، تو اس وقت ہم اُس پر پابندیاں عائد کرتے ہیں تاکہ اس کی وجہ سے اجارہ داریاں نہ پیدا ہوں اور لوگوں کو ایک سے مواقع ملنے میں رُکاوٹ نہ ہو۔ الغرض ہمارے نظام میں بعض اشتراکی خصوصیات ہیں اور بعض سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات، اور ہم نے ان دونوں میں ہم آہنگی و مطابقت پیدا کی ہے۔ ہمارے معاشرے نے فرد کی شخصیت کو ختم نہیں کیا، اور نہ اُسے بالکل آزاد رہنے دیا گیا ہے۔

خود مرتب کے اپنے الفاظ ہیں "یہ راہِ وسط محض اس کا نتیجہ نہیں کہ ہم نے بعض چیزیں ایک نظام سے لے لیں، اور بعض دوسرے نظام سے، بلکہ یہ سرچشمہ خود اِس قوم کے ضمیر، اُس کے ورثے اور اعتقادات سے پھوٹا ہے جو تقریباً کئی سو سال تک اس قوم کی خصوصیات رہیں۔ اور یہ راہِ وسط قوم کی ماضی و حال میں باہمی عمل و ردِ عمل کی تخلیقی و حیات آفریں بازگشت ہے۔"

مرتب کے نزدیک دینِ اسلام محض ایک شخص کا ذاتی معاملہ نہیں کہ اُس کا معاشرے اور اُس کے اطوار، اور

اقتصادیات اور اُس کے مسائل سے کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ وہ مشتمل ہے ایسے احکام و قواعد پر جو ایک فرد کے ساتھ دوسرے فرد کے، اور اُس کے اپنے خاندان، معاشرے اور سلطنت کے ساتھ تعلقات کو منظم کرتے ہیں۔ مزید برآں دینِ اسلام ایک سلطنت کے دوسری سلطنت کے باہمی تعلقات اور امن اور جنگ کے تعلقات کو منظم کرتا ہے اور ایسے اُصول پیش کرتا ہے جو شرفِ انسانیت، سعادت، اور تمام لوگوں کے لئے امن اور سلامتی کو یقینی بناتے ہیں۔

جولائی ۱۹۶۱ء میں جب عربی اشتراکیت کے ان اُصولوں کو مصر میں عملی جامہ پہنایا جانے لگا تو استحصال پسند اور رجعت پرست اور جاگیردار طبقوں کے باقی ماندہ گروہوں نے ان کی مخالفت کی اور دینِ اسلام کو جو اُن کے ترکش میں آخری تیر تھا، اس کے لئے استعمال کیا، یہ سمجھتے ہوئے کہ عوام کے دلوں میں دین داری کا جذبہ موجزن ہے، اور وہ دین کے نام سے ان اقدامات کی مخالفت پر اُنہیں اُکسا سکیں گے۔ اِن کا دعویٰ تھا کہ اسلام حقِ ملکیت کو محدود کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ وہ قومیانے (تامیم) کی اجازت دیتا ہے اور نہ وہ دولت مندوں کی دولت کو جو اُنہوں نے پسینہ بہا کر کمائی تھی، قبضانے سے خوش ہے۔

اِن حالات میں یہ ضروری تھا کہ ان اُمور کے متعلق اسلام کے موقف کی نئے سرے سے وضاحت کی جاتی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ معاشرے کی اشتراکی قدروں کے تعین میں اسلام سب سے آگے تھا۔

یہاں بقول مرتب کے، ایک اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اشتراکیت ایک نیا نظام ہے جسے لوگ سو دو سو سال سے جاننے لگے ہیں۔ اس صورت میں "اشتراکیتِ اسلام" کہنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ مرتب کے نزدیک یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اُن کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی نظام میں جب اجتماعی عدل، اجتماعی کفالت اور اشتراکی عنصر کے حامل قواعد موجود ہیں۔ تو کیا اس صورت میں اُن کو جو اسلام کو ایک عقیدے اور نظام کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں کی عقلوں کے مطابق اُس زبان میں بات کریں، جسے وہ سمجھتے ہیں اور جس کے ذریعہ انہیں قائل کرنا آسان ہے۔ اس میں کوئی دغا یا فریب نہیں، بلکہ یہ آج کے زمانے کے اسلوب میں اپنی بات کہنا ہے۔

یوں اگر اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو اسلام الگ سے اقتصادی مسئلے کا کوئی حل نہیں پیش کرتا، لیکن اُس نے زندگی کے جملہ پہلوؤں سے جو عمومی بحث کی ہے، اُس میں ہمیں بے شک ایسے اُمور مل جاتے ہیں، جن کا تعلق معاملات، افراد اور معاشرے کے حقوق اور ملکیت وغیرہ سے ہے۔ چنانچہ جس طرح قرآن مجید کو ہم ایک ایسی کتاب کے طور پر نہیں لیتے

جس میں افلاک، طبائع اور عجائبات کائنات سے بحث کی گئی ہو، یا وہ علم تربیت اور سیاسیات وغیرہ کی کتاب ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کو ہم ایسی کتاب نہیں سمجھتے، جس میں اقتصادی مسائل پر بحیثیت اقتصادی مسائل کے بحث ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس میں ان سب امور کا اجمالی طور سے ذکر ہے اور وہ زندگی کا جو عمومی خاکہ پیش کرتا ہے، اس میں یہ تمام چیزیں آتی ہیں۔

اب اسلام عقیدہ و ایمان، عبادات اور اخلاق بھی ہے اور معاملات بھی۔ عقیدہ و ایمان انسان میں یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ اس کا ایک خالق و رب ہے جو بصیر و علیم ہے، اور اس سے انسان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ اس کی بارگاہ سے اچھے کاموں کا اچھا بدلہ اور برے کاموں کا برا بدلہ ملے گا۔ یہ شعور ایک صاحبِ ایمان اور صاحب عمل شخصیت کی تشکیل کرتا ہے، اور یہی صحیح معنوں میں ایک صحت مند معاشرے کی بنیاد بنتی ہے۔

عقیدہ و ایمان اور عبادات و اخلاق کے بعد اسلام کا معاملات کا جو پہلو ہے، ہماری اشتراکیت کا خاص طور سے اسی سے تعلق ہے، لیکن ہم معاملات کو پہلی تین چیزوں سے الگ نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک یہ سب ایک وحدت ہیں۔ چنانچہ جب ہم اسلام کو "دین اشتراکیت" کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد زندگی کا یہ پورا نقشہ ہوتا ہے۔ اور یوں بھی ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک روحانی دوسرا مادی۔ اور یہ عبادات میں بھی ہے اور معاملات میں بھی۔ مثال کے طور سے نماز کا مادی پہلو وہ ظاہری اعمال ہیں، جو ایک نمازی ادا کرتا ہے اور اس کا روحانی پہلو صدقِ نیت اور اللہ تعالیٰ کی طرف پوری توجہ ہے۔ اور ان مادی و روحانی دونوں پہلوؤں سے مل کر نماز کامل ہوتی ہے۔ اسی طرح مال خرچ کرنے اور ٹیکسوں کی ادائیگی کو لیجئے۔ یہ ظاہر میں سب مادی امور ہیں، لیکن ان کی ایک روحانی حقیقت بھی ہے۔ اور وہ یہ شعور ہے کہ ہم ایسا کرکے افراد کے مال میں اللہ تعالیٰ اور معاشرے کے جو حقوق ہیں وہ ادا کر رہے ہیں۔

مختصراً مرتب کے نزدیک اس کتاب کے مندرج مباحث میں اسلام میں جو اشتراکیت ہے، اس کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور ہمارے اشتراکی، ڈیموکریٹک (ڈیموقراطی) اور تعاونی معاشرے کی اشتراکیت کو اسلام میں معاملات کے جو اصول و قواعد ہیں، ان سے جس طرح کا گہرا تعلق ہے، اس کی وضاحت ہے۔ اسی سے ہماری اشتراکیت کا اصلی ہونا اور جس سرچشمے سے وہ ہمارے ہاں پھوٹی ہے، اس کا خالص ہونا یقینی ہوتا ہے اور اس کی رو سے وہ ارتقاء اور ترقی کی طرف انقلابی قدم اٹھا سکتی ہے۔

پہلی تقریر کا عنوان ہے " الاشتراکیۃ العربیۃ بین النظم" اور مقرر ہیں جامعہ قاہرہ کے معاشیات و علوم سیاسیہ کے پروفیسر ڈاکٹر رفعت المحجوب۔ موصوف فرماتے ہیں کہ ہر اقتصادی نظام کا جس سے کہ تاریخ واقف ہے، اپنا ایک فلسفہ ہوتا ہے، جو اقتصادی نظام کے اغراض و مقاصد کو جن کے حصول میں وہ کوشاں ہو ایک خاص شکل دیتا اور اُس کے طریقہ کار کو معین کرتا ہے' اسی کو ہم اس نظام کا سیاسی' قانونی اور اجتماعی ڈھانچہ کہتے ہیں اور اِسی سے نظام اقتصادی مرتب ہوتا ہے۔ اب سرمایہ دارانہ نظام کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ اور کمیونسٹ (شیوعی) نظام کا اپنا۔ باقی رہی عربی اشتراکیت، جسے ہم نے بطور ایک نظام کے اختیار کیا ہے' اُس کا بھی دوسرے اقتصادی نظاموں کی طرح اپنا ایک فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ یہ ایک عربی فلسفہ ہے۔ اور پُرانا فلسفہ ہے اور بیک وقت فرد اور جماعت دونوں کا قائل ہے۔ اس ضمن میں یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ یہ محض سرمایہ دارانہ رجحان اور شیوعی رجحان کے درمیان ایک طرح کی بیچ کی راہ ہے' بلکہ عربی اشتراکیت کے فلسفے کی اپنی ایک مستقل ذاتی حیثیت ہے۔ یہ قدیم فلسفہ ہے' اور اس کے اجزائے ترکیبی اُن روحانی دینی قدروں سے ماخوذ ہیں جو اُمتِ عربیہ کے ضمیر میں رسی بسی رہی ہیں، چنانچہ جب ہم اِن روحانی دینی قدروں کا جائزہ لیتے ہیں' تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فرد کی بھی قائل ہیں اور جماعت کی بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام کے تمام ادیان ایک انسان کا بحیثیت ایک فرد کے احترام کرتے ہیں اور اِس بنا پر اُس کے جو طبیعی حقوق ہیں' اُنہیں مانتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سارے ادیان فرد کے بجائے جماعت کو وہ وجود سمجھتے ہیں جو بنی نوع انسان کے سلسلے کو جاری رکھتا ہے۔ غرض ہمارے فلسفے میں فرد کا اپنا ایک مستقل وجود ہے' اور اسی طرح جماعت کا بھی اپنا ایک مستقل وجود ہے۔ اور عقل و منطق کا یہ تقاضا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی طبیعی جگہ کو سنبھالے مصلحت خاصہ کا اپنا مقام ہو' اور مصلحت عامہ کا اپنا۔

یہ ہے وہ ڈھانچا' جس سے عربی اشتراکیت تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ اب ہم وہ طریقہ کار معین کرتے ہیں' جس پر چل کر ہم ایک ایسا نظام بروئے کار لا سکتے ہیں' جس میں فرد اور جماعت دونوں کا احترام برقرار رہے۔ اس سلسلے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بیک وقت انفرادی ملکیت اور ملکیت عامہ دونوں کو قائم رکھیں' اسی لئے ہمارے ہاں ایک تو "پبلک سیکٹر" ہے، جو مفاداتِ عامہ کا خیال رکھتا ہے۔ اور ایک پرائیویٹ سیکٹر ہے جو مفادات خاصہ کو ممکن العمل بناتا ہے' چنانچہ اسی بنا پر ہمارا نظام سرمایہ دارانہ نظام اور شیوعی نظام ہر دو سے مختلف ہے، وہ سرمایہ دارانہ نظام سے

اس لیئے مختلف ہے کہ ہم "پبلک سیکٹر" کو وسیع مواقع دیتے ہیں، جو کہ سرمایہ دارانہ نظام نہیں کرتا۔ اور شیوعی نظام سے ہمارا یہ اختلاف ہے کہ ہم وسائل پیداوار میں انفرادی ملکیت کو برقرار رکھتے ہیں، اور یہ شیوعی نظام نہیں کرتا، بلکہ ہم تو اس نظام کے برعکس یہ کرتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"جو مالک ہیں، اُن سے اُن کی املاک لیتے ہیں اور غلامین وکسانوں میں سے جو غیر مالک ہیں اُنہیں مالک بناتے ہیں۔" اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے نظام کا یہ جو مسلک ہے، یہ محض دو نظاموں (سرمایہ دار اور شیوعی) کا نقطۂ اوسط نہیں بلکہ یہ ایک خاص فلسفے کا حاصل ہے۔ غرض ہم قومی ملکیت کے اس لئے حامی نہیں کہ وہ قومی ہے اور انفرادی ملکیت کے اس لئے خلاف نہیں کہ وہ انفرادی ہے، بلکہ قومی ملکیت وہاں بروئے کار آتی ہے جہاں پیداوار بڑھانے، عدل اجتماعی قائم کرنے اور محتاج طبقوں پر خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انفرادی ملکیت ان مقاصد کو پورا نہیں کر رہی اور وہ تغلب، معاشی استحصال اور اجارہ داری کا ذریعہ بن گئی ہے تو ہم منصفانہ معاوضہ دے کر انفرادی ملکیت کو ختم کر دیتے ہیں، لیکن جہاں انفرادی ملکیت سے اِن مقاصد پر زد نہ پڑے، ہم وہاں اُس کا احترام کرتے ہیں، اور اُسے برقرار رہنے دیتے ہیں۔

اپنے اس فلسفے کی روشنی میں ہمارا اجتماعی اسلوبِ زندگی بھی سرمایہ دارانہ اور شیوعی اسلوب زندگی سے مختلف ہے ہم ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کے برعکس آبادی کے مختلف طبقات میں بہت زیادہ تفاوت تسلیم نہیں کرتے اور نہ اُن کے درمیان سماجی دیواریں کھڑی کرنے کے حق میں ہیں، دوسری طرف ہم شیوعی نظام کی طرح طبقاتی کشمکش کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ہمارا اجتماع کی وحدت اور اُس کے افراد کے درمیان تعاون پر ایمان ہے اور یہ اس لئے کہ ہم عدل اجتماعی پر ایمان رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی وحدت اور عدل اجتماعی میں طبقاتی کشمکش کا زیادہ امکان نہیں۔ اسی بنا پر یہ ایک منطقی بات ہے کہ ہم طبقات کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے کی طرف توجہ کریں تاکہ ہر فرد کو اپنی استعداد اور کار کردگی کے مطابق سرگرم عمل ہونے کا اجتماعی موقع ملے۔

مزید برآں ہم شیوعی نظام کے برعکس اجتماعی طبقات کا صفایا نہیں کرتے اور نہ اس کی اجازت دیتے ہیں کہ صرف پرولتاری طبقہ اقتدار پر قابض ہو، بلکہ ہم اجتماع کی وحدت اور اجتماعی عدل قائم کرتے ہیں۔ یہی ہمارا فلسفہ ہے۔ اسی مقصد کو ہم سامنے رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا طریقہ کار ہے اور ان سب سے مل کر ہمارا نظام مرتب ہوتا ہے۔

دوسری تقریر جامعہ قاہرہ کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز کامل کی ہے۔ موصوف نے اشتراکیت اسلام کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے "یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" (اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز اور قابل تعریف ہے) اب جہاں تک لوگوں کے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہونے کا تعلق ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام وسائل اور طاقتیں جن سے افراد کام لیتے اور افزائش دولت کرتے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں، چنانچہ اس لحاظ سے افراد اللہ کے محتاج ہیں اسی بنا پر اُن کے مال میں اللہ تعالیٰ کا حصّہ ہے۔ اور یہ مال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے پاس بطور امانت کے ہے۔

یہ تھا وہ عقیدہ جس کے عملی مظاہر ہمیں آنحضرت صلعم اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیوں میں ملتے ہیں۔ وہ مال کو اللہ کی امانت سمجھتے تھے اور اُس کے احکام کے مطابق اُسے خرچ کرتے تھے۔

ڈاکٹر موصوف کے نزدیک اقتصادیات اور عقائد وعبادات واخلاق الگ الگ چیزیں نہیں، بلکہ یہ سب ایک کامل اجتماعی نظام کا حصّہ ہیں، جو نماز، زکوٰۃ، اخلاق اور اقتصادیات میں فرق نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں افراد محض دولت پیدا کرنے والے آلات نہیں، بلکہ اُن کا ایک روحانی وجود بھی ہے، جس کے اپنے حقوق ہیں۔ اسی طرح اُن کے بدن کے بھی حقوق ہیں۔

جامعہ ازہر کی کلّیہ شریعت کے عمید (پرنسپل) شیخ محمد محمد مدنی نے اسلام میں اشتراکیت کے بنیادی قواعد اور اُس میں جو اجتماعی کفالت کا نظام ہے، اُس پر بحث کی ہے۔ موصوف کے نزدیک قبل از اسلام احبار و رہبان نے بادشاہوں اور اصحاب اقتدار کی مدد سے انسانوں کو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسلام نے آکر انسانی مساوات کا اصول نافذ کیا۔ ہر وہ سیادت واقتدار جو خون، نسل اور مذہبی گدّی سے ماخوذ تھی اُسے ختم کیا اور مرد وعورت کی غیر منصفانہ تقسیم کو مٹایا۔ اُس نے اعلان کیا کہ سب انسان ایک ہی نوع بشر ہیں اور سب کا مورث اعلیٰ ایک ہی ہے، چنانچہ بلالؓ جو ایک حبشی غلام تھے، وہ علیؓ کے جو خالص النسب قریشی تھے، ساتھی بن گئے۔ سلمان فارسیؓ عمرؓ بن خطاب کے ہم مثل اور بھائی تھے، اور آزاد کردہ غلام زیدؓ کے صاحبزادے اُسامہؓ ایک ایسے لشکر کے سپہ سالار بنے جس میں بڑے بڑے قریشی تھے۔

قرآن مجید کی وہ جامع آیت جو مساواتِ انسانی کے اُصول کو معین کرتی ہے حسب ذیل ہے:۔

"یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا"

(اے لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اُسی سے پیدا کیا اُس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطے سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار رہو قرابت والوں سے۔ بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے) مقرر موصوف نے بتایا کہ اس آیت میں اُس پہلے بنیادی اُصول کا تعین کیا گیا ہے جو ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لئے لازمی ہے۔ اور وہ بنیادی اُصول ہے اللہ کی نظر میں اور اُس سے ڈرتے ہوئے اور اُس کی نگہبانی میں سب انسانوں کا مساوی ہونا اور اُن سب کا ایک مرد اور عورت سے پھیلنا۔ اور بقول شیخ مدنی کے اس آیت سے حسب ذیل اُمور منتج ہوتے ہیں:۔

(۱) طبیعی تفریقات کا خاتمہ (۲) دینی اور نسلی تفریقات کا خاتمہ

(۳) مرد اور عورت میں اجتماعی تفاوت کا خاتمہ

(۴) معاشرے میں ایک نفسی و معنوی انتباہ کرنے والی چیز۔ اور وہ ہے اللہ سے ڈرنا۔

(۵) انسانی رشتے کے جذبے کو اُبھارنا۔ والارحام میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وزارت اوقاف کے مدیر مساجد شیخ الغزالی نے وسائل ملکیت اور ملکیت کی تحدید پر تقریر کی، موصوف نے فرمایا کہ اشتراکیت ایک نیا لفظ ہے جو قدیم معنی کی ترجمانی کرتا ہے اور وہ ہے حیات عامہ میں کمالِ انسانی کے معانی میں سے ایک معنی۔ اشتراک انفرادیت کی ضد ہے۔ اور جہاں انفرادیت انانیت، حرص اور خود پرستی سے عبارت ہے وہاں اشتراک دوسرے کی محبت، اس کے احترام اور اُس کے حقوق کے احساس پر دلالت کرتا ہے۔ اشتراکی معاشرے کے معنی یہ ہیں کہ جماعتی زندگی ایک ایسے اخلاقی نظام کے مطابق ہو، جس میں باہمی تعاون، ایثار، کفالت، عدل و انصاف سب کے لئے یکساں مواقع اور طبقاتی توازن ہو۔ یعنی اُس معاشرے میں جنبہ داری، لالچ، ظلم اور اجارہ داری کی برائیاں

لہ شاہ عبدالقادرؒ کے موضح قرآن میں ہے "یعنی ایک آدم سے حوا کو بنایا پھر اُن سے سارے لوگ، اور خبردار ہو ناتوں سے یعنی بدسلوکی مت کرو آپس میں۔ ۱۲

مفقود ہوں۔ غرض ان معنوں میں اشتراکیت ایک اسلامی نظام ہے، جس کا تانا بانا ثابت شدہ نصوص اور ایسی تعلیمات اور تطبیقات سے مرکب ہے، جن میں کوئی شک نہیں، بلکہ قدیم عرب اپنے ابتدائی معاشرے میں جہاں فطری سلامت روی کا دور دورہ تھا، انہی اخلاق کے مطابق زندگی گذارتے تھے۔

اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں۔ جس شخص کے پاس فالتو سواری ہو، وہ اُس شخص کو جس کے پاس سواری نہیں دے۔ جس شخص کے پاس فالتو زادراہ ہے، وہ اُس شخص کو دے، جس کے پاس نہیں۔ راوی حدیث کا بیان ہے کہ آپؐ نے ہر مال کی صنف کا ذکر کیا، یہاں تک ہم نے جان لیا کہ ہم میں سے کسی کو اپنے فالتو مال میں کوئی حق نہیں۔ مقرر کے نزدیک مدینہ میں جو پہلا اسلامی معاشرہ معرض وجود میں آیا۔ وہ انہی بنیادوں پر تھا، موصوف نے اس معاشرے کی بہت سی مثالیں پیش کیں۔

وہ مال جو ہمارے ہاتھوں میں ہے، کیا وہ بلا شرط اور بلا تحدید ہماری ملکیت ہے کہ ہم اُس میں سے جیسے چاہیں تصرف کریں یا یہ ملکیت محدود اور معاشرے کے قوانین کے تابع ہے۔ اس معاملے میں نصوص دینی بالکل واضح ہیں، اُن کے نزدیک ہماری یہ ملکیت حقیقی نہیں، بلکہ ہمیں یہ مال بطور امانت کے ملا ہے۔ چنانچہ یہ سمجھنا کہ مال والے اپنے مالوں میں جو تصرف کرتے ہیں، اس کا حساب وہ صرف آخرت میں دیں گے، صحیح نہیں اور اسلامی اصول اور خلفائے راشدین کا عمل اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہم ایسے اور اس قسم کے دوسرے اُمور کے لئے ایک عام قاعدہ قرآن کریم کی اس آیت سے اخذ کرتے ہیں:۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر) یعنی دینوں اور رسالتوں کا اولیں مقصد عدل اجتماعی و سیاسی کے قیام اور مادی اور معنوی قوانین کے اجراء کے ذریعہ لوگوں میں توازن قائم کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے وہ ترازو جو نبیوں کے ساتھ اُتاری گئی، وہ عام ترازو نہیں جسے تاجر استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ قانون کی ترازو ہے، جو لوگوں کے اعمال و اطوار کے نظم و ضبط، اُن کے حقوق و واجبات کی تقسیم اور جماعتوں کی تنظیم کے لئے مصلحین کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بے شک اس ترازو کے احکام زمانوں کے ساتھ ساتھ بدلتے ہیں۔ اور ملکوں اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی ہے، لیکن جہاں تک "قیام الناس بالقسط"

(لوگوں کو انصاف پر سیدھے رکھنے) کا سوال ہے، وہ ایک ایسا بنیادی محور ہے، جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔

بعض علمائے اُصول کا کہنا ہے کہ اگر لوگوں کے "مصالح مرسلہ"[1] کے عملی جامہ پہننے میں کوئی نص روک ہو، تو اس نص کی تاویل کی جائے اور "مصالح مرسلہ" کو جن کے بغیر چارہ نہیں، عملی شکل دے دی جائے۔ غرض جب انسانی جماعت کی اصلاحِ حال کا مسئلہ دین کی نظر میں یہ مقام رکھتا ہے، تو کیا کسی ایک طبقے کے حاصل شدہ اور غصب شدہ حقوق ایک معاشرے کی عام بہبود اور اُس کے افراد کی غالب اکثریت کی سعادت کے حصول میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ اور کیا اس صورت میں جائز نہیں ہوگا کہ جہالت، ذلت اور افلاس کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے جن میں عوام کی ایک بڑی اکثریت جکڑی ہوئی ہے زرعی آراضی اور صنعتی اداروں کی ملکیت کو محدود کر دیا جائے، اس کی مخالفت دین سے بے خبری اور ظلمِ عظیم ہے۔

شیخ الغزالی فرماتے ہیں کہ لوگوں سے اُن کے مال کا حساب اِس دنیا میں بھی ہوگا اور آخرت میں بھی۔ اور اموال میں انفرادی، اجتماعی اور سیاسی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا ہی اُن کا حساب ہے۔ چنانچہ دینی نقطۂ نظر سے حکومت کو اس کا پورا حق ہے کہ وہ ان مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے جو بھی چاہے حل پیش کرے اور جس قسم کے بھی چاہے قانون بنائے اور جب تک وہ حق کے لئے کوشاں اور عدلِ اجتماعی کو بروئے کار لانے کی ساعی ہے، اُسے پورا اطمینان ہونا چاہئے کہ دین اُس کے ساتھ ہے نہ کہ اُس کے خلاف۔

شیخ موصوف کی تقریر کا آخری جملہ یہ ہے:-

"آج حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ظلم کرنے والے ہاتھوں کو روکے اور پوری قوم کے مفادات کے لئے مال فراہم کرے۔ نیز وراثت ملکیت ہی کی ایک شاخ ہے اور چوری ملکیت نہیں ہو جاتی۔"

---

[1] "..... سوائے داؤد ظاہری کے تمام ائمہ اس اُصول پر متفق ہیں کہ مسائل معاملات میں عقلی پیمانے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور وہ مصالح اور رفاہ عامہ پر مبنی ہیں۔ جب شرع اِن مصالح کا جواز یا عدم جواز نص یا قیاس کے ذریعہ واضح کر دے تو اس کی تعمیل ضروری ہے، لیکن جب شرع مصالح کے بارے میں خاموش ہے یعنی جب دلائل شرعیہ کسی امر کی مصلحت کو واضح نہ کریں تو ہم اس میں مصالح عامہ سے استصواب کر سکتے ہیں امام مالکؒ نے اس کو جائز قرار دیا ہے یعنی اُن کے نزدیک مصلحت بھی ایک دلیل شرعی ہے۔ اُنہوں نے اس جدید دلیل کا نام "مصالح مرسلہ" ہی رکھا ہے...." الخ (فلسفہ شریعت اسلام تالیف ڈاکٹر صبحی اردو ترجمہ)

"فضیلۃ الاستاذ" شیخ احمد الشرباصی جمعیات شبان المسلمین کے "رائدعام" نے "المال والاشتراکیۃ فی الاسلام" کے موضوع پر تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ لفظ "اشتراکیت" ہمارے ہاں جن معنوں میں معروف و مشہور ہے اُس سے مراد یہ ہے:- لوگ خیر اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں۔ نعمتوں کو آپس میں بانٹیں اُن میں باہم اس طرح میل ملاپ ہو، جیسے وہ ایک جسم کے اعضا اور ایک عمارت کی اینٹیں ہیں تاکہ اُن سے کینے اور عداوتیں دور ہوجائیں اور ایک قوم کے مختلف طبقوں میں بہت زیادہ فرقِ مراتب نہ رہے اور یہ نہ ہو کہ ایک تو حد سے زیادہ امیر ہو۔ اور دوسرا اتنا غریب ہو کہ اُسے کھانے کو نہ ملے۔

اب واقعہ یہ ہے کہ دین حنیف اپنی نصوص و روح اور اپنے قوانین کے ذریعہ ایک ایسی اشتراکیت کو بروئے کار لانا چاہتا ہے جو انسانیت، اخلاق، عدل و انصاف اور فضیلت پر مبنی ہو، اور وہ جامع ہو عدلِ اجتماعی اور انفرادی ملکیت ہر دو پر۔ تاکہ اس طرح ایک طرف تو فرد کا حق محفوظ رہے اور دوسری طرف جماعت و اجتماع کے حقوق کی حفاظت ہوتی رہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ جماعتوں اور قوموں کی ہلاکت کا سبب یہ ہوا کرتا ہے کہ اُن میں ایک حد سے زیادہ دولت مند و آرام طلب طبقہ ہوتا ہے جو ساری نعمتوں اور آسودگیوں کو اپنے لئے مخصوص کرلیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْرًا[1]

مزید برآں اسلام نے اپنے ماننے والوں کے نفوس میں "صاحب فضیلت اسلامی اشتراکیت" کی روح کو مستحکم کرنے کے لئے اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جو بھی مال، جائداد، قوتیں اور ثروت ہے، وہ سب کی سب فی الحقیقت اللہ کی ملکیت ہیں، کیونکہ اُن کو پیدا کرنے والا اور وجود میں لانے والا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

"وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ" ـــ "وَبِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ"[2]

نیز قرآن مجید میں ہے ــ "وَقُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"[3]

---

[1] (ترجمہ) جب ہم کسی بستی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، تو ہم اُس کے دولت مند آرام طلب طبقے کو . . . . . حکم دیتے ہیں، چنانچہ وہ اس میں فسق و فجور کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ کا حکم اُس پر صادق آتا ہے۔ اس کے بعد ہم اس بستی کو تباہ و برباد کردیتے ہیں۔

[2] (ترجمہ) "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ سب اللہ کا ہے"۔ "اُسی کے ہاتھ میں ہر شئے کا اختیار و اقتدار ہے"۔

[3] کہہ دے! اے اللہ تو ہی اختیار کا مالک ہے، جسے تو چاہتا ہے، اختیار دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے اختیار چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے، تیرے ہاتھ ہی میں ساری بھلائی ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۲

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ انسان کو جو مالک بنایا گیا ہے، تو اس کی ملکیت مستعار ہے۔ حقیقی مالک اللہ ہی ہے، انسان اس ملکیت میں اللہ تعالیٰ کا صرف قائم مقام اور وکیل ہے۔ اور وکیل کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اصل مالک کے احکام کے مطابق عمل کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے: "اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ[1]"۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے "وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ[2]"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "المال مال اللہ وانا عبدہ[3]"

اسلام نے یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو نعمتیں پیدا کی ہیں، وہ دوسروں کو چھوڑ کر صرف ایک طبقے کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی آل و عیال[4] اور اسی کے بندے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے، وہ سب ان کے لئے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا[5]" نیز "وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا[6]"۔ اور قرآن مجید میں ہے۔ "وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا[7]"۔ یہاں جن اموال کا ذکر ہے وہ سفہاء کے اموال ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں "اموالکم" یعنی تمہارے اموال کہا ہے۔ یعنی اموال اصل میں اور عمومی طور پر قوم کے ہیں اور انہیں کوئی ایک شخص یا طبقہ اپنی اجارہ داری نہیں بنا سکتا۔

اس کے ساتھ ہی اسلام ملکیت کا اثبات اور احترام کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے "فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ[8]"

---

[1] (ترجمہ) خرچ کرو اس مال میں سے جس کا اللہ نے تمہیں جانشین بنایا ہے۔

[2] اللہ کا مال جو تمہیں اس نے دیا ہے، وہ ان کو دو۔

[3] مال اللہ کا ہے۔ اور میں تو اس کا بندہ ہوں۔

[4] الخلق کلهم عيال الله وعباده

[5] وہی ہے جس نے تم سب کے لئے جو کچھ زمین میں ہے پیدا کیا۔

[6] اسی نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، تم سب کے لئے مسخر کیا۔

[7] اور نہ دو بے سمجھوں کو اپنے اموال جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زندگی کا ذریعہ بنائے ہیں۔

[8] پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل ڈھونڈھو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اللہ تعالیٰ کے فضل کو ڈھونڈنے سے مراد کسب رزق اور اُس کی ملکیت ہے اور حدیث نبوی میں مسلمان کے اُس مال کی جو "صحیح و سلیم" ہو حرمت کا یوں اثبات کیا گیا ہے

کل المسلم علی المسلم حرامٌ : دمه ومالهٗ وعرضه[۱]"

تعلیمات اسلامی سے یہ مفہوم بھی ملتا ہے کہ ملکیت کا اصل ذریعہ عمل ہے، اگرچہ انسان عمل کے علاوہ وراثت، ہبہ اور وصیت سے بھی ملکیت حاصل کرتا ہے، لیکن یہ تینوں طریقے بہت کم ہیں۔ زیادہ تر عمل ہی ملکیت کو ممکن بناتا ہے۔ چنانچہ اسلام بار بار کسب رزق افزائشِ پیداوار اور ملکیت کے لئے سعی و عمل کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے "هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ[۲]" اور اسی طرح ارشاد ہوتا ہے۔" وان لیس للانسان الا ما سعیٰ[۳]۔ اسی ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔" بہترین کسب اور کمائی یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے کام کرے"۔ اسی طرح آپؐ کا ارشاد مبارک ہے ایک شخص کا بہترین کھانا یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے"۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اُس کا ہاتھ کام کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا" یہ وہ ہاتھ ہے جسے اللہ اور اُس کا رسول محبوب رکھتا ہے"۔ ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ حرفے والے بندے کو محبوب رکھتا ہے"۔ اور حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ میں ایک آدمی کو دیکھتا ہوں اور اُس کی شکل و صورت مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ" لَا عَمَلَ لَهٗ" (اُس کا کوئی عمل نہیں) تو وہ میری نظر میں گر جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ مال جو صحیح طریقے سے ایک مسلمان کی ملکیت میں آئے اسلام اُس ملکیت کا اثبات اور احترام کرتا ہے لیکن اس کے بعد صاحب مال پر واجب ہے کہ اس مال پر اللہ اور اُمت کا جو حق ہے، اُسے وہ ادا کرے۔ اللہ کا حق مقرر ہے اور اُس سے مفر نہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے " والذین فی اموالهم حق

---

[۱] ہر مسلمان دوسرے کے لئے حرمت کے قابل ہے یعنی اُس کا خون اُس کا مال اور اُس کی آبرو۔

[۲] اُسی نے زمین کو تمہارے لئے ہموار و نرم بنایا ہے کہ تم اُسکے راستوں میں چلو اور اللہ کے رزق سے کھاؤ اور اُسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے۔

[۳] انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔

معلوم للسائل والمحروم"[1] اور اس سلسلے میں بعض حق بندے کی مرضی پر بھی ہیں، جیسے صدقہ اور دوسروں کے ساتھ احسان کرنا۔ باقی رہا اُمت کا حق، تو وہ ہے، جسے شرعی حاکم (ولی الامر) متعین کرتا ہے۔ اسے عہدِ حاضر کی زبان میں ٹیکس کہتے ہیں اور یہ اُمت کے مفادِ عامہ کے لئے وصول کیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر صاحبِ مال اپنا مال دوسروں کو نقصان پہونچانے یا اللہ کی طرف سے ممنوع شدہ طریقوں پر صرف کرتا ہے، تو اس صورت میں بھی حاکم مداخلت کرنے کا مجاز ہے۔ غرض اگر انفرادی ملکیت ان حدود میں رہے، تو یقیناً اسلام اس کا حق تسلیم کرتا ہے۔

اسلام ایک طرف فقر و احتیاج کو ناپسند کرتا ہے اور دوسری طرف وہ مال جمع کرنے والوں کو بھی ان الفاظ میں انتباہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔" والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون"[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضیلت والے مثالی اشتراکی معاشرے کی تشکیل کا آغاز اُس وقت کیا جب آپؐ نے بے خانماں مکے سے نکالے ہوئے مہاجرین اور زمینوں اور مکانوں والے انصار میں بھائی چارہ کی بنیاد رکھی۔ اور اکثر انصار نے جو کچھ اُن کے پاس تھا اُس میں اپنے مہاجر بھائیوں کو برابر کا شریک کرلیا اس کے بعد وہ مالِ غنیمت جو کسی لشکر کشی کے بغیر آیا، اُسے آپؐ نے تہی دست مہاجروں اور بعض انصار کو جو اُن کی طرح تہی دست تھے، دے دیا، تاکہ سب مومنین میں ایک طرح کی مساوات ہو جائے اور جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، دولت صرف اغنیاء میں گھومتی نہ رہے۔[3]

---

[1] (ترجمہ) اُن کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک معین حق ہے۔

[2] وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری دو۔ اُس دن جب اس پر دوزخ کی آگ گرم کی جائے گی اور اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں پر داغا جائیگا۔ یہ ہے جو تم جمع کرتے تھے اپنے لئے اب چکھو جو تم جمع کرتے تھے۔ [3] کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم"

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث مروی ہیں، جن میں بقول الشیخ احمد الشرباصی کے ہم "اسلامی انسانی اخلاقی مومن اشتراکیت" کے واضح نقوش پاتے ہیں۔ اس ضمن میں مقرر موصوف نے امام بن حزم کا ایک قول نقل کیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے "ہر شہر کے اغنیاء پر فرض ہے کہ وہ اپنے ہاں کے محتاجوں کی ضرورتیں پوری کریں اور حاکم وسلطان اس پر انہیں مجبور کرسکتا ہے۔ اگر اس کے لئے زکوٰۃ اور سارے مسلمانوں کے فیٔ[1] کے اموال کافی نہ ہوں، تو اُن کے لئے ضروری کھانے کا انتظام کیا جائے۔ سردی اور گرمی کے لئے کپڑوں کا انتظام ہو اور مکانوں کا انتظام ہو، جہاں وہ بارش، دھوپ، گرمی اور گزرنے والوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔"

اب رہا سوال قومی ملکیت میں لینے یعنی "تامیم" کا، کہ اس کا اشتراکیتِ اسلام سے کہاں تک تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ اسلامی اشتراکیت ایک انسانی، انصاف پسند، معتدل اور حد سے نہ بڑھنے والی اشتراکیت ہے، چنانچہ جہاں اسلام تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیتا ہے، وہاں وہ اجارہ داری کے خلاف ہے۔ وہ ایک طرف انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف معاشرے کو تمام افراد کا کفیل ٹھہراتا ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اُمت کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے والے وسائل ایک فرد یا چند افراد کی ملک ہوں۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں "تین چیزوں میں سب لوگ شریک ہیں :- پانی، گھاس، اور آگ" ان تین چیزوں سے آپ اُن سب چیزوں کو قیاس کرسکتے ہیں جن سے آج عمومی مفادات وابستہ ہیں۔

اسلام میں قومی ملکیت کی تائید میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں "نقیع" کے رقبے کو "حمیٰ" قرار دیا تھا کہ وہاں عام مسلمانوں کے گھوڑے چرا کریں، اور وہ کسی فردِ واحد کی ملکیت نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپؐ نے اُسے اُمت کی ملک قرار دیا تھا اور اسی کو قومی ملکیت (تامیم) کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ربذہ کے قطعۂ زمین کو "حمیٰ" قرار دیا اور اسے سارے مسلمانوں کے لئے چراگاہ بنادیا۔ اور جب اس قطعۂ زمین کے مالکوں نے کہا کہ اے امیرالمومنین! یہ ہماری زمین ہے، ہم زمانۂ جاہلیت میں اس کے لئے لڑتے رہے ہیں اور جب ہم اسلام لے آئے تو یہ ہمارے پاس تھی، تو اب آپ کیسے اسے "حمیٰ" قرار دیتے ہیں۔ اس پر

---

[1] فیٔ کے معنی مال غنیمت کے ہیں۔ ۱۲

حضرت عمرؓ نے تھوڑی دیر کے لئے اپنا سر نیچے جھکالیا اور سوچنے لگے۔ اس کے بعد فرمایا "یہ مال اللہ کا ہے، اور بندے اُس کے بندے ہیں، خدا کی قسم اگر میں یہ اللہ کے راستے میں نہ کر رہا ہوتا، تو اس زمین کی ایک بالشت بھی "حمیٰ" نہ قرار دیتا۔" اسی طرح اسلام میں "وقف" کا جو نظام ہے اس سے قومی ملکیت اور "تامیم" کے حق میں استدلال کیا گیا ہے۔ کیونکہ "وقف" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وقف شدہ جائداد صاحب جائداد کی ملکیت سے نکل کر اللہ کی ملکیت میں چلی گئی اور اللہ کی ملکیت کے معنی ہیں کہ اُس کے بندے اُس جائداد سے فائدہ اُٹھائیں۔

"تامیم" کے حق میں یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے شام و عراق کی اراضی مسلمان فاتحین میں تقسیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور حضرت معاذؓ بن جبل نے اس کی تائید میں فرمایا تھا "اے امیر المومنین! اگر آپ نے ان اراضی کو تقسیم کر دیا تو ان کی ساری آمدنی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی، اور جب یہ مر جائیں گے تو یہ آمدنی ایک فرد واحد مرد یا عورت کو ملے گی۔"

اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہے کہ حاکم جسے فقہاء کی اصطلاح میں "امام" سے تعبیر کیا گیا ہے، کسی ملکیت کے "حق مطلق" کو مقید کر سکتا ہے، جیسے کہ غیر آباد زمینوں کے آباد کرنے کے مسئلے سے واضح ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "جس نے کوئی غیر آباد زمین آباد کی، وہ اُس کی ہے" اس کے بارے میں ابو حنیفہؒ کا قول ہے "کہ بے شک یہ اُس کی ہے لیکن امام کی اجازت سے"۔ ابو حنیفہ نے یہ شرط اس لئے لگائی ہے تاکہ اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف نہ ہو۔ اور ملکیت کے حق مطلق کو محدود کرنے کا یہ اختیار مصلحت عامہ کے تحت دیا گیا ہے چنانچہ اس ضمن میں امام ابو یوسفؒ "کتاب الخراج" میں لکھتے ہیں کہ اس معاملے میں امام پر واجب ہے کہ وہ جس میں مسلمانوں کی بھلائی اور عام فائدہ دیکھے، وہ کرے۔

مسلمان حکومتوں کی طرف سے جو اراضی بطور "جاگیروں" (اقطاع) کے دی جاتی تھیں ہمارے ہاں اس کے بارے میں بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس سلسلے میں صحیح صورت یہ ہے:۔ ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے بلال بن حارث مزنی کو مدینہ کے نواح میں عقیق کا قطعہ اراضی دیا۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو آپ نے بلال سے کہا کہ رسول اللہؐ نے تمہیں یہ زمین آباد کرنے کے لئے دی تھی، اب تم نے جو آباد کی ہے، وہ تو رکھ لے، باقی واپس کر دے۔ ابو عبید نے اپنی کتاب "الاموال" میں یہ واقعہ بیان کیا ہے:۔

اگر ہم ائمہ مسلمین میں سے بعض کبار کی تاریخ دیکھیں، تو اُن کی زندگیوں میں اسلامی اشتراکیت کی روح نمایاں نظر آئے گی۔ مقرر نے اس کے ثبوت میں حضرت عمرؓ بن خطاب اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے بعض واقعات بیان کیے اور آخرالذکر کے بارے میں بتایا کہ کس طرح اُنہوں نے مسندِ خلافت پر بیٹھتے ہی وہ سارے اموال اور آراضی جو اُنہیں آباد اجداد سے ورثے میں ملی تھیں، اُن کے اصل مالکوں کو لوٹا دیں۔

کتاب میں دو تقریریں اور بھی ہیں۔ ایک کمرشل کالج کے ایک پروفیسر کی، اور دوسری لاء کالج کے شعبۂ شریعت اسلامی کے پروفیسر شیخ محمد ابوزہرہ کی۔ یہاں عدم گنجایش کی وجہ سے ہم اُن کا خلاصہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔



"یورپ میں جو صنعتی و معاشی انقلاب ہوا ہے، میں اسے مانتا ہوں۔ اور اس کو بہت بڑی چیز سمجھتا ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ اس قسم کے انقلاب کا مخالفِ دین ہونا ضروری نہیں۔ ہمارے جو دینی نظریے ہیں ان کے مطابق اس طرح کا انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود یورپ میں وقتاً فوقتاً بعض جماعتیں یہ خیال پیش کرتی رہی ہیں، لیکن چونکہ یہ جماعتیں مذہباً عیسائی تھیں اور ان کے مذہب میں کسی صورت میں بھی تشدد کی اجازت نہیں اور معاشرے کی انسانیت دشمن اور استحصال پسند طاقتوں کو اکثر اوقات بغیر تشدد کے ختم نہیں کیا جا سکتا، اس لئے انقلاب کے حامیوں نے ان مذہبی جماعتوں کی بات نہ سنی لیکن اسلام میں ایسے طبقوں کے لئے "فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ" کی صراحت موجود ہے۔

اب اگر میں یورپ کے اس انقلاب کی ترجمانی اس طرح کروں جیسے (علامہ) عنایت اللہ مشرقی نے کی، تو پھر اسلام تابع ہوگا اور یہ انقلاب متبوع۔ اور یہ صحیح نہیں۔ اس سے پہلے اس طرح کی ایک کوشش سر سید احمد خاں نے بھی کی تھی اب میں حضرت شاہ ولی اللہ کی حکمتِ اسلامی کو اصل مانتا ہوں۔ اور اسے اساس بنا کر یورپ کے انقلاب کو سمجھتا ہوں۔ اور اس کی ترجمانی کرتا ہوں۔ اس صورت میں میرا اسلام بھی محفوظ رہتا ہے۔ اور آج دنیا میں جو معاشی و انقلابی تبدیلیاں آ چکی ہیں، میں ان سے بے تعلق نہیں رہتا۔"

مولانا سندھیؒ

وجود کی بحث

پروفیسر ضیا

مسلمان حکماء اور صوفیاء کے ہاں شروع ہی سے وجود کی بحث بڑی اہم رہی ہے ۔ اور اسے مسئلۃ المسائل سمجھا جاتا رہا ہے ۔ اس عالم کون و مکان میں علت اور معلول کا جو سلسلہ ہے آخر وہ کہیں جا کر تو ختم ہوتا ہے ۔ اب اس سلسلے کی ابتدا کیسے ہوئی ؟ کیا علت و معلول کا یہ سلسلہ خود بخود شروع ہو گیا ' یا اس کا کوئی شروع کرنے والا بھی ہے ؟ پھر اس سلسلۂ علت و معلول کا اس کے شروع کرنے والے سے کیا تعلق ہے ؟ مسلمان حکماء اور صوفیاء دونوں کا ان دقیق بحثوں میں بڑا انہماک رہا ۔ اور وہ وجود کی اصل حقیقت کے تعین میں برابر سرگرداں رہے[1] ۔ ان بحثوں میں سے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بھی ایک بحث ہے ۔ جو صرف نظری نہ رہی بلکہ اس کے عملی نتائج نے ایک وقت میں مسلمانوں کے معاشرے اور ان کی ہئیت سیاسی پر دُور رس اثرات ڈالے ۔

وجود اور اس کے تنزلات کا مسئلہ بڑا عمیق ہے ۔ ذیل میں چند بزرگوں کے ارشادات کی مدد سے اس کی وضاحت کی کوشش کی جاتی ہے ۔

---

[1] " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے ۔ اس عہد میں ان اہلِ کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے ۔ اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائقِ تصوف کی بحث کرنے لگتے ہیں ۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی ۔ ان بزرگوں نے ظہورِ وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کئے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا ۔ اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا ۔ الغرض یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوعِ بحث بن گئے ۔ (اردو ترجمہ ہمعات مصنفہ شاہ ولی اللہ)

الہ آباد کے ایک مشہور بزرگ شاہ محمد حسین صاحب اس مسئلے پر یوں بحث فرماتے ہیں :۔

"جب ہم موجودات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں دو حیثیتیں پائی جاتی ہیں ۔ ایک اشتراک، دوسرے امتیاز۔ یعنی ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف صفتوں میں مشترک ہیں۔ مثلاً انسان انسانیت میں مشترک ہے اور اپنے خاص خاص تعینات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اسی طرح جتنے جاندار ہیں، ان سب میں جاندار ہونا مشترک ہے ۔ اور انسان اور گھوڑا ہونا ان کو آپس میں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی طرح تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے وہ وجود ہے ۔ ممکن میں اور واجب میں دونوں میں وجود پایا جاتا ہے۔ اسی وجود سے ہونا مراد نہیں [۱]۔ بلکہ وہ حقیقت مراد ہے، جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں ۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر کسی موجود کرانے والے کے موجود ہے ۔ اس لئے کہ یہی ذریعہ وجود ہے۔ لہٰذا اسے خود پہلے موجود ہونا چاہیئے ۔ اور یہی وجود تمام چیزوں کو حاوی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر شے معدوم ہے ۔ اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں وہ اعتباری ہیں۔ اس لئے اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے ۔ لہٰذا یہی وجود خدا تعالیٰ کا عین ذات ہے ۔ اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں، ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے ۔ اور ہر شخص کی علیحدہ شخصیت علاوہ وجود کے صرف اعتباری ہے ۔"

مولانا محمد قاسمؒ نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب "تقریر دلپذیر" میں اس پر بحث کی ہے فرماتے ہیں:۔

"... ہم اسی کو خدا جانتے ہیں جو بے عیب اور بے نقصان ہے اور اسی سے وجود کون و مکان ہے ۔ سب چیزیں اُسی کے سہارے اور بھروسے پر قائم ہیں ۔ وہ کسی کے سہارے کا محتاج نہیں ۔ وہ سب کی اصل ہے اور سب اس کی فرع ہیں ۔"

"وہ سب کی اصل ہے اور سب اس کی فرع ہیں" اس کی تشریح حضرت مولانا محمد قاسمؒ یوں کرتے ہیں ۔

"جس کارخانہ کو دیکھئے ۔ ایک اصل پر قرار ہے ۔ نور آفتاب کو دیکھئے تو ہزاروں مکانوں اور ہزاروں روشن دانوں میں جدا جدا جلوہ دکھلا رہا ہے ۔ پر سب کو آفتاب کے ساتھ رابطہ ہے ... عدد کے سلسلے کو نظر کیجئے تو ایک سے الی غیر النہایہ پھیلا ہوا ہے ۔ ... موجوں اور بلبلوں کے کارخانہ کو دیکھئے تو سب کی

---

[۱] شاہ ولی اللہ صاحبؒ "سطعات" میں لکھتے ہیں ۔ "سر سخن این است وجود کہ بمعنی ہستی نہ بمعنی مصدری ... ."

اصل وہی ایک جز ہے۔ آدمی وغیرہ کو دیکھئے تو سب کی اصل جسے انسانیت وغیرہ کہئے مشترک ہیں۔ اسی طرح جس طرف نظر پڑتی ہے کوئی ایسا کارخانہ نظر نہیں آتا کہ اس کا سر منشاء نہ ہو۔ پھر ان سر منشاؤں کو دیکھئے تو ان کا کوئی اور سر منشاء ہے۔ اور اسی طرح اوپر چلے چلو۔ مثلاً مجھ میں تم میں ہندو مسلمان، نصاریٰ یہود وغیرہ میں تو آدمیت مشترک ہے اور وہی سر منشاء ہے۔"

اور اس آدمیت کے خواص یہ ہیں:-

"اس نے ہر فرد بشر میں اپنی حکومت پھیلا رکھی ہے۔ اور اپنے احکام مثل کلام و گفتگو شکل و صورت کے جاری کر رکھے ہیں۔ تمام اس کی رعیت اور تابعدار ہیں۔ جو صورت ملتی ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ جو انداز ملا اس سے بدل نہیں سکتا۔ بول چال کا تمغہ اپنے جی سے دور نہیں کر سکتا۔"

انسانوں کا سر منشاء آدمیت ہے۔ جو ان سب میں مشترک ہے۔" اسی طرح گھوڑوں میں اور سر منشاء ہے۔ اور گدھوں کی اور اصل ہے اور کتوں کی اور اصل ہے۔"

غرض مولانا محمد قاسمؒ کے الفاظ میں:-

"ان سب اصلوں کی اصل جاندار ہونا ہے۔ ادھر نباتات کی علیحدہ اصل ہے۔ اور ان کا اور ہی سلسلہ اور اور ہی سر منشاء ہے۔ پھر ان کی اصل اور جانداروں کی اصل جسمیت کے زیر حکومت ہے۔ اسی طرح اوپر تک چلے چلو سارے عالم میں وجود مشترک ہے۔"

غرض جب تمام موجودات میں وجود مشترک ہے کہ اگر وجود نہ ہو تو یہ موجودات بھی نہ ہوں تو اس سے بعض ارباب تصوف نے یہ نتیجہ نکالا کہ وجود اور موجودات ایک دوسرے کی عین ہیں۔ مولانا محمد قاسمؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں: "شئے مشترک عین اشیائے متعددہ نہیں ہو سکتی ... اس لئے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ وجود عین عالم اور عین موجودات نہیں ... وجود عالم ہیں اور خود عالم میں فرق ہے۔ یہ دونوں بالکل ایک شئے نہیں بلکہ باین لحاظ کہ ایک شئے کبھی موجود ہوتی ہے اور کبھی معدوم، یوں معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا وجود ایک خارجی چیز اور ایک عارضی شئے ہے۔ اور ذاتی نہیں ... (جب) اس عالم کا وجود اصلی نہیں بلکہ ایک عارضی چیز ہے تو جیسے گرم پانی کی مثلاً گرمی جو اصلی نہیں عارضی ہے آگ کا فیض ہے، جس کی گرمی اصلی ہے ایسے

ہی اس عالم کا وجود عارضی ہے کسی موجود اصلی کا فیض ہوگا۔ اور وہ موجود اصلی ہی اس عالم کا خُدا اور خالق ہے۔ مگر چونکہ سب کا وجود ایک طرح کا نظر آتا ہے۔ چنانچہ اوپر مذکور ہوا تو جیسے آفتاب سے گو ہزار ہا جگہ دھوپ پھیلی پر سب کے سب ایک ہی آفتاب کا فیض ہے۔ ایسے ہی یوں سمجھنا چاہیئے کہ تمام عالم کا وجود بھی ایک موجود حقیقی اور اصلی کا پرتو ہے سو اُسی کو ہم خدا کہتے ہیں۔"

آگے چل کر مولانا محمد قاسمؒ اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں "۔۔۔۔۔ جتنے جہان میں پھیلاؤ ہیں، وہ کسی ایک شے کی طرف سمٹے چلے آتے ہیں۔۔۔۔ بکلو بدھو چند خصوصیات کا نام ہے کہ جن میں آدمیت مشترک ہے۔ اسی طرح آدمی گھوڑا گدھا وغیرہ چند خصوصیات کا نام ہے کہ جن میں زندگی اور جاندار ہونا مشترک ہے اسی طرح اوپر تک چلے چلو۔ سب سے اوپر جو اشتراک ہے تو وجود میں ہے یعنی وجود سب میں مشترک ہے۔۔۔۔۔"

اب یہ ساری موجودات وجود میں تو مشترک ہیں، لیکن ان میں ہر ایک میں اپنی خصوصیات بھی ہیں جن کے سبب وہ ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی اپنی کتاب "ہمعات" میں وجود پر مفصل بحث کی ہے۔ اُس کے اُردو ترجمے سے اس بحث کا مختصر خلاصہ درجِ ذیل کیا جاتا ہے:۔

"زید ایک فرد ہے اس سے اوپر نوعِ انسان ہے اور نوع سے اوپر جنس کا مرتبہ ہے۔ یہ جنس حیوان ہے حیوان کی جنس میں نوعِ انسان بھی داخل ہے۔ اور جملہ حیوانات کی انواع بھی۔ جنس سے آگے جنسِ عالی کا مرتبہ ہے۔ اس میں حیوانات کے ساتھ ساتھ نباتات بھی شامل ہیں۔ اور اس سے اوپر جسم یعنی عرض کا مرتبہ ہے۔ اور عرض سے اوپر جوہر ہے۔"

اس جوہر و عرض سے اوپر اعلیٰ تر جو حقیقت ہے، اس کے بارے میں "حکماء" اور "اہلِ حق" میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"اس معاملے میں حکماء کا یہ حال ہے کہ وہ مظاہرِ وجود اور اس کے تعینات کی اصل کا سراغ لگاتے لگاتے اس مقام پر پہنچے اور یہاں پہنچ کر نہ صرف یہ کہ وہ رُک گئے، بلکہ انھوں نے قطعی طور پر یہ سمجھ لیا کہ جوہر و عرض کے درمیان کوئی ایسا علاقہ نہیں جو دونوں کو ایک جنس کے تحت جمع کر دے۔ لیکن اس کے برعکس اہلِ حق نے معلوم

کرلیا کہ جوہر و عرض دونوں کو ایک اور اعلیٰ تر حقیقت احاطہ کئے ہوتے ہے۔ لیکن حکماء اس حقیقت کا ادراک کرنے سے عاجز رہے کیونکہ اور حقائق کی طرح اس حقیقت کے احکام و آثار متعین نہیں کہ ان کی مدد سے یہ حکماء اس حقیقت کا سراغ لگا لیتے جو عرض و جوہر دونوں پر حاوی ہے۔ اس حقیقت جامع کا موزوں ترین نام "حقیقت وحدانیت" ہے۔ گو کبھی کبھی ہم اس حقیقت کو "وجود" بھی کہہ لیتے ہیں۔"

اس کی مزید وضاحت شاہ صاحبؒ یوں فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ ان سب (موجودات) سے اوپر اور ان سب کو جمع کرنے والی اور جو ان سب کا موضوع ہے، صورت جسمیہ ہے۔ جسے اشراقیین نے "مادۂ اولیٰ" کہا ہے۔ یہ صورت جسمیہ جو اثر پذیر مادہ بھی ہے اور علت فاعلیہ بھی، وجود کے اصل مرکز کی طرف راجع ہے۔ الغرض انواع کے ایک ایک فرد سے لے کر وجود اقصیٰ تک نظام کائنات کا یہ سارا سلسلہ نہایت مرتب اور منظم ہے اور نیچے سے اوپر تک اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے۔

"یہ وجود اقصیٰ اور بعد میں جن مظاہر میں اس کا ظہور ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کہ لکھے ہوئے حروف کے مقابلے میں سیاہ لکیر ہو یعنی ان حروف کی اصل تو سیاہ لکیر ہی ہے۔ گو بعد میں اسی لکیر نے حروف کی شکل اختیار کرلی۔ یا جیسے مختلف اعداد کی نسبت اکائی سے ہوتی ہے یعنی اکائی ہی سے تمام اعداد نکلتے ہیں۔ ایک ہی وجود میں مظاہر کی اس قدر کثرت کا واقعہ ہونا اس کی مثال دریا کی سمجھیے کہ اس میں لاتعداد موجیں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔

اس مسئلے میں صحیح ترین رائے یہ ہے کہ وجود وہ ہے جو خود اپنی ذات میں قائم ہے۔ اور مرتبہ وجود میں جبکہ کوئی اور چیز اس کے ساتھ ملحق نہیں ہوتی اور وہ خالص وجود ہوتا ہے تو وہ کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ وجود مختلف ماہیات میں ظہور کرتا ہے چنانچہ یہ ماہیات اسی وجود کے لئے قوالب بن جاتی ہیں۔ ان ماہیات میں سے ہر ماہیت کی اپنی ایک حیثیت اور اس کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"اب یہ سوال باقی رہا کہ یہ جامع حقیقت جو عرض و جوہر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، جس کا موزوں ترین نام ہم "حقیقت وحدانیت" بتا آئے ہیں، جسے ہم کبھی کبھی "وجود" بھی کہتے ہیں، آخر یہ حقیقت ہے کیا؟ ایک قوم کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت عین ذات الٰہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے

اسی حقیقت کو "لابشرط شئ"[1] "ذات بحت" سمجھا اور اسی کو وہ "بشرط لاشئ" "احدیت" کہتے ہیں۔ اور یہی اُن کے نزدیک "بشرط شئ" "واحدیت" ہے۔ ہمارے خیال میں ان لوگوں میں عقل و تدبر کی کمی تھی کہ انھوں نے اس غلط بات پر یقین کر لیا۔ ان کے برعکس فقیر نے اس امر کی تحقیق کی تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ وجود کے جس مرتبے پر جا کر اِن لوگوں کی نظر رُکی اور اُسے ہی انھوں نے غلطی سے ذاتِ بحت، احدیت اور واحدیت سمجھ لیا، وہ مرتبہ تو ظاہر الوجود کا تھا، جس کو ہم نفسِ کلیہ کہتے ہیں۔ . . . . اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہر شے میں جاری ساری اور ہر شے سے قریب ہے۔ اور اس کے باوجود یہ سب اشیاء سے پاک اور اُن کی تمام آلائشوں سے منزہ ہے۔

"نفسِ کلیہ کے مقابلے میں جو حیثیت ان اشیاء کی ہے، وہی حیثیت ذاتِ الٰہی کے مقابلے میں اس نفسِ کلیہ کی ہے۔ بلکہ نفسِ کلیہ اشیاء سے باوجود قرب کے جس قدر دُور ہے، اس سے سو گنا زیادہ ذاتِ الٰہی نفسِ کلیہ سے دور ہے۔ اسی طرح وہ اس کے تمام تعینات اور تقییدات کی حدبندیوں سے بھی مبرا ہے۔ ہاں اس ضمن میں ایک بات کا ضرور خیال رہے کہ نفسِ کلیہ اور اس سے اوپر وجود کے جو مراتب ہیں اُن پر ذاتِ الٰہی از قبیلِ ابداع[2] موثر ہوتی ہے نہ کہ از قسم خلق۔ ابداع سے مراد یہ ہے کہ مادہ کے بغیر عدم سے وجود کا صدور

---

[1] ذاتِ الٰہی سے کائنات کے تنزل کی صورت یوں بیان کی جاتی ہے :- ایک مقام تو خود "ذات" کا بحیثیت ذات کے ہے۔ اس مقام پر ہر شرط کی نفی کے ساتھ خود ذات کو اپنی ذات کا ادراک ہوتا ہے۔ یہاں سے تنزلات کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں پہلا مرتبہ "احدیت" کا ہے۔ اور "احدیت" کے بعد "واحدیت" کا مرتبہ ہے۔ اس "واحدیت" کو "باطن الوجود" بھی کہتے ہیں۔ "باطن الوجود" سے "وجودِ منبسط" کا ظہور ہوا جس کا دوسرا نام "ظاہر الوجود" بھی ہے۔ اس مرتبہ "ظاہر الوجود" کو "نفسِ کلیہ" کا نام دیا گیا ہے۔ "نفسِ کلیہ" سے ارواح، امثال اور اجساد ظاہر ہوئے۔

[2] شاہ صاحب کی کتاب "سطعات" میں ہے :- (وجود) در سہ مرتبہ است۔ ذات بحت و مرتبہ عقل و شخص اکبر۔ صدور مرتبہ عقل از ذاتِ بحت بہ طریقِ لزوم و اقتضائے ذات است مانندِ اقتضائے اربعہ زوج را در ذہن ما و مانندِ فیضانِ ضوا از قرص در خارج۔

اس طریقِ لزوم کو ابداع کہتے ہیں۔ سورج سے روشنی کا پھوٹنا یہ طریقِ لزوم ہے۔

ہ اور ایک چیز سے دوسری چیز کا پیدا ہونا خلق کہلاتا ہے۔

"الغرض نفس کلیہ اور ذات الٰہی میں خلق کی نہیں بلکہ ابداع کی نسبت ہے۔ اور ابداع کی نسبت کو عقل نسانی ادراک کرنے سے کلیتہً قاصر ہے۔ اس لئے نفس کلیہ اور ذات الٰہی میں فرق مراتب کرنا عقلاً ممکن نہیں۔ س لئے اگر کوئی شخص تسامح سے یہ کہہ دے کہ نفس کلیہ ذات الٰہی کا تنزل ہے تو اس کا یہ کہنا اجمالاً ایک وجہ رکھتا ہے......"

جیسا کہ "سطعات" میں ہے۔ وجود کے تین مرتبے ہیں:۔ ذات بحت، مرتبۂ عقل اور شخص اکبر۔ مرتبۂ عقل ذات بحت سے صدور بہ طریق لزوم ہے۔ اور شخص اکبر کا ذات بحت سے صدور مرتبۂ عقل کے صدور کی شرط سے ہے۔

غرض "سب موجودات کا سلسلہ ایک موجود اصلی پر تمام ہوتا ہے[1]"۔ اور یہ موجود اصلی نہ صرف خود موجود ہے لکہ اوروں کا وجود اس سے اس طرح نکلتا ہے۔ جیسے آفتاب سے شعاعیں[2]۔ اب شعاعیں اور چیز ہیں اور اُن کے در و دیوار پر پڑنے سے جو دھوپ پیدا ہوتی ہے وہ اور چیز۔ دھوپ میں ایک تو اُس کی "ذات" ہے۔ دوسرے اس کا "وجود"۔ اُس کا "وجود" تو عطیہ ہے آفتاب کی شعاعوں کا۔ اور اس کی "ذات" وہ ہے جو سے دوسروں سے متمیز کرتی ہے[3]۔

موجودات کی "ذات" اور ہے اور اُن کا "وجود" اور۔ مولانا محمد قاسمؒ "تقریر دلپذیر" میں اس یوں بحث فرماتے ہیں:۔

".....اس عالم کی ہر چیز کا چھوٹی سے لے کر بڑی تک "وجود" اور ہے اور "ذات" اور ہے۔ یعنی دو وجود ہیں

---

[1] تقریر دلپذیر مولانا محمد قاسمؒ۔

[2] "...شعاعیں بھی مثل آفتاب ہی کے اصل سے منور ہیں ہاں اتنی بات ہے کہ آفتاب کو نہیں پہنچتیں۔ کیونکہ اول تو وہ آفتاب سے پیدا ہوئیں۔ دوسرے وہ بات کہاں جو کہ آفتاب میں ہے۔ (تقریر دلپذیر)

[3] ذات اُسی کو کہتے ہیں جس سے تمیز حاصل ہو۔ جیسے مکان کے نقشے کو اُس کی ذات کہا جاتا ہے۔

ظاہری اور باطنی۔ سو باطنی وجود کو ذاتِ خداوندی سے کچھ اس قسم کی نسبت ہے جیسے شعاعوں کو آفتاب سے، اور وجودِ ظاہری کو بمنزلہ دھوپوں کے جو شعاعوں سے پیدا ہوتی ہیں اور ہر صحن اور ہر میدان میں جُدا جُدا نظر آتی ہیں۔ سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ جیسے دھوپ کبھی آتی ہے کبھی چلی جاتی ہے ایسے وجودِ ظاہری کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا اور جیسے آفتاب کے طفیل سے شعاعیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں، ایسے ہی خداوندکریم کے طفیل سے اس وجودِ باطنی کو بھی ہمیشہ قیام ہے۔ اب سُنیئے! کہ جیسے آفتاب کے نور سے اوّل شعاعیں پیدا ہوئیں اور بعد میں دھوپیں ظاہر ہوئیں اور اس ترتیب ہی کے سبب سے جس قدر ہر قسم کے کمال آفتاب کے کمالوں میں سے یعنی نور، گرمی وغیرہ شعاعوں کو ملے وہ دھوپوں کو نہیں ملے۔ کتنی ہی بڑی اور خوش قطع دھوپ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح وجودِ باطنی اوّل ہے اور وجودِ ظاہری بعد میں۔ بلکہ وجودِ ظاہری کو وجودِ باطنی ہی کا پَرتو سمجھنا چاہیئے۔ جیسے دھوپ شعاعوں کا پَرتو ہے۔ سو لازم ہے کہ وجودِ باطنی کو اوّل فیضِ ربّانی پہنچے۔ بعد میں وجودِ ظاہری تک جاتے۔ سو یہ نہیں ہوسکتا کہ ہمارے تمہارے وجودِ ظاہری تک حیات کا فیض پہنچ جائے اور اوروں کے وجودِ باطنی کو بھی خبر نہ ہو۔ کیونکہ وجودِ باطنی کسی کا ہو، ہر کسی کے وجودِ ظاہری سے مقدم ہے۔ جیسے شعاعیں کسی طرف کیوں نہ ہوں، ہر جگہ کی دھوپ سے اشرف اور مقدم ہیں۔۔۔۔۔"

موجودات کی "ذات" اور اُن کے "وجود" کا صدور آخر میں اُسی ایک وجود سے ہوتا ہے جس کا ایک مرتبہ ذاتِ بحت کا ہے۔ دوسرا عقل کا اور تیسرا شخص اکبر کا۔ اس وجود میں یہ سب کمال ہیں۔" .... ذاتِ خداوندی میں ایک ہوکر پھر سب کمال بھرے ہوئے ہیں۔ یعنی وہ ایک ہے۔ سب کمالوں کے کام کرتا ہے۔ جیسے ایک شخص کلکٹری اور مجسٹریٹی کے دونوں کام کرتا ہے۔ کام کے سبب دو نام ہوگئے ہیں ورنہ ہے وہ ایک ہی۔ ایسے ہی ذاتِ خداوندی بھی بسبب جدا جدا کاموں کے خالق، رازق، سمیع، بصیر کہلاتی ہے۔ اور جب یہ ہوا کہ وہ ایک ہے اور پھر سب کمال اُسی میں ہیں، تو اُس کا فیض بھی بے شک مجموعہ ساری خوبیوں کا ہوگا۔ اور جس جس کو وہ پہنچے، تھوڑا بہت اُس میں ہر قسم کا کمال ہونا چاہیئے۔" (تقریر دلپذیر)

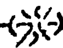
موجودات میں تھوڑے بہت جو بھی کمال پائے جاتے ہیں، یہ سب ذاتِ خداوندی کے فیوض میں سے ہیں۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کمالات کا مصدر و مبداء ہی ایک ہے۔ تو پھر اُن کے مظاہر میں یہ اختلاف

کیوں؟ مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں کہ یہ اختلافات قابلیتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"۔۔۔۔ جیسا آئینہ قلعی دار اور اینٹ پتھر میں آفتاب کا نور برابر پہنچتا ہے۔ پر جتنا زیادہ ظہور اُس نور کا آئینے میں ہوتا ہے۔ اُتنا پتھر میں نہیں ہوتا سو ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان کی حیات اور پتھر کی حیات یکساں ہونی چاہیئے بلکہ اتنی بات ہم یقیناً جانتے ہیں کہ جو حیات کا ظہور انسان میں ہوا ہے۔ وہ اور حیوانات میں نہیں کیونکہ انسان کے سے علوم اور کمالات کا ان میں پتہ نہیں۔ پھر جو بات کہ حیوانات میں پائی جاتی ہے۔ نباتات میں نہیں پائی جاتی اور جو بات نباتات یعنی درختوں میں ظاہر میں نظر آتی ہے، پتھر وغیرہ میں نہیں ۔۔۔۔ الغرض کسی میں حیات کا ظہور زیادہ ہے کسی میں کم۔ کوئی بالکل مردہ نظر آتا ہے۔ جیسے کوئی دم چُرا کر پڑ جاتا ہے۔ پر خالی کوئی نہیں۔ یہاں تک کہ پتھر وغیرہ کو اگر غور کیجئے تو بعضے بعضے حیات کے نشان اُن میں بھی نظر آتے ہیں ۔۔۔۔"

مختصراً جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اس عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں ایک تو "وجود" ہے۔ جسے آپ ظہورِ حیات کہہ لیجئے۔ دوسرے اُس کی "ذات" ہے۔ اپنی اپنی "ذات" کی وجہ سے تو ہر چیز دوسری چیز سے مختلف ہے لیکن ان سب میں "وجود" مشترک ہے۔ جو ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ اسی کو صوفیاء کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہا گیا ہے۔

انشاء اللہ آئندہ کی بحث اسی وحدت الوجود پر ہوگی۔



"نسبتوں کو سمجھنا فلسفہ کی اصل ہے۔ محض دلائل سے تائید اور تردید دونوں ہوسکتی ہیں۔ نسبت کے لئے موطن کا جاننا ضروری ہے۔ ایک چیز اصلی حالت میں ایک موطن میں ہوگی۔ اور اُس چیز کا ظل اس موطن میں نہیں، بلکہ دوسرے موطن میں ہوگا۔ وجود کا ایک موطن ہے۔ اور اس سے اوپر جو کچھ ہے وہ دوسرے موطن میں ہے۔ وجودیہ عینیہ ایک وجود کے موطن میں ذات کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور ہم ذات کا موطن اس وجود سے ماوراء مانتے ہیں۔"

(مولانا سندھیؒ)

افکار و آراء

ہم جنہیں اسلافِ کرام کہتے ہیں اور جن کی بزرگی کی قدر و وقعت ہمارے دلوں میں موجود ہے' وہ سب اپنے اپنے عہد میں اللہ کے نیک بندے تھے۔ اور تن من دھن سے اُسی دینِ اسلام کے پابند تھے جو حضرتِ آدمؑ سے خاتم النبیینؐ تک تمام انبیاء و رُسل کا دین تھا اور جو قیامت تک اللہ کے واحد دین کی حیثیت سے قائم رہے گا۔ عالمِ انسانی میں یہ دین سب سے زیادہ قدیم ہوا۔ اور جس فطرتِ انسانی کی فلاح کے لئے یہ دین ماضی حال اور مستقبل میں موجود ہے وہ فطرت بھی اتنی ہی قدیم ہوئی۔ بعض لوگ "قدیم" کے لفظ سے گھبراتے اور بدکتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ سب سے زیادہ قدیم یا قدیم ترین ہستی تو ذاتِ الوہیت کی ہے اور اسی لئے علمِ کلام میں اللہ کی اصطلاحی صفت "قدیم" ہے۔ اور اِس قدیم خلاقِ کائنات کی ہر مخلوق "حادث" کہلاتی ہے کیوں کہ وہ اپنے وجود سے پہلے غیر موجود تھی اور اللہ ہی اس کو وجود میں لایا ہے۔ انگریزی میں "کامن سینس" کا لفظ بہت عام ہے۔ اور اس حسِ عقلی کو رکھنے والا ہر انسان اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ہر اچھی چیز اچھی ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی پُرانی ہو۔ اور ہر بُری چیز بُری ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی نئی ہو۔ اور اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ خالقِ کائنات کے علاوہ اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ انسانی عقل تو صدیوں میں ایک چھوٹے سے کیڑے کے متعلق بھی صحیح معلومات نہیں حاصل کر سکتی۔ فلسفی جس راز کا انکشاف کرتا ہے وہ راز معہ اپنے انکشاف کے ایک اور معمّائی راز بن جاتا ہے۔ اور سائنسداں کے روزانہ بدلنے والے نظریات ہر نام نہاد "علم" کو "ظن" ثابت کرتے رہتے ہیں۔ اِن بدیہی باتوں پر مزید گفتگو کی حاجت نہیں ہے۔

معبودِ حقیقی نے پہلے انسان اور پہلے نبی حضرت آدمؑ کی وفات کے بعد مختلف ادوار میں متعدد انبیاء کو مبعوث کیا جن میں سے بہتوں کا ذکر معہ اُن کے اہم اقوال و حالات کے آخری کتابِ الٰہی "قرآن" میں درج ہے۔ توحید، رسالت، آخرت، معروف، منکر وغیرہ کے متعلق سب انبیاء ایک ہی بات کہتے ہیں اور ایک ہی معیار پیش کرتے ہیں اور اپنے سے سابق انبیاء کا ذکر کرکے صاف صاف فرماتے ہیں کہ میں وہی بات تو کہہ رہا ہوں جو پہلے تمام انبیاء کہتے چلے آتے ہیں۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرتِ انسانی کبھی نہیں بدلتی۔ لاتبدیل لخلق اللہ۔ اللہ کے بنائے ہوئے آسمان اور زمین، سیارے اور فضائیں، سمندر اور پہاڑ، زمان اور مکان، یہ سب بھی آغازِ آفرینش سے اسی طرح آج تک چلے آرہے ہیں۔ کوئی چیز نہیں بدلی۔ دن اور رات کا نظام تک نہیں بدلا جیوانات اور جمادات کا تسلسل بھی اُسی طرح جاری ہے۔ پرندے بھی حسبِ دستورِ سابق اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کر رہے ہیں ؎

کز ثریٰ تا بہ ثریا بہ عبودیت اند ہمہ در ذکر و مُناجات و قیام اند و قعود (سعدیؒ)

آخری رسولؐ کے مخالفین نے "فرمائش" کی کہ کوئی دوسرا قرآن لے آیئے یا اسی کو بدل دیجئے، لیکن انھیں جواب دیا گیا کہ یہ تو وحیِ الٰہی کا اتباع ہے۔ اپنے نفس کا القاء نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک جسمِ انسانی کے اندر اور باہر کی تمام فضا جب ابتدائے تخلیقِ عالم سے آج تک ایک ہی ہے تو ایک نئے دین کا مطالبہ کیسا؟ انسان کی خواہشات نہ معلوم کتنی ہیں لیکن جائز خواہشات مثلاً حلال کھانا پینا پہننا اور ایک مختصر مکان بنانا وغیرہ تعداد میں محدود ہیں۔ اور بہت کم ہیں بمقابلہ اُن ناجائز خواہشات کے جن کی تعداد کا کوئی ٹھکانا نہیں اور جن کے "رنگ" بھی روز و شب افزوں ہیں پھر ہر جائز خواہش کی تکمیل کا جائز طریقہ، یہ طریقے تو بہت کم ہیں اور اکثر اپنی پرانی شکلوں پر قائم ہیں لیکن جائز خواہشات کی تکمیل کے ناجائز طریقے اور پھر ہر ناجائز خواہش کی تکمیل کا طریقہ، یہ طریقے تو اتنے زیادہ ہیں کہ بے گنتی معلوم ہوتے ہیں اور برابر بدلتے بھی رہتے ہیں اور بڑھتے بھی رہتے ہیں۔ اور صرف انھیں "طریقوں" (جن کا معصیت ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں) کی "بوقلمونی" کے باعث کسی "عصرِ حاضر" کے "دانشمندوں" کا یہ نعرہ کس قدر غیر دانشمندانہ ہے کہ "دنیا بدل گئی ہے، زمانہ بدل گیا ہے، وہ دین اب نہیں چل سکتا....."

نہ دنیا بدلتی ہے، نہ زمانہ بدلتا ہے، نہ انسانی فطرت بدلتی ہے، نہ جائز خواہشات بدلتی ہیں، نہ

نیک وبد کا معیار بدلتا ہے۔ ہاں جائز خواہشات کی تکمیل کے ناجائز طریقے اور ہر ناجائز خواہش کی تکمیل کے طریقے واقعتہً بدلتے رہتے ہیں۔ غلط کار انسان اِن تبدیلیوں کو وجود میں لاتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ان "فاسقانہ جدتوں" کی وجہ سے فطرتِ انسانی کا خدائی دین کیوں بدل دیا جائے؟ اگر کسی زمانہ میں دنیا کی شہری آبادی نے جو ایک مختصر اقلیت ہوتی ہے۔ یا بغرضِ محال اکثریت نے، کھانے پینے پہننے اور مکان بنانے کے سلسلہ میں اور سفر کرنے کے لئے کچھ مشینوں کا استعمال اپنے اوپر لازم قرار دے لیا تو چند جائز خواہشات کی تکمیل کے لئے اِن بے جان مشینوں کے استعمال سے بھی دین کے احکام میں کسی تبدیلی کے مطالبہ کا جواز کہاں سے نکل آئے گا۔ البتہ اگر ان مشینوں کی وجہ سے کسی کا جانی، بدنی یا مالی نقصان ہوگا تو بے شک صاحبِ مشین ہی اس کا ذمہ دار ہوگا۔ اس لئے جو لوگ بہت زیادہ محتاط ہوں گے وہ خود ہی مشینوں کے استعمال سے حتی الامکان احتراز برتیں گے۔

مذکورہ حقایق کی روشنی میں فرنگی مستشرقین کا یہ مطالبہ بالکل بے بنیاد نظر آتا ہے کہ دین میں تبدیلی ہونا چاہیئے۔ یہ تو وہی لادین اشخاص ہیں جو ماضی بعید سے آج تک باطل پر قائم رہتے ہوئے حق کی مخالفت کا یہ "علمی فیشن" اختیار کرتے ہیں۔ کہ ایسا کھوکھلا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔ حیرت ہے اُن اپنے کو "مسلم" کہنے اور سمجھنے والوں پر جو دانستہ یا نادانستہ اسی قسم کا مطالبہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور جب اس مطالبہ کا کھوکھلا ہونا اُن پر واضح کر دیا جاتا ہے تو اس قسم کی کوئی احمقانہ بات بول دیتے ہیں جو ایک سمجھ دار بچہ بھی کبھی نہیں بولے گا۔ مثلاً "رسالتمآبؐ ایسا جوتا نہیں پہنتے تھے تو پھر آپ کیوں پہنتے ہیں۔۔۔" وقس علی ہذا۔ غرق ہوتے وقت تنکے کا سہارا کیا کام دے سکتا ہے؟۔

باطل کے حاشیہ برداروں کے ترکش میں تیروں کی کمی نہیں۔ خواص وعوام کے دلوں میں اسلافِ کرام کا احترام دیکھ کر یہ چال چلی جاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً اور اکثر فرنگی مستشرقین ہی کی نقالی میں کسی سلف کا نام لے کر یہ کہا جاتا ہے کہ "وہ بھی تو متجدد تھے۔ دین کو زمانے کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ فلاں کتاب کے اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟۔۔۔۔" لیکن ہم اس "سادگی" پر متعجب کیوں ہوں؟۔ یہ کوئی غیر معمولی سانحہ نہیں ہے۔ تاریخِ عالم تو ان تلخ ترین باتوں سے بھری پڑی ہے۔ کہ "تجدد" کے نعرہ بازوں نے انبیاءؑ کو بھی

اِسی طرح غلط باتیں کہہ کر "بدنام" کیا۔ توراۃ اور انجیل کے موجودہ نسخے دیکھ لیجئے۔ اور ایسے بھی اظلم گذرے ہیں جنھوں نے خلاّقِ عالم کو بھی نہیں چھوڑا۔ یونانی ادب پڑھ لیجئے۔!

"شاہ ولی اللہ اکاڈمی" کے قیام کے بعد ہی کسی مستشرق نے بھرے مجمع میں یہاں اِسی قسم کی بات کہہ دی اور روزناموں نے بڑی "مسرّت" سے سرخیاں شائع کر دیں کہ "شاہ صاحب بھی تو دین کو زمانہ کے مطابق بدلنا چاہتے تھے"۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا سمجھتا کہ ہم اپنے اسلاف کو اس لئے محترم نہیں سمجھتے کہ وہ بذاتِ خود "معصوم معبود" ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اللہ کی اطاعت بدرجۂ احسن کرتے تھے اور ہمیں یقین ہے کہ اللہ کے محسن اور مومن بندے ایسی بھونڈی باتیں کبھی نہیں کرتے۔ اِن حضرات کا دماغی توازن بھی تا دمِ مرگ بفضلہٖ برقرار رہا۔ وہ کبھی "مجذوب" نہیں ہوئے۔ لہٰذا اُن کی طرف اس قسم کی غیر ذمّہ دارانہ بات اگر کسی کتاب میں بھی نظر آجائے تو وہ رَد کر دی جائے گی۔ اور الحاقی سمجھی جائے گی۔ کیونکہ صحیح حدیث کی حفاظت کے لئے جس "علم الرجال" پر عمل کیا گیا وہ اور کسی کتابِ انسانی کے لئے نہیں کیا گیا۔ کیا یہ واقعہ ظہور پذیر نہیں ہو چکا ہے کہ ایک غیر معروف مصنّف کی ایک سراپا افسانہ دافسوں کتاب شاہ ولی اللہؒ کے نام سے چھپی ہوئی موجود ہے؟ دوسرے اسلافِ کرام کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاؤ کیا گیا ہے۔

حضرات صحابہؓ و تابعین کے بعد ابو حنیفہؒ، ابن تیمیہؒ، عبد القادر جیلانیؒ، محمدؒ ابن عبد الوہابؒ اور اقبالؒ اور نہ معلوم کتنے اور نام ہیں جنھیں کبھی کبھی اِس "مطلب براری" کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو مسلم عوام و خواص میں مقبول ہو جاتا ہے اُس کے نام سے "فائدہ" اٹھانا آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اسلاف پر تجدّد کا اتہام لگانے والے متجددین کو یہ بھی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمانوں کے لئے "حکم" کا مرتبہ قرآن اور سیرتِ خاتم النبیینؐ کو حاصل ہے۔ اور اِس لئے اسلاف کا نام لے کر ایسی "کوشش" کرنا بے سود ہوگا۔ ہر مسلم کا ایمان توحید، رسالت اور آخرت پر مبنی ہے۔ اسلاف پر "ایمان" نہیں ہوتا ہے۔ اُن کا "احترام" ہوتا ہے اور احترام اِسی لئے ہوتا ہے کہ وہ کامل الایمان حضرات اپنے اخلاف سے علماً اور عملاً بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔ ورنہ "محض اسلاف پرستی" کسی مسلم کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اگر خدانخواستہ 'بفرضِ محال' کوئی ضدی اِس بات پر اَڑ جائے کہ "نہیں۔۔۔ فلاں سَلَف نے یہی کہا تھا۔ اب تو تمھیں ماننا پڑے گا کیونکہ تم ان کا اتباع کرتے ہو۔۔۔۔" تو ہر متبعِ شریعت مسلم کا جواب

یہی ہوگا کہ "ہم اُس سلف کا احترام نہیں کرتے ہیں جو ایسی غلط بات کہتا ہے۔ ہم غلط باتیں اور غلط کام کرنے والے اسلاف کا احترام نہیں کرتے . . . . ."

اسلاف کے اعمالِ صالحہ کا احترام کیا جاتا ہے۔ اُن کے ناموں کی پرستش نہیں کی جاتی ہے۔ اِس حقیقت کی توضیح کے بعد قرآن اور سیرتِ نبوی کے بجائے محض اسلاف کا نام لے کر تجدد کی دعوت دینا ایک لایعنی فعل ہے۔ آج دنیائے انسانی 'جدید فرنگی جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے بعموجٌ من فوقہ موج من فوقہ سحاب"۔ ظلمات میں ہاتھ پر ہاتھ نہیں دکھائی دیتا ہے۔ روحانی 'ذہنی' اعصابی اور جسمانی امراض نے گمراہ انسان کی زندگی کو جہنم کے عذاب کا پیش خیمہ بنا دیا ہے۔ اِس باطل تہذیب و تمدن کو نیست کرنے کے لئے فرعونی اور ثمودی طاقتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن اور سیرت النبیؐ کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی زندگیوں کی ضرورت ہے۔ وہی ایمانی اور ایقانی اسلحہ جن سے پہلی صدی ہجری میں ہمارے اسلاف نے میدانِ جہاد میں اُس دور کی دو نوں "بڑی" طاقتوں کو مغلوب کر دیا تھا اور پھر پوری کامیابی کے ساتھ اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو قائم کیا تھا۔

سے دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش　　　تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ　　　ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا　　　مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا (اقبالؒ)

(پروفیسر) خالد عمر صدر شعبہ فارسی سندھ مسلم کالج - کراچی

(پورے کا پورا مراسلہ بغیر کسی اضافے اور کمی کے مراسلہ نگار صاحب کے حسبِ ارشاد شائع کر دیا گیا ہے)

ماہنامہ "الرحیم" کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات کی روشنی میں ہمارے موجودہ قدامت پسندی اور رجعت پرستی کے ماحول میں فکری تازگی اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے۔ اگرچہ میں اُس کے حق میں ہوں، لیکن معاف کیجئے گا اگر میں یہ کہوں کہ آپ کی یہ کوشش ریت میں ہل چلانے کے مصداق ہے کیونکہ اِس طرح کی کوششیں نہ پہلے بار آور ہو سکی ہیں اور نہ آپ کی یہ کوشش بار آور ہوگی اور ہمارے معاشرے پر صدیوں سے جو جمود اور آگے کے بجائے ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھنے کا رجحان مسلط ہے وہ بحالہ قائم رہے گا'

چنانچہ جہاں دنیا کی دوسری قومیں کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گی وہاں ہمارا شمار پہلے کی طرح "نحن ھٰھنا قاعدون" ہی میں ہوتا رہے گا۔

ہماری تاریخ کا وہ دور جس میں اسلامی فکر ایک متحرک، فعال اور ترقی پذیر طاقت تھی، عملاً سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد جمود اور رجعت پرستی کا جو اندھیرا چھایا ہے تو وہ اب تک نہیں چھٹ سکا گو گزشتہ سالوں میں عالم اسلام نے سیاسی میدان میں بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن جہاں تک اس کے فکر و ذہن کا بالخصوص مذہب کے معاملے میں تعلق ہے۔ اس کا وہی حال ہے، جو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اور اس تک روشنی کی کرنیں نہیں پہنچ سکیں۔

مجھے تسلیم ہے کہ ان صدیوں میں ہمارے ہاں بعض بڑے بڑے اصحاب علم و فکر پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے زمانے میں اور اپنے حالات کے مطابق اس ہمہ گیر جمود اور رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد بھی کی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عموماً ایک صاحب علم و فکر کے بعد بجائے اس کے کہ اس کے جانشین اور مسترشد اس کی پیدا کی ہوئی ذہنی بیداری کے دائرے کو وسیع کرتے اور اس کو اور آگے بڑھاتے، وہ پھر اسی جمود و قدامت کی طرف لوٹتے رہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان صدیوں میں یورپی ذہن نے تو نئی سے نئی دنیائیں تخلیق کر ڈالیں اور ہمارے علماء وہی پرانی لکیر پیٹتے رہے اور ان کا سارا زور اسلاف پرستی پر رہا۔

مثال کے طور پر امام ابن تیمیہؒ کی فکری تجدید مذہبی علوم کے محدود دائروں سے باہر نہ نکل سکی اور بعد میں ان کے متوسلین فقہی امور میں زیادہ تر تقلید و عدم تقلید کی بحثوں میں الجھ کر رہ گئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک اسلامی فکر کو ایک نئے نہج پر ڈال سکتی تھی۔ لیکن اس کا حاصل محض "مسلم فسطائیت" کی شکل میں نکلا۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب کو لیجئے بے شک انھوں نے اپنے دور میں نئے فکر کی شمع جلائی، لیکن ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے والد کے دوسرے علوم کو تو پھیلایا لیکن اس نئے فکر کو آگے نہیں بڑھایا۔ اور تو اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ "عبقات" لکھ کر دوسری راہ پر پڑ گئے جس میں یقیناً قدامت پر زیادہ زور تھا۔ اور تجدید و تخلیق پر کم۔ سب سے بڑی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ گو دارالعلوم دیوبند سلسلۂ ولی اللہی کی ایک علمی کڑی تھا، لیکن اس میں شاہ صاحبؒ کے تجدیدی و تخلیقی فکر کی دعوت نہیں دی گئی۔ بس ایک مولانا

محمد قاسمؒ تھے جن کے دم سے حکمتِ ولی اللہی زندہ رہی۔ اُن کے بعد دارالعلوم سرے سے فکرِ تازہ سے ہی محروم ہوگیا۔

سرزمین نجد کے شیخ محمدؒ بن عبدالوہاب کی دعوت سے اہلِ نجد کو سیاسی اقتدار تو مل گیا لیکن کیا اسلام کی اس تجدیدی دعوت سے اُن کے ہاں کوئی ذہنی بیداری بھی پیدا ہوئی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ذہنی لحاظ سے ہم سے زیادہ یورپ کے غلام بن گئے۔ اتاترک نے ترکی میں بڑی دُور رس انقلابی اصلاحات کیں۔ اور وہاں کی سیاسی وسماجی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ بدل دیا لیکن آج ترک اکثریت اپنے ذہن وفکر میں کس مقام پر ہے؟

خود ہمارے ہاں سرسید کی آزادیِ فکر سے علی گڑھ نے کیا فائدہ اُٹھایا۔ مولانا شبلیؒ نے "الکلام اور علم الکلام" لکھ کر اور سیاسی "ٹوڈیت" کی مخالفت کرکے نوجوان ذہن میں ایک نئی حرکت پیدا کی تھی لیکن اُن کے جانشین سید سلیمان ندوی صاحب اور اُن سے منتسب ادارہ بعد میں قدامت ورجعت کے نقیب بن کر رہ گئے۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ ہم میں سے کسی صاحبِ علم وفکر کا اگر کوئی قدم آگے کو اُٹھتا ہے، تو اس کے بعد آنے والے اُس کے ہم قدم ہوکر آگے کیوں نہیں بڑھتے بلکہ اُن کے ہاں اُلٹی رجعتِ قہقری ہوتی ہے۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟

یورپ کے سیاسی استیلاء اور اُس کے نتیجے میں ہمارے ہاں جدید علوم وفنون اور جدید تہذیب وتمدن کو ایک حد تک جو فروغ ہوا ہے، ایک تو اس کا دائرہ بہت محدود ہے۔ دوسرے ہمارے عوام کی غالب اکثریت میں جدید علوم وفنون اور جدید تہذیب وتمدن کے بارے میں بہت کچھ ذہنی مغائرت ہے، جو اکثر اوقات منافرت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس مغائرت ومنافرت کے پیچھے ہمارا وہ مذہبی ذہن کارفرما ہے جو صدیوں کی روایات واثرات سے بنا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ ہر نیا فکر جو مروجہ قدامت پرستی سے الگ ہو۔ عوام میں زیادہ مقبول نہیں ہو پاتا، چنانچہ اس نئے فکر کے داعی کے بعد جب اُس کے جانشینوں کو عوام میں جانا پڑتا ہے تو لامحالہ وہ مجبور ہوتے ہیں کہ وہ نئے فکر پر زیادہ زور نہ دیں، اور عوام کے معتقدات سے کسی نہ کسی حد تک سمجھوتہ کریں۔ مثال کے طور سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے "ترجمان القرآن" کی جب تک کہ وہ حیدرآباد دکن میں رہے، فکری پرواز بڑی اونچی تھی، لیکن اُس وقت وہ چند سو سے زیادہ نہیں چھپتا تھا۔

لیکن جب دوران فکری بلندیوں سے نیچے اترا' اور قدرے عوامی سطح پر آگیا تو اس کی اشاعت بہت بڑھ گئی۔ یہی حال دیوبند' علی گڑھ اور ادارہ المصنفین کا ہے۔ ان کے مخاطب جو طبقے تھے اُن کی غالب اکثریت کے ساتھ فکری و عملی ہم آہنگی کے بغیر یہ کبھی اتنے مقبول نہ ہو پاتے۔

اس تمام گفتگو سے میرا مطلب یہ ہے کہ اسلاف پرستی' قدامت پرستی اور اس کی وجہ سے جمود و رجعت پسندی ہمارے عوام کی غالب اکثریت کا عام رجحان ہے۔ اور وہ ہر جدید فکر اور ہر جدید چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اس لئے "الرحیم" یا "الرحیم" کی طرح کے اور نقیبان اصلاح و ترقی کی سب کوششیں اس وقت تک بے ثمر رہیں گی۔ جب تک یہ جمود نہیں ٹوٹتا۔ اور آپ یقین کریں کہ جمود باتوں سے خواہ وہ کتنی بلند افکاری حامل ہوں نہیں ٹوٹا کرتا۔ اس کے لئے "عصائے کلیمی" کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس دور میں صنعتی انقلاب ہے۔

مسلمانوں کا نظام معیشت بدلیئے اِس سے اُن کا سماج بدلے گا۔ اور جب معیشت اور سماج میں تبدیلیاں آئیں گی تو نظریں صرف پیچھے دیکھنے پر مرکوز نہیں ہوں گی۔ بلکہ وہ آگے بھی دیکھنے لگیں گی۔ اس سے ہر جدید چیز سے نفرت کم ہوگی۔ اور ذہن آزادی سے سوچنے لگے گا۔ اسی طرح جمود کا دور دورہ ختم ہوگا۔ اور صرف اسی طرح ختم ہوگا۔ اگر صرف حکمت و فلسفہ سے کام چلتا تو آج سے دوسو سال پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ تمام کوششیں کیوں بے ثمر رہتیں۔

میرے نزدیک یہ اصل مسئلہ ہے اور اسے اوّلیت دینی چاہیئے۔

الطاف جاوید

مارٹن روڈ۔ کراچی

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی



لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اُس کا ایک پرانا قلمی نسخہ، جو اغلاط سے پُر تھا، ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اُس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں ''وجود'' اور اُس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اُس پر بحث کی ہے، اور اپنی الٰہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ قیمت دو روپے

—:o:—

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اُردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۷.۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدرآباد - پاکستان

thly 'AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی
واشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُ
جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کا
کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم
کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

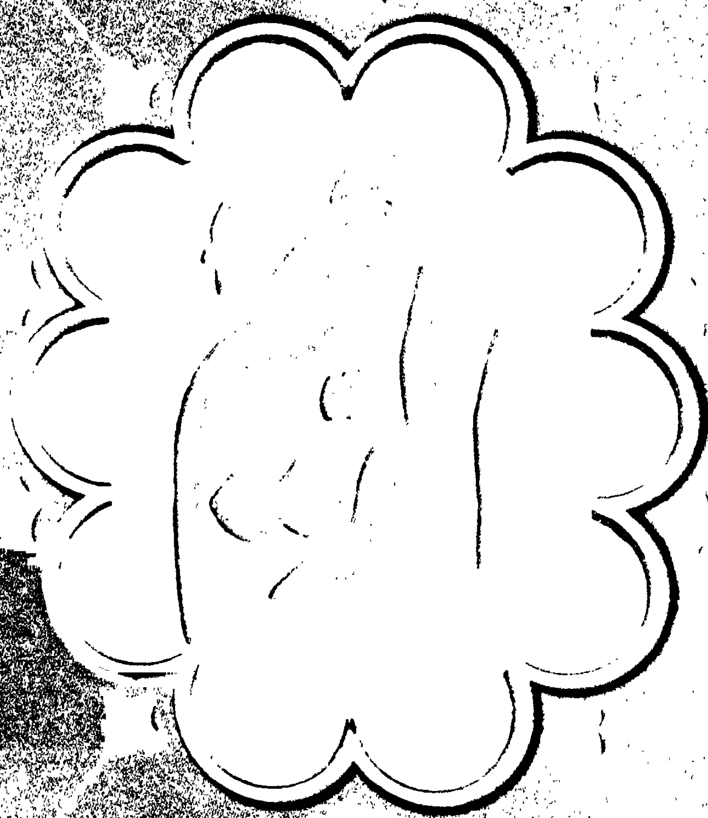
۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللّٰہی اور اس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے انہیں فروغ دینے
غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شا



محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا



قیمت سالیانہ :- آٹھ روپے
فی پرچہ :- پچھتر پیسے

الرحیم
حیدرآباد

جلد ۱ ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ مطابق مئی ۱۹۶۴ء نمبر ۱۲

فہرستِ مضامین

شذرات

جامعہ ازہر کی دعوت پر قاہرہ میں علمائے اسلام کی جو مؤتمر ہو رہی تھی، ان صفحات میں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس مؤتمر میں کوئی ۳۹ ملکوں کے علماء نے حصہ لیا، اور اس کے اجلاس ۶ر مارچ سے ۲۳ر مارچ تک ہوتے رہے۔ ایک اہل قلم عالم کے الفاظ میں جو اس مؤتمر میں شریک ہو "...... مندوبین نے جو تقریریں کیں، وہ بڑی دلچسپ، معلومات افزا اور امید آفریں تھی۔ انہیں سن کر محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں میں دینی شعور اور اپنی ملی تنظیم و اصلاح و ترقی کا جذبہ اب ہر جگہ پایا جاتا ہے اور دو سو ڈھائی سو برس سے اسلام کی جو طاقتیں اور قوتیں مغربی استعمار کے زیر اثر پراگندہ و منتشر تھیں، اسلام نے ان کو از سر نو جمع کرنا اور سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔"

یہی بزرگ مؤتمر کے دوران "مدینۃ الجامعہ" کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- "یعنی اب جامعہ ازہر کے لئے ایک مستقل شہر ہی الگ بن رہا ہے، جس میں طلباء اور طالبات کے لئے الگ الگ مختلف علوم و فنون کے کالج، ہوسٹل، لائبریری، اسمبلی ہال، کھیل کے میدان، رستوران اور بازار اور پارک اور تیرنے کے تالاب، غرضکہ یہاں ہر وہ چیز ہوگی جس کی ضرورت یونیورسٹی کے طلباء کو ہوتی ہے۔"

یہ مستقل شہر دنیا کی اس قدیم ترین موجود جامعہ کے لئے بنایا جا رہا ہے، جہاں کچھ ہی عرصہ

پہلے نہ صرف علوم و فنون میں، بلکہ لباس، رہنے سہنے اور زندگی کے ہر شعبے تک میں قدامت کو علمائے دین کا خصوصی امتیاز سمجھا جاتا تھا اور ہر تجدید خواہ وہ ضروری سے ضروری فن کو داخل نصاب کرنے کے متعلق ہوتی، بدعت اور ضلالت قرار پاتی۔ ابھی سو سال بھی نہیں ہوئے سید جمال الدین افغانی اس برصغیر سے مصر پہنچے، اور جب انہوں نے اس جامعہ میں خود مسلمانوں کے علوم حکمیہ پڑھانے کا کہا، تو جامعہ مذکور کے ارباب اقتدار علماء جن کا دائرۂ درس و تدریس ایک خاص نوع کے نقلی علوم تک ہی محدود تھا، ان کے خلاف ہو گئے، اور ان کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا گیا۔ اس ہزار سالہ جامعہ کی اب یوں جون بدل رہی ہے۔ اور اسے قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کا بھی مرکز بنایا جا رہا ہے۔

مصر اور بعض دوسرے عربی ممالک کو یہ فائدہ ہے کہ وہاں ایک عرصہ دراز سے اوقاف کا مستقل نظام چلا آ رہا ہے، جس کے ماتحت بالعموم تمام مساجد دینی مدارس اور مزارات وغیرہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر ان ملکوں کی حکومتیں نئے زمانے کے تقاضوں اور اپنے مسلمانوں عوام کی بہبود کے پیش نظر اس سلسلے میں مناسب اصلاحات کرنی چاہیں، تو انتظامی لحاظ سے انہیں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ اور آج اس دور میں ایک مسلمان قومی حکومت صرف اپنے مسلمان عوام کی سیاسی آزادی، معاشی خوشحالی اور معاشرتی ترقی ہی کی ذمہ دار نہیں بلکہ مسلمان عوام کی نمائندہ اور ان کی مرضی کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان امور کو جن کا تعلق مساجد، دینی مدارس، مزارات اور دوسرے مذہبی اداروں سے ہے اور جو قوم، ملک اور عوام کی زندگی میں سیاست اور معیشت سے کچھ کم اثر انداز نہیں ہوتے، نظر انداز نہ کرے اور ان کی اصلاح و بہتری کو بھی قومی تعمیر نو کا ایک حصہ اور بڑا اہم حصہ سمجھے۔

ہر ترقی خواہ اور باشعور مسلمان قومی حکومت کو اس فرض سے عہدہ برآ ہونا ہے اور پاکستان اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا

اکثر مزارات اور بہت سی مساجد محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی تحویل میں آ چکی ہیں اور اسلامی اور قومی زندگی کی تعمیر نو کے سلسلے میں جو منزل ہمارے سامنے ہونی چاہیئے بحمد اللہ اس کی طرف پہلا قدم اٹھا لیا گیا ہے

ظاہر ہے یہ سلسلۂ نظام اور آگے بڑھے گا اور زیادہ وسیع ہوگا بے شک اسے آگے بڑھانے اور وسیع کر[نے] میں تدریج کی ضرورت ہے لیکن یہ منزل جتنی جلد قریب آئے پاکستان کی اسلامی و قومی زندگی کے لئے اچھ[ا] ہوگا۔ اور اس میں تذبذب و تاخیر موجب مفاسد ہوگی۔

اس ضمن میں ایک مسئلہ دینی مدارس کا ہے اس کی طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے مولانا محمد اسمٰعیل امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کے ایک اجتماع میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے دینی مدا[رس] کا ذکر فرمایا کہ چھوٹے چھوٹے مدارس کاروباری انداز اختیار کر گئے ہیں اور ہماری یہ درس گاہیں جو کام کر رہی ہیں، یہ مستقل تشنگی اور استعجا[ب] ... تعلیم کو منظم ہونا چاہیئے۔ چھوٹی درس گاہوں کا تعلق بڑی جامعہ یا کلیہ سے ہونا چاہیئے۔ نصاب میں توازن ہونا چاہیئے۔ طلبہ کی نقل و حرکت پر پابندی عائد ہونی چاہیئے۔ سرٹیفکیٹ کے سلسلے سے انہیں پابند کر دینا چاہیئے صحیح طور پر تو یہ نظام اس وقت چل سکتا ہے کہ حکومت اس ذمہ داری کو عقیدت اور ہمدردی کے جذبات سے سنبھالے۔

اس ضمن میں مولانا موصوف نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "سر دست حکومت کے لئے یہ کام مشکل ہے۔" لیکن کیا اس وقت ایسے نظام کی، جو ہماری دینی تعلیم کو پوری طرح منظم کر دے کسی طرح بھی نہیں ڈالی جا سکتی۔ مولانا ممدوح کے خطبے کے یہ جملے پڑھنے کے بعد ہماری نظریں بڑی پرشوق توقعات کے ساتھ بے اختیار جامعہ اسلامیہ بہاولپور (محکمۂ اوقاف) کے فاضل علم دوست اور علم پرور ناظم اعلیٰ شیخ محمد اکرام ... کی طرف اٹھ گئیں۔

سندھ کے دینی و علمی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج و اندوہ سے سنی جائیگی کہ پچھلے دنوں مولانا الحاج عبدالکریم چشتی اور مولانا محمد عثمان سندھی رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا چشتی حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ کے مسترشد تھے اور انہیں کا فیض تھا کہ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ استخلاص وطن کی جدوجہد میں گزرا۔ اور آپ نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں آپ صاحب قلم بھی تھے اور صاحب بیان بھی۔ سندھی اور اردو میں بیسیوں کتابیں آپ کی تصنیف ہیں۔

مولانا محمد عثمان سندھی حضرت سید انور شاہؒ کے اولیں تلامذہ میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ حجاز تشریف لے گئے، لیکن اپنے مرشد حضرت امروٹی صاحبؒ کے اصرار پر وطن لوٹے اور ساری عمر درس و تدریس کے لئے وقف کر دی مولانا مرحوم حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم کی نشر و اشاعت سے بڑا شغف رکھتے تھے چنانچہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام میں ان کی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے ـــــ خدا تعالیٰ ہمارے ان بزرگوں کو مغفرت عطا فرمائے۔

تصوّف

پروفیسر محمد احمد پرنسپل اسلامیہ کالج سکھر

مغربی تعلیم کی جملہ خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ مغربی تعلیم یافتہ حضرات مغربی مفکروں کی تعلیم کی روشنی میں اپنی ہر طرز زندگی کو عموماً اور دین کے اصولوں کو خصوصاً پرکھا کرتے ہیں اور پھر چند نتیجوں پر پہنچ جاتے ہیں جن کو وہ سچ کی آخری منزل سمجھ کر ان پر ایک کٹر اور متشدد کی حیثیت سے اڑ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ علمائے کرام و صوفیائے عظام ان کے نتائج کو حق مان کر قبول کر لیں اور چونکہ ایسا نہیں ہوتا وہ ان صاحبان کو نازیبا الفاظ سے یاد فرمانے لگتے ہیں اور ان بزرگوں کو اپنے نقد و نظر کے تیر کا شکار بنانے میں دلی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ان ناقدین حضرات میں چند ایسے بھی مشہور و معروف مفکرین شامل ہیں جو دین میں اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اتباعِ عقل کو ترجیح دیتے ہیں۔

آیئے ہم ناقدین تصوف کی تنقید کا اصولی طور سے جائزہ لیں۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اسلام میں تصوف کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ دوسرے مذاہب کا اثر ہے یہ اعتراض کم علمی پر مبنی ہے۔ اسلام کی تکمیل پانچ اجزاء سے ہوتی ہے اولاً عقائد۔ دوئم عبادات سوئم معاملات۔ چہارم معاشرت۔ پنجم اصلاح قلب جس کو تزکیۂ نفس، تصوف یا صوفی ازم کے الفاظ

FANATIC ے

سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اسے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کبر، عجب، حسد، غیبت، حبِّ دنیا، حبِّ دنیا وغیرہ انسان کے دل کی بیماریاں ہیں اور ان سے چھٹکارا ظاہری علوم سے نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ظاہری علوم تو اکثر ان بیماریوں میں اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ ان بیماریوں کا علاج روحانی ڈاکٹروں کے اسپتالوں یعنی صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال بھی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود اور موجب نجات اور اس کی کدورت اور میلا پن موجب ہلاکت ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ارشاد فرماتے ہیں۔

بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا ناکام رہا۔

اس دن مال و اولاد کام نہ آئیں گے مگر جو شخص اللہ تعالیٰ کے پاس سلامت قلب لیکر آیا۔

پس تصوف دین کا ایک اہم شعبہ ہے جس سے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت مختصر اور عام فہم الفاظ میں یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالےٰ کے بارے میں بندہ کے قلب کو ایسا یقین و اطمینان نصیب ہو جائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدہ سے ہو جایا کرتا ہے پھر اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ سے عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے قلب ہمہ دم اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت و محبت سے معمور رہے۔ یہ عین کمال دین و ایمان ہے۔ پھر اس نورِ یقین اور احسانی کیفیت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے مقابلہ میں سارے تعلقات فنا ہو جاتے ہیں پھر اس کے تمام ظاہری و باطنی اعمال مثلاً دوستی، دشمنی، کسی سے ملنا یا نہ ملنا اور لینا اور دینا سب اللہ ہی کے لئے ہونے لگتے ہیں۔ یہی مقام اخلاص ہے[۱]۔ حضرت مجذوبؒ فرماتے ہیں۔

مصرعہ تمنا دل سے رخصت ہو گئی

اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

ناقدین تصوف کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اسلام کو اور مسلمانوں کو تصوف نے تباہ و برباد کیا ہے اس کو وہ افیون کا انجکشن کہتے ہیں، جس سے قوائے عمل فالج زدہ ہو جاتے ہیں۔ کاش کہ یہ حضرات علمائے ربانی کی

ع۱ مولانا منظور صاحب نعمانی (دین و شریعت)

تاریخ سے واقف ہوتے کہ جب بھی انہوں نے محسوس کیا کہ دین میں ٹھہراؤ آگیا ہے تو انہوں نے اپنی بے نظیر اور پُرخلوص جدوجہد سے اس میں روحِ عمل پھونک دی۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دستگیری نہ فرماتا تو یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کا نگہبان ہے اس کی حفاظت دین کے طریقے ہزار ہیں۔ لیکن بظاہر تیرہویں صدی تک یا اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اتنا بگڑ جاتا جتنا ہندو مذہب۔ یہ دو بزرگ ہندوستان کے مسلمانوں کے جلیل القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔ احیائے اسلام اور خدمت شرع کے تذکرے میں ان نائبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درویشوں کے ساتھ ایک "دنیا دار" بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر[۱] مرحوم کا نام بھی زبان پر آتا ہے[۲]"

حضرت سید احمد شہیدؒ[۳] اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ[۴] کی پوری زندگی عمل اور جدوجہد کی حامل رہی ہے جس کی شہادت بالاکوٹ کے مزار دے رہے ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کے متعلق سید عبدالرحمٰن مرحوم سپہ سالار افواج نواب وزیرالدولہ بیان کرتے ہیں۔

"سورج نکلنے کے گھنٹوں بعد تک ورزش اور کشتی میں مشغول رہتے۔ میں بچہ تھا آپ کے بدن پر مٹی ملتا یہاں تک کہ خشک ہو کر جھڑ جاتی۔ پیروں پر مجھے کھڑا کر کے پانچسو ڈنڈ لگاتے پھر کچھ ٹھہر کر پانچسو اور۔ من بھر، بیس اور تیس سیر کے مگدر ہلاتے تھے۔ مولوی علیم اللہ دہلی کے مشہور پیراک استاد کہتے تھے کہ یہ وصف سید صاحبؒ ہی میں دیکھا کہ سخت بہاؤ کے خلاف پیرتے تھے۔ میں باوجود اتنی مشق اور زمانہ کے یہ نہیں کر سکتا۔"

---

۱ حضرت عالمگیرؒ حضرت خواجہ معصوم سرہندیؒ صاحبزادے اور خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرید تھے۔
۲ سیرت سید احمد شہیدؒ ۳ آپ شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت تھے ۴ آپ سید احمد شہید سے بیعت تھے۔

مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کے الفاظ میں۔

"آپ (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) نے گھوڑے کی سواری میاں رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی اس میں اتنی مشق بڑھالی کہ چاہے کیسا ہی منہ زور گھوڑا ہو بے زین اس پر سوار ہو کر اس کو دوڑا سکتے تھے۔ بنوٹ وغیرہ مرزا رحمت اللہ بیگ سے سیکھی۔ آپ نے کشتی کا فن بھی سیکھا تھا۔ گولی کا نشانہ بھی آپ کا بہت اچھا تھا اور اس کی بھی مشق کرتے رہتے تھے۔ آپ نے تیرنا بھی سیکھا تھا۔ علاوہ ازیں جاڑے کے زمانے میں بے سرمائی کپڑوں اور بغیر لحاف کے رہنے کی بھی مشق کی۔ سخت دھوپ میں تپتی ہوئی زمین پر آہستہ آہستہ برہنہ پا چلنے کی بھی مشق کی۔ کم کھانے اور کم سونے کی بھی مشق کی[۲]"

مرزا حیرت دہلوی کے بیان کی روسے گیارہ جنگیں ہوئیں ان سب میں حضرت مولانا اسمٰعیل شہید شریک رہے۔ بالآخر بالاکوٹ کے میدان میں اپنے پیرو مرشد[۳] کے ہمراہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو جمعہ کے دن اپنے خون کا آخری قطرہ اللہ کے راستے میں بہایا۔ وہیں آپ کی قبر ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں صوفیائے کرام نے انگریزی سامراج سے باقاعدہ جنگ لڑی ہے جس کے کمانڈر شیخ الشیوخ حضرت مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ تھے اور آپ کے ساتھی حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھے۔ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کی شہادت اس جنگ آزادی میں ہوئی تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ انگریزی حکومت سے ٹکر لینے کی پاداش میں کافی عرصہ تک مالٹا میں قید رہے۔ پاکستان کی جنگ آزادی میں حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا نمایاں کردار رہے۔

اس اعتراض کے ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ وقت خانقاہوں میں ہُو حق کے نعرہ لگانے کا

---

[۲] شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات۔ [۳] حضرت سید احمد شہیدؒ

نہیں بلکہ میدان میں آنے کا ہے[1]۔ اس اعتراض کے جواب میں حضرت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی کی تحقیق ملاحظہ ہو۔

"لوگ کہتے ہیں کہ حجروں میں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میدان میں آنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ حجروں میں بیٹھنے سے میدان کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ریڈیو حجرہ میں ہی رکھا جاتا ہے پھر اس سے تقریریں نشر ہو کر تمام عالم میں ہل چل پڑ جاتی ہے سعد بن وقاص ایک معرکہ میں امیر لشکر تھے اور دنبل نکل آنے کی وجہ سے نقل و حرکت سے معذور تھے۔ پھر بھی اپنے خیمہ میں بیٹھے بیٹھے فوج کی کمان کر رہے تھے۔ بلکہ جب نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی بدر سے پہلے حرا تھا تو بدیگراں چہ رسد۔"

تیسرا اعتراض سب اعتراضوں سے کمزور بلکہ اگر جاہلانہ نہیں تو بچگانہ ضرور ہے۔ چند دنیاداروں نے پیری مریدی کو دنیا کمانے کا پیشہ بنالیا ہے اور اکثر ان لوگوں سے ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں کہ جن کو فہم دین اور عقل سلیم ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ ایسے "پیروں" کو دیکھ کر یہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے کہ پیری مریدی کا سلسلہ بذات خود ہی قابل ملامت ہے۔ اگر کوئی وکیل اپنے موکل کے مقدمہ کی پیروی ٹھیک طریقے سے نہ کرے تو کیا سارے وکیل گردن زدنی قرار دیئے جائیں گے؟ اگر کوئی ڈاکٹر صحیح آپریشن نہ کر سکے اور مریض کا دوران آپریشن انتقال ہو جائے تو کیا اس واقعہ سے یہ عمومی فیصلہ کر دینا بجا ہوگا کہ سارے ڈاکٹر جب آپریشن کرتے ہیں، تو مریض مر جاتا ہے؟ اگر کچھ مسلمان خراب کام کرتے ہوئے ملیں تو کیا یہ کہہ کر دین اسلام ہی کو چھوڑ دیا جائے گا کہ اس میں ایسی گندی ذہنیت اور گنہگار زندگی کی پرورش ہوتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا چند دوکاندار "پیروں" کی بدمعاشیاں اور دنیاداری دیکھ کر بجائے اس کے کہ ان کو برا کہا جائے سلسلہ بیعت و رشد و ہدایت و تزکیہ نفس ہی کو قابل ملامت گردانا جائے تو کیا یہ فیصلہ بعید از عقل نہ ہوگا؟

---

[1] غالباً چرچل نے بھی محاذ جنگ پر خود جا کر جرمنی فوجوں سے مقابلہ کیا تھا!

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا!

جس طرح دین کے دوسرے شعبوں میں امت کے بعض حلقوں سے چھوٹی بڑی غلطیاں ہوئی ہیں اسی طرح سلوک و تصوف کا شعبہ بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شعبۂ احسان و تصوف کے سلسلہ کی اغلاط و ضلالت بھی من جانب اللہ محققین صوفیا کے ذریعہ برابر درست ہوتی رہی ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور ان کے فرزند و جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تصانیف اور ان کے مکاتیب، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا مرتب کیا ہوا حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات و افادات کا مجموعہ۔ پھر اسی صدی میں حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشادات گرامی، حضرت گنگوہیؒ کے رسائل و مکاتیب اور سب سے آخر میں حکیم الامت حضرت تھانوی کا تصنیف کیا ہوا اس سلسلے کا پورا کتب خانہ ان کوششوں نے تصوف کو اتنا صاف و روشن کر دیا ہے کہ اب اس راہ میں کسی کا گمراہ ہونا صرف اس کی بدقسمتی ہے۔ کسی کے لئے یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ سلوک و تصوف میں کچھ لوگوں کی غلط روی کی وجہ سے دین کے اس شعبہ ہی سے بے نیاز ہو جائے جس کے بغیر بندہ کا دین کامل نہیں ہوتا اور حلاوت ایمان نصیب نہیں ہوتی [1]

حضرت تھانوی فرماتے ہیں۔

"تصوف کا ناس کر دیا ہے ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہاّ بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں چلے کھینچو بیوی کو طلاق دے دو۔ اولاد کو عاق کر دو۔ چالیس چنے رکھ لو اور ایک چنا روز کھاؤ بدوں اس کے فقیری نہیں ملتی۔ میں کہتا ہوں واللہ دوشالوں میں، گدے تکیوں میں، سلطنت میں، مرغن کھانوں میں، فقیری ملتی ہے۔ مگر گھر میں نہیں۔ شیخ کامل کی خدمت میں ملتی ہے۔" [2]

---

[1] مولانا منظور صاحب نعمانی (دین و شریعت)

[2] طریق القلندر

مزید —

"ان رسم پرست اور مدعیان طریق اور گمراہوں اور ڈاکوؤں سے بجائے دینی نفع کے بہت مخلوق گمراہ ہو چکی ہے اور نفع کیا ہوتا بقول شخصے جب سقادہ ہی میں پانی نہ ہو تو بدھنی میں کیا آوے۔ یہ لوگ فیض فیض گاتے پھرتے ہیں ہاں مرید سے ایسے پیر کو فیض ضرور ہو جاتا ہے مطلب یہ کہ دنیا حاصل ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں نے بیچارے مریدوں کا دین تو خراب کیا ہی تھا لوٹ کران کی دنیا بھی برباد کردی۔ ان کی آمدنیوں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ مرید خواہ بیوی کو کچھ دے یا نہ دے خواہ اس کے بچے بھوکوں مریں مگر پیر صاحب کی خدمت فرض و واجب ہے جس کے نہ کچھ حدود ہیں نہ اصول۔ نہ حرام کی خبر نہ حلال کی۔ نہ جائز کی تمیز نہ ناجائز کی۔ غرض نہایت گڑبڑ مچا رکھی ہے اور یہ اندھے مرید بھی ایسی ہی جگہ خوش رہتے ہیں۔"

مولانا منظور صاحب نعمانی :-

"صوفیائے کرام کا یہ طریقہ جس کا نام سلوک و طریقت ہے، اصولاً صحیح اور نتیجۃً کامیاب ہے۔ کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ مشاہیر اولیاء امت مثلاً خواجہ معروف کرخی بشر حافی۔ سری سقطی۔ شفیق بلخی۔ بایزید بسطامی۔ جنید بغدادی۔ ابوبکر شبلی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی۔ شیخ ابوالحسن شاذلی۔ خواجہ عثمان ہارونی خواجہ معین الدین چشتی۔ خواجہ بہاوالدین نقشبند۔ خواجہ باقی باللہ۔ امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور ان جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد ہیں جو اپنے وقت میں اس نسبت کے حامل بلکہ اس راہ کے امام اور داعی ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے ایک ایک کی صحبت و تربیت سے اللہ کے ہزاروں لاکھوں بندوں کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے بس جس طریقہ نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنے کاملین اور اس قدر اصحاب

احسان دفیقین پیدا کئے ہوں جن کو بجا طور سے اس امت کا گل سرسبد کہا جا سکتا ہے اس کے صحیح وکامیاب ومقبول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے[1]۔"

جو تھا اعتراض وہ بھی کم اہم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اچھا صاحب بضرورت محقق شیخ بہ سلسلہ اصلاح باطن تسلیم مگر یہ شیخ کامل اب ہیں کہاں؟ ان ناقدین تصوف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا بزرگوں سے نہ کبھی خالی رہی اور نہ قیامت تک خالی رہے گی۔ البتہ یہ حضرات پرخلوص کوشش کے بعد ہی ملتے ہیں۔ بیمار کے پاس ڈاکٹر خود نہیں آتا، ڈاکٹر کے پاس بیمار خود جاتا ہے پھر ڈاکٹر بھی تو کئی ہیں۔ مریض خود اپنے اور دوسرے احباب کے تجربوں کی بنا پر اور ان چند صحیح اصولوں کی روشنی میں جو ایک ذمہ دار ڈاکٹر پر اطلاق ہوتے ہیں، اپنے لئے بہتر سے بہتر معالج تلاش کرتا ہے اور کبھی یہ شکایت نہیں کرتا کہ آج کل معالج نہیں ملتا۔ اس طرح اگر تزکیہ نفس اور صفائی قلب کی اہمیت دماغ میں رچ جائے اور پھر شیخ کامل کی تلاش میں دوڑ دھوپ کی جائے اور شیخ کو ان اصولوں کے تحت پرکھا جائے جو محققین نے اسی ضرورت کے لئے مرتب کئے ہیں تو یقیناً اور ضرور بالضرور انشاءاللہ شیخ کامل برائے احسان وسلوک ملیں گے۔

حضرت شیخ العرب والعجم حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔

"کوئی جگہ اولیاءاللہ سے خالی نہیں ہے اور جب اولیاءاللہ باقی نہ رہیں گے قیامت واقع ہوگی۔"[2]

اس راہ کو طے کرنے کے لئے کسی رہنما کی رہنمائی ضروری ہے۔ جس طرح کوئی شخص صرف طب کی کتابیں دیکھ کر اپنی اور دوسروں کی بیماریوں کا علاج نہیں کرسکتا اور اگر کرے تو غلط اور خطرناک ہے اس طرح اس روحانی معالجہ میں بھی کسی ایسے روحانی طبیب سے استفادہ اور اس کی

---

[1] مولانا منظور نعمانی (دین وشریعت)

[2] امداد المشتاق

ہدایات و تجاویز کا اتباع ضروری ہے جو خود اس طریق پر چل کر یہ مقصود یعنی احسانی کیفیت اور رابطہ مع اللہ پیدا کر چکا ہو اور اس راہ کے گرم و سرد سے واقف ہو، اس لئے طالب کا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی رہنمائی کے لئے اپنی مناسبت کے لحاظ سے وہ کسی صاحبِ نسبت اور صاحبِ ارشاد بندہ کا انتخاب کرے اور اس سے علاج و رہنمائی کا طالب ہو۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص کہیں پیر بنا بیٹھا ہے، وہ اس راہ کی رہنمائی کا اہل ہے۔ آج کل جس طرح طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ناقص و کامل اور اصلی و نقلی سب طرح کے ہیں، اسی طرح "پیروں" میں بھی سب طرح کے اصلی و نقلی ہیں، بلکہ یہاں نقل اصل سے بہت زیادہ ہے لیکن جس طرح دوسری جگہ ہیں اصلی و نقلی کو پہچانا جا سکتا ہے، اسی طرح تصوف کے شعبہ میں بھی اہل و نااہل کا پہچاننا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس راہ کے محققین نے جو علم شریعت کے ماہر ہیں کتاب و سنت کے اشارات اور اپنی دینی فہم و فراست اور اس راہ کے تجربہ سے اللہ کے صادق بندوں کی ایسی مثالیں لکھ دی ہیں جن سے اہل قلوب و اصحاب ارشاد کو پہچانا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ تقویٰ و اتباع شریعت کے ساتھ ان کی یہ کیفیت ہو کہ ان کے قریب رہنے سے خدا یاد آتا ہو۔ دنیا کی محبت کم ہوتی ہو، اور اللہ کی محبت اور آخرت کی فکر بڑھتی ہو اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والوں میں یہ چیزیں صاف محسوس ہوتی ہوں۔ حضرت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانویؒ نے شیخ کامل کی پہچان کے چند اصول بیان فرمائے ہیں۔

۱۔ علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو، خواہ تحصیل سے یا صحبت علماسے تا فساد عقائد و اعمال سے محفوظ رہے، اور طالبین کو محفوظ رکھ سکے۔

۲۔ عقائد۔ اخلاق و اعمال میں شرع کا پابند ہو۔

۳۔ تارک دنیا راغب آخرت ہو۔ ظاہری و باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔

۴۔ کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبۂ دنیا ہے۔

۵۔ بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو۔ ان سے فیوض و برکات حاصل کئے ہوں۔

۶۔ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا اور ان کی کوئی بُری بات دیکھے یا سُنے تو ان کی روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

۷۔ جو لوگ اس سے بیعت ہیں، ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباعِ شریعت و قلتِ حرص دنیا کے اچھی ہو۔

۸۔ اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

۹۔ بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

۱۰۔ اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہو۔

۱۱۔ خود بھی ذاکر و شاغل ہو کیونکہ بدوں عمل یا عزم عمل تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

۱۲۔ مصلح ہو، صالح ہونا کافی نہیں۔ شیخ ہونے کے لئے دونوں کے جمع کی ضرورت ہے تاکہ جو مرض باطنی بیان کرو اس کو بہت توجہ سے سنکر اس کا علاج تجویز کرے اس سے دم بدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کی اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی جائے[1]

جس شخص میں یہ علامات ہوں، پھر نہ دیکھئے کہ اس سے کوئی کرامت بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں۔ یا یہ شخص صاحب تصرفات ہے یا نہیں یا اس کو کشف ہوتا ہے یا نہیں۔ یا یہ جو دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے یا نہیں کیونکہ یہ امور لوازم شیخت یا ولایت سے نہیں۔ اسی طرح یہ نہ دیکھئے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں کیونکہ یہ بھی لوازم بزرگی سے نہیں[2]

اپنے ایک معرکۃ الارا وعظ میں فرماتے ہیں۔

"حضرت جنیدؒ کی خدمت میں ایک شخص دس برس رہا چلتے وقت عرض کیا کہ حضرت

---

[1] ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے۔ یک زمانہ صحبت با اولیا ۔ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

[2] شریعت اور طریقت

میں نے اتنی مدت خدمت میں قیام کیا لیکن کبھی کوئی کرامت آپ کی نہیں دیکھی یہ سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ جوش میں آکر فرمایا کہ اچھا تو یہ بتلا جنید سے تو نے اتنے عرصہ میں کوئی فعل سنت کے خلاف ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اس نے کہا کہ نہیں اس پر آپ نے جوش میں آکر فرمایا ارے پھر اس سے بڑھ کر جنید کی اور کیا کرامت ہوگی کہ اس نے دس برس تک اپنے خدا کو ایک لمحہ کے لئے بھی ناراض نہیں کیا اور اس سے بڑھکر اور کیا کرامت ہوگی جو تو جنید کی دیکھنا چاہتا ہے[1]۔"

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا۔

"اور لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ہر شخص کے معتقد ہو جاتے ہیں ایسا ہرگز نہ چاہیئے ہر شخص اللہ والا نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ پہچان بھی ہے ... اس زمانہ میں بالخصوص اس شخص کے ظاہری اعمال کے صالح ہونے پر نظر کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے بعض بدعقیدہ لوگ کہتے ہیں کہ بس صاحب اہل باطن ہونا چاہیئے۔ نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے صرف خدا کی یاد اپنے قلب میں ہونے کی ضرورت ہے اس دھوکہ میں ہرگز نہ آنا۔ خود اس کے اعمال بھی درست ہوں اور اس کی صحبت میں بھی یہ اثر ہو کہ دوسروں کے اعمال بھی درست ہو جائیں اس شخص کی صحبت اکسیر اعظم ہے۔"

ایک اور سلسلہ گفتگو میں فرمایا۔

"شیخ کامل وہ ہے جو طالب کی دلجوئی اور تسلی کرتا رہے، اور اس کی مایوس سے مایوس حالت کو سنبھالتا رہے اس کے دل کو بڑھاتا رہے اس میں تو ہم نے اپنے حضرت حاجی صاحبؒ[2] کو دیکھا کہ کیسا ہی کوئی روتا ہوا گیا ہنستا ہوا آیا۔ یہ واقعہ ہے حضرت

---

[1] شیخ کامل کی پہچان کے ۱۲ اصول جو اوپر بیان ہوئے۔

[2] حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ

حاجی صاحبؒ اپنے زمانہ میں اس فن کے امام تھے۔ مجدد تھے۔ مجتہد تھے۔"

ملفوظ حضرت حاجی صاحبؒ۔

"شیخ کامل کی پہچان کا ایک طریقہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر کسی شیخ کی صحبت سے دنیا سے دل سرد ہوتا جاتا ہو اور عقبیٰ کی طرف میلان زیادہ ہو تو وہ شیخ کامل ہے"

شیخ کامل کی حالت مشابہ عوام کے ہوتی ہے۔ وہ سب میں ملا جلا رہتا ہے۔ اس کی کوئی امتیازی شان نہیں ہوتی اور یہی حالت حضرات انبیا علیہم السلام کی تھی اور اسی حالت کو دیکھکر لوگوں نے کہا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو۔ انبیا علیہم السلام نے اس کی نفی نہیں کی بلکہ اثبات میں جواب فرمایا کہ بیشک ہم بشر ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں میں جس پر چاہے احسان فرمادے چنانچہ ہم پر احسان فرمایا کہ ہم کو نبوت عطا ہوئی۔ غرض شیخ کامل اپنی شان میں مشابہ ہوتا ہے انبیا علیہم السلام کے۔ جہاں اور کمالات اس پر شمع نبوت سے فائض ہوتے ہیں اس پر یہی انبیاء کا فیض ہوتا ہے کہ اس کا چلنا پھرنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ نشست و برخاست رفتار گفتار سب سنت ہی کے تابع ہوتا ہے[1]۔

خیال یہ تھا کہ یہاں صوفیوں کے سے دعوے ہوتے ہوں گے مجذوبوں کے ہاں کے سے احکام جاری ہوتے ہوں گے۔ کشف وکرامات کے چرچے اور تذکرے ہوتے ہوں گے۔ بڑا زور خوابوں اور کیفیات کا رہتا ہوگا۔ اور سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ ذکر و شغل کے حلقے ہوتے ہوں گے۔ مولانا کی تصانیف و مواعظ کے مطالعہ اور قبل کی مختصر صحبتوں اور ملاقاتوں نے ان تخیلات کو ضعیف ضرور کر دیا تھا۔ پھر بھی اچھی خاصی جان ان میں باقی تھی۔ اب کی طویل صحبت اور روزمرہ کی گفتگوؤں نے رفتہ رفتہ بتایا اور دل میں اتارا کہ اصل شئے تو احکام شریعت ہیں مدار کار تو اتباع سنت ہے۔ البتہ پورے اخلاص و تزکیہ قلب کے ساتھ ..." (حکیم الامت از مولانا عبدالماجد)

---

[1] حکیم الامت حضرت تھانوی رح

مثالی ملّت کا تصوّر

ترجمہ - از حضرت شاہ ولی اللہ

تمہیں یہ جاننا چاہیئے کہ ارتفاقات[۱] جن پر نظام بشری کی بنا ہے، اور انہیں اور بالخصوص ان میں سے ارتفاق ثانی[۲] اور ارتفاق ثالث کو اللہ تعالےٰ کے فضل و عنایت نے نوع انسان کو عطا کیا ہے۔ نیز اقترابات[۳] جو طبائع انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں اور اللہ تعالےٰ کے فضل و عنایت سے

---

۱. ہر نوع کو اپنے نوعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے "طبیعی الہامات" سے نوازا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں نوع انسان کو اپنی ضرورتوں کی تحصیل اور اس میں مزید آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ "خصوصی الہامات" سے بھی سرفراز کیا گیا ہے ان الہامات کا ظہور جن عملی پیرایوں میں ہوتا ہے۔ ان کا نام رلتفاقات ہے۔

۲. انسان کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل، جس سے کوئی دور افتادہ انسانی گروہ بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا ارتفاق اوّل ہے۔ جیسے بات چیت کھیتی باڑی اور مویشی پالنا وغیرہ - وہ امور جو شہروں کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ارتفاق ثانی میں آتے ہیں نظام حکومت اور عدل و انصاف کا قیام ارتفاق ثالث سے تعلق رکھتا ہے اور ارتفاق رابع یہ ہے کہ لوگ ایک ایسی طاقت کی اطاعت کریں، جو خلافت کبریٰ کی ہم پلہ ہو۔ "خلیفہ" سے میری مراد یہ ہے کہ ایک شخص ایسی شوکت و دولت کا حامل ہو کہ دوسرا شخص اس کے ملک پہ حملہ کرنا اور اسے چھیننا ناممکن سمجھے۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

۳. اقترابات، قرب الٰہی کے حصول کے ذرائع

ع یہ البدور البازغہ کی فصل (فی بیان الملل والشرائع) کا ترجمہ ہے ---- مدیر

نوع انسانی میں انہیں اوران میں سے خاص طور سے احسان[1] عبادت گزاری اور شر و بدی سے اجتناب کو نمایاں کیا ہے، غرض یہ ارتفاقات اور اقترابات سب کلی امور ہیں، اور یہ بہت سی شکلوں میں بروئے کار آتے ہیں۔

ان ارتفاقات میں سے مثال کے طور پر ایک نکاح ہے۔ اور یہ مشتمل ہے اس کے اعلان، دف بجانے اور گانے پر، ایسے کپڑے پہننے پر جو عموماً نکاح ہی کے موقع پر پہنے جاتے ہیں اور کھانا تقسیم کرنے پر جو عموماً نکاح ہی کے موقع پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ امور ارتفاق ثانی کے تحت آتے ہیں۔ اور جس نے یہ پورے کئے اس نے حق واجب ادا کر دیا اسی طرح نکاح کی شرائط میں گواہوں کی شہادت اور زبان سے ایجاب و قبول بھی ہے، اور جس نے یہ شرائط پوری کیں، اس نے حق واجب ادا کر دیا۔ بات یہ ہے کہ نکاح کے معاملے میں حقیقی فرض یہ ہے کہ منکوحہ عورت کا ایک مرد کے ساتھ تعین ہو جائے[2]

---

[1] احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے، تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے" (حجۃ اللہ البالغہ) علم احسان میں اعمال کے سلسلے میں ہئیاتِ نفسیہ اور کیفیات نفس سے بحث کی جاتی ہے تاکہ انسان ان ہیات و کیفیات کی حقیقت اور ان کے اصل معنیٰ معلوم کرے اور اس طرح اعمال کو پوری بصیرت کے ساتھ انجام دے سکے اور اس اصل مقصود تک پہنچے، جو ان اعمال سے مطلوب ہے۔

[2] نکاح کا طریقہ اس مروجہ ہیئت میں یعنی یہ کہ نکاح غیر محارم کے ساتھ کیا جائے۔ لوگوں کے مجمع عام میں کیا جائے ... عین فطری امر ہے، جس پر کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور عرب و عجم میں اس بارے میں اختلاف نہیں (حجۃ اللہ البالغہ)

حجۃ اللہ البالغہ میں "تدبیر منزل" کے ذیل میں فرماتے ہیں: "معلوم ہونا چاہیئے کہ تدبیر منزل کے اصل اصول تمام عرب و عجم کے نزدیک مسلّم اور رائج ہوئے تھے اور ہیں۔ اگر اختلاف ہے تو صرف اشباح و صُور کا اختلاف ہے، جب آنحضرت صلعم عرب میں مبعوث ہوئے اور حکمت الٰہیہ اس کی مقتضی ہوئی کہ دین الٰہی پر کلمۃ اللہ کو غالب کر دیا جائے تو غلبہ کی صورت یہ ہوئی کہ عربوں کو دنیا کے تمام ادیان و مذاہب پر غالب کر دیا جائے۔ اور ان کی عادات و اخلاق کے ذریعہ تمام کے علوم و اخلاق پھر ان کی ریاست و امارت قائم کر کے تمام کی ریاست و امارت کو منسوخ کر دیا جائے چنانچہ حکمت الٰہی نے یہ واجب کر دیا کہ تدبیر منزل کے بارے میں اہل عرب کے عادات و اطوار کو بطور اصول متعین اور لازم کر دیا جائے اور بعینہٖ انہی اشباح و صور کا اعتبار کیا جائے۔

تاکہ اور کوئی اس میں شریک نہ ہو اور نہ کسی بھی بنا پر اس قسم کی شرکت کا کوئی احتمال باقی رہے۔ نیز اس سلسلے میں نکاح کا اہتمام جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، بڑی شان سے کیا جائے۔ اور یہ مذکورہ بالا امور سے ہو سکتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ کے تقرب کا مسئلہ ہے۔ یہ اس طرح بھی ممکن ہے کہ آدمی بالکل اس کا ہو جائے بلہ (دیکھو بالتجرد الیہ) اور اس سے انسانی خواص جاتے رہیں۔ اور اس طرح بھی ممکن ہے کہ وہ اصل انسانیت اور اس کے خواص کو باقی رکھتے ہوئے اعضاء و جوارح کے ذریعہ تقرب الٰہی کے آداب بجا لائے۔ بلہ

ان دو مثالوں پر تم ارتفاقات و اقترابات کے ان تمام بڑے بڑے امور کا قیاس کر لو، جن کا

لہ "سماحت" یہ ہے کہ نفس انسانی بہیمی جذبات کی گرفت سے آزاد ہو جائے صوفیائے کرام اس حقیقت کو قطع تعلق یا فنا یا حریت نفس سے تعبیر کرتے ہیں کہ انسان دنیوی تعلقات کو منقطع کر لیوے بشری رذائل و خصائص کو ختم کر کے اپنے کو مرضی الٰہی میں فنا کر دے اور دنیوی تعلقات سے بالکل آزاد ہو جائے ..... اور خلق سماحت کی تحصیل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان ان امور سے بھی احتراز کرے، جن کی وجہ سے اس قسم کے امور میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اور قلب کو ذکر الٰہی میں مشغول رکھے۔ اور نفس کو عالم تجرد کی طرف رجوع کر دیوے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

لہ شارع نے جن امور کا بطور "ایجاب" یا "تحریم" حکم فرمایا اور اولاً لوگوں کو ان کا مکلف گردانا، وہ ایسے اعمال ہیں، جو کیفیات نفسیہ سے پیدا ہوتے ہیں اور آخرت میں انہیں اعمال کا اجر و ثواب یا عتاب و عذاب انسان کو ملتا ہے۔ یہی اعمال ان کیفیات میں پھیلاؤ پیدا کرتے اور ان کی تشریح کرتے ہیں۔ اور یہ اعمال ہی ان کیفیات نفسیہ کی ظاہری شکلیں اور صورتیں ہوا کرتی ہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

ہم نے ذکر کیا ہے۔ غرض یہ کہ ان کا متعدد شکلوں میں وقوع پذیر ہونا ممکن ہے چنانچہ ہم نے ملت حنفیہ کے ضمن میں ان کی جن شکلوں اور طریقوں کا ذکر کیا ہے، تم اس سے دھوکے میں نہ آجانا۔ یہ تو صرف مثالیں تھیں اور فقط مثالیں، اس بارے میں تم یہ نہ سمجھنا کہ ان معاملات میں حق واجب صرف ان شکلوں ہی میں محصور ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ملتوں میں سے کوئی ملت بھی ایسی نہیں جس نے ان امور کے حق واجب کو بالکل نظر انداز کیا ہو، اور کوئی فرد بھی ایسا نہیں جس پر کہ بشر اور انسان کا اطلاق ہو سکتا ہے اور وہ اس حق واجب کا انکار کرے[1]۔ باقی اس کی خلاف ورزی کرنا دوسری بات ہے۔ اختلاف و نزاع اگر ہے تو ان کی کسی معین شکل اور ان کی کسی مخصوص وضع کے بارے میں ہے، مختصراً ارتفاقات اور اقترابات کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے میں جو شکلیں اور اوضاع و ہیئتیں ہیں، ان کی ایک معین شکل اور مخصوص وضع ملت[2] کہلاتی ہے۔

اب حالت یہ ہے کہ چونکہ بنی آدم کی اکثریت ارتفاقات اور اقترابات کے علوم کو صحیح طور پر حاصل نہیں کر سکتی اور نہ ان کی اوضاع و ہیئتوں کے اصولوں تک وہ پہنچ پاتے ہیں، اس لئے

---

[1] تم دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ پاؤ گے جو مذکورہ ابواب (ارتفاقات) کے جو اصول ہیں، ان پر اعتقاد نہ رکھتی ہو۔ اور باوجود دین و مذاہب کے اختلاف، دور دراز شہروں اور آبادیوں و ملکوں میں جُدا جُدا رہنے کے انہیں قائم کرنے اور ان کی پابندی میں پوری پوری کوشش نہ کرتی ہو۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

[2] ارتفاقات اور اقترابات کی بعض شکلوں اور مخصوص اوضاع و ہیئات کو فرداً فرداً رسوم سمجھتے ہیں اور ان کا مجموعی نام ملت ہے۔ ان "رسوم" کی ارتفاقات کے ذیل میں وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہے۔ ان "رسوم" کا تعین مختلف ذرائع سے ہوتا ہے۔ اور بہت سے اسباب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انہیں استحکام ملتا ہے اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں بہت سے "رسوم" اپنی اصلیت کے لحاظ سے حق ہیں۔ کیونکہ یہ صالح ارتفاقات کے محافظ ہیں اور افراد انسانی کے نظری اور عملی کمال کی طرف رہنمائی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر یہ طریقے نہ ہوں (باقی حاشیہ صلا پر)

نوع انسانی پر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے یہ واجب ٹھہرا کہ ملتوں کا وجود ظہور میں آئے اور انسانوں کی فطرت میں کسی نہ کسی ملت کی فرمانبرداری کا داعیہ ورجحان ودیعت کیا جائے پھر ارتفاقات بروئے کار آئیں، اور ان کی فرمانبرداری ایک مخصوص ملت کے لئے واجب کردی جائے۔

باقی رہا ملتوں کا ظہور، تو وہ مختلف طرح پر ہوتا ہے، کبھی ایک عالم جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ملتی ہے اور وہ ارتفاقات اور اقترابات کے علوم پر حاوی ہوتا ہے، ایک ملت کے قیام کا سبب بنتا ہے۔ وہ ایک معتدل و متوازن اور جامع و ہمہ گیر ملت کی طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) تو انسانوں کی زندگی چوپایوں کی سی بن کر رہ جائے چنانچہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو شادی بیاہ اور دوسرے معاملات کو طریق مطلوب کی شکل میں انجام دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے ان کے اسباب دریافت کئے جائیں، تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ ہوگا کہ ہم قوم کی موافقت میں ایسا کر رہے ہیں۔ اس بارے میں ان کی تمام تر جدوجہد کی انتہا ایک علم اجمالی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔۔۔ جب اس طرح یہ سنت راشدہ مستحکم ہو جاتی ہے، تو پھر قوم اسے عصراً بعد عصر مانتی چلی جاتی ہے، اسی بنا پر اس کی زندگی ہوتی ہے اور اس پر اس کی موت۔ ان کے قلوب اور ان کے علوم اس سنت راشدہ پر راسخ ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وجوداً اور عدماً اصول حیات کے لئے یہی طریقہ ضروری ہے۔ ان کی خلاف ورزی وہی شخص کر سکتا ہے، جس کا نفس خبیث ہو۔

شاہ صاحب کے اس ارشاد کا کہ "نبوت اکثر و بیشتر کسی نہ کسی ملت کے ماتحت ہوتی ہے" یہ پس منظر ہے ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

"جاننا چاہیئے کہ عالم مسکون کا کوئی شہر، دنیا کی کوئی قوم بشرطیکہ وہ معتدل المزاج اور اخلاق فاضلہ کی حامل ہے، حضرت آدمؑ سے لیکر قیامت تک ان ارتفاقات اور تدابیر معاش سے خالی نہیں رہی نسلاً بعد نسلٍ ان تدابیر کے اصول کو بطور مسلمات مانتی چلی آئی اور مانتی چلی جائے گی۔ اس معاملے میں تمہیں ارتفاقات کی ظاہری صورتوں اور ان کی جزئیات کا اختلاف پریشان نہ کرے کیونکہ ان کے اصول میں کوئی اختلاف نہیں"

ڈالتا ہے۔ ملت کی یہ نوع سب سے بلند اور سب سے ممتاز ہوتی ہے[1]۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عادل بادشاہ برسر اقتدار آتا ہے اور وہ جیسے کہ مصلحت سمجھتا ہے، عدل و انصاف کو فروغ دیتا ہے چنانچہ وہ جس طرح اپنی فوج اور رعیت سے برتاؤ کرتا ہے تعزیرات اور سزاؤں کو نافذ کرتا ہے جھگڑوں کے فیصلے کرتا لوگوں کے باہمی نزاع نمٹاتا اور لڑائی کے موقعوں پر لشکر آرائی کرتا، اور اس کے دوسرے امور سے عہدہ برآ ہوتا ہے، تو اس عادل بادشاہ کے یہ سارے کام ایک مستحسن، معقول اور قابل اتباع سنت بن جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد

---

[1] انسانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو کج فہم اور کج راہ ہوتے ہیں... کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں کچھ صلاحیت بھی ہوتی ہے.... لیکن ایسے لوگ اگر ہدایت و راہ نمائی کی ایک چیز پا سکتے ہیں تو بہت سی چیزیں ان سے مفقود ہو جاتی ہیں۔

" حاصل کلام یہ کہ لوگوں کو ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے، جو علم سے پوری طرح واقف ہو۔ اور لغزشوں اور کوتاہیوں سے ہر طرح مامون و محفوظ ہو۔ اور جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ایک شہر کے لئے جہاں عقل معاش پوری قوت سے موجود ہوتی ہے۔ جہاں نظام صالح کے جاننے والے بے شمار پائے جاتے ہیں کسی ایسے انسان کی ضرورت ہوتی ہے، جو مصالح عامہ کو کامل طور پر جانتا ہو اور شہر کی صحیح طریقے پر تنظیم کر سکتا ہو، پھر ایسی امت کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے، جس میں بے شمار مختلف استعدادیں اور قابلیتیں موجود ہوں اور پھر اس طریقے کو شہادت قلب کے ساتھ ایسے ہی لوگ قبول کر سکتے ہیں، جو زکی النفس، پاک فطرت، تجرید نفس، اور تزکیہ نفس کے اعلیٰ مراتب کے حامل ہوں۔ ایسے طریقے کی طرف ہدایت اور راہ نمائی انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، جو اعلیٰ درجے کے حامل اور بلند مقام کے رازدار ہوں۔ اور ظاہر ہے اس شان کے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں"

شاہ صاحب فرماتے ہیں، جب لوہار اور بڑھئی کے پیشے بدون ہدایت و رہنمائی نہیں سیکھے جا سکتے تو پھر ان اعلیٰ مقاصد کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے، جن کی راہ نمائی صرف الٰہی لوگوں کو حاصل ہوا کرتی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق ملتی ہے۔ اور انہیں ہستیوں کو اس کی جانب توجہ ہوتی ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۲ پر)

جو اور بادشاہ آتے ہیں، وہ ان امور میں اس کا اتباع کرتے ہیں۔

اسی طرح ہر قوم میں اس کے حکماء اور ممتاز افراد پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ نکاح ضیافتوں اور دوسرے امور کے سلسلے میں جو کچھ کرتے ہیں، وہ ایک معقول اور مستحسن سنت بن جاتی ہے چنانچہ ان کے بعد جو لوگ آتے ہیں، وہ ان امور میں ان کی اتباع کرتے ہیں۔ اس طرح ہر اہل صنعت طبقے کا ایک امام ظہور میں آتا ہے کہ دوسرے اس کے اعمال کی اقتدا کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحب رشد و ہدایت پیدا ہوتا ہے۔ وہ اقترابات میں سے کسی ایک شق کو سمجھتا ہے۔ پھر اس کی تکمیل کرتا ہے چنانچہ تقرب الٰہی کے مقتضیات کے سلسلے میں جو وہ کرتا ہے، وہ ایک قابل اتباع سنت بن جاتی ہے کہ قوم کے افراد اس پر چلتے ہیں۔ الغرض ان ائمہ کے علوم سے ایک لازمی طریقہ و ملت وجود میں آتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ۲۲) جنہیں اخلاص کی برکتیں میسر ہوتی ہیں۔ اور پھر ایسے عالم حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ برملا طور پر دنیا جہاں کے سامنے ثابت کردے کہ وہ سنت راشدہ اور راہ ہدایت کا کامل راز آگاہ ہے۔ قول میں صادق اور خطا و گمراہی سے بالکل محفوظ ہے، اور پھر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اصلاح کا کوئی ایک حصہ اختیار کرے اور کسی ایک حصے کو چھوڑ دے۔"

شاہ صاحب کے نزدیک اس اصلاحی طریقے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مصلح اپنے ماقبل کے کسی ایسے شخص کی روایات پیش کرے۔۔ جس کے متعلق لوگوں کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ ایک کامل شخصیت اور عظیم ترین صفات کا حامل ہے۔ اور معصوم ہستی ہے۔ یہ بات بہت آسان ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو خود ان کے عقیدے کے مطابق ان کی روایات کی دعوت دے۔ اور ان کی مسلّمہ چیزیں ان کے سامنے بطور دلیل پیش کرے۔

"یا پھر وہ خود۔۔۔ ایسی شخصیت کا مالک ہے۔۔۔ جو معصوم اور بے خطا ہو۔ اور تمام لوگ اس کے معصوم ہونے پر متفق ہوں۔ اور ایسا آدمی خود ان کے اندر موجود ہو۔ اور اگر وہ خود موجود نہ ہو تو اس کے اقوال اور روایتیں ان کے پاس محفوظ ہوں" (حجۃ اللہ البالغہ)

کہ اس کی نافرمانی نہیں کی جاتی۔ اور کوئی زمانہ اور شہر ایسا نہیں، جو اس قسم کے طریقہ وملت سے خالی ہو۔[۱]

لوگوں کی اصل طبیعتوں میں جو داعیہ ودیعت کیا گیا ہے، وہ ہے ان کا اپنی فطرت کی طرف سے ارتفاقات اور اقترابات کے اصولوں کی فرمانبرداری۔ اور ان کا خود ان ارتفاقات اور اقترابات کی کوئی مخصوص وضع معین نہ کر سکنا۔[۲] بے شک ان کے سینوں میں یہ علوم اس طرح ہوتے ہیں، جیسے کہ ایک خالص عرب میں علم الاعراب اور علم الصرف ہو کہ وہ بولنے میں کوئی اعراب اور صرف و نحو کی غلطی نہیں کرتا۔

۱؎ جاننا چاہیئے کہ رسوم کو ارتفاقات میں وہی حیثیت حاصل ہے، جو جسم انسانی میں قلب کو ہے۔ شرائع الٰہیہ میں اولاً اور بالذات یہی ارتفاقات مقصود ہوتے ہیں اور نوامیس الٰہیہ انہی سے بحث کرتی ہے ان رسوم کے رائج ہونے کے چند اسباب ہیں۔ مثلاً یہ کہ حکما نے ان کو مستنبط کیا۔ یا مثلاً یہ کہ ان لوگوں کے قلوب میں اللہ تعالےٰ نے ان رسوم کا الہام فرمایا، جنہیں انوار ملکیہ کی تائید حاصل ہے۔ اور چند اسباب ہوتے ہیں، جن کی بنا پر ان رسوم کی نشر و اشاعت ہوا کرتی ہے۔ مثلاً کسی ایسے باسطوت بادشاہ نے کسی رسم کو لوگوں کے لئے بطور طریق عمل رائج کیا۔۔۔۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

۲؎ "انسانوں میں کچھ لوگ ایسے صاحبِ عقل و بصیرت ہوتے ہیں، جو ضروریات زندگی کے لئے مفید تدبیریں مستنبط کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے دلوں میں یہی امور اس طرح کھٹکتے رہتے ہیں، جس طرح ارباب عقل و بصیرت کے دلوں میں کھٹکتے رہتے ہیں، لیکن ان میں اخذ و استنباط کی قابلیت نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ حکما سے ملاقات کرتے ہیں اور ان کے استنباط کئے ہوئے مفید طریقوں کو سنتے ہیں، تو ان کے قلوب ان چیزوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ چیزیں ان کے علم اجمالی کے موافق ہوتی ہیں۔ اس لئے پوری طاقت سے وہ ان پر کاربند ہو جاتے ہیں۔"

(یہ ارتفاقات کا ذکر ہے) (حجۃ اللہ البالغہ)

یقیناً اس کے دل میں مفعول اور فاعل میں امتیاز پایا جاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ فاعل مرفوع اور مفعول منصوب ہوتا ہے اور وہ بولتے وقت اس کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اسی طرح بنی آدم کے دلوں میں بھی ایک اجمالی علم ہوتا ہے، جس کی وہ از خود تشریح نہیں کر سکتے، لیکن جب ملّت کے ظہور کے ضمن میں یہ شرح کردی جاتی ہے، تو اگر یہ شرح صاف اور واضح ہو، اور اس میں کوئی ابہام نہ پایا جائے ان کے دلوں میں خوب گھر کر جاتی ہے[۱]

ایک خاص ملّت کے ارتفاقات کی فرمانبرداری واجب کرنے والی ایک یہ چیز بھی ہوتی ہے کہ اس کے ائمہ کی شہرت پھیل جاتی ہے، ان سے خارقِ عادت امور کا ظہور ہوتا ہے اور وہ ائمہ لوگوں میں اپنی دین داری، غور و خوض والے علوم اور عجیب و غریب افعال کی وجہ سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں میں ان کے بارے میں عقیدت ہو جاتی ہے۔ نیز یہ ہوتا ہے کہ کامل یا ناقص استقرائے سے لوگوں میں یہ خیال یا یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اس ملت کی نافرمانی سے دنیا اور آخرت میں دردناک

---

[۱] بعض ایسے ہوتے ہیں، جن میں یہ خلق سعادت تو مفقود ہوتا ہے، لیکن اس کے حصول کی امید ہوا کرتی ہے۔ اور یہ اس طور پر کہ سخت ترین ریاضتیں کی جائیں... اور دنیا میں اکثر لوگ اس قسم کے ہیں اور بعثت انبیاء سے اولاً و بالذات یہی لوگ مقصود ہیں۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کے اندر خلق مطلوب اجمالی طور پر موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس کی مناسب تفصیل اور اس کی ہیئات و اشکال کی تعین میں وہ اکثر پیشوا کے محتاج ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ یکاد زیتھا یضیئ ولو لم تمسسہ نار۔ (قریب ہے کہ اس کا روغن روشن ہو جائے۔ اگرچہ اس کو آگ بھی نہ چھوئے) شریعت الٰہیہ میں اس قسم کے لوگوں کو سابق کہا گیا ہے انہی لوگوں میں ایک طبقہ انبیائے کرام کا ہوتا ہے۔ انبیائے کرام کے لئے خلق مطلوب کی تحصیل، اس کے کمالات کی طرف اقدام، اس کی مناسب ہیئات و اشکال کی تقدیر، فوت شدہ امور کی تحصیل اور اس کی کیفیت کا علم اور ناقص کی تکمیل نہایت سہل ہوا کرتی ہے وہ اسی منزل مقصود کو بغیر کسی امام اور بغیر کسی رہنما کے پا لیتے ہیں۔ ان کے اعمال اور طریق زندگی کو لوگ محفوظ کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کے سنن اور قوانین منظم ہو جاتے ہیں۔ اور لوگ انہی کو اپنا دستور العمل بنا لیتے ہیں اور انہی سے وہ مطلوبہ سعادت کو پا لیتے ہیں

عذاب ہوگا یا آپس میں فتنہ و فساد اور نزاعات پیدا ہو جائیں گے۔[1]

تمہیں یہ جاننا چاہیئے کہ ہر ملت کیلئے ضروری ہے کہ اس کا ایک دستور ہو، جس پر اس ملت کی طرز پڑھے۔ اگر اس ملت کا مقیم (قائم کرنے والا) ایک فرد واحد ہے تو اس کا ان علوم کے بارے میں جنہیں اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنے کمال کے مطابق حاصل کیا ہے ایک معیار (میزان) ہوتا ہے پس اس ملت میں اس کے یہ علوم دستور ہوتے ہیں۔ اور اگر ایک فرد واحد کے بجائے بہت سے ائمہ ہوں کہ ملت کے شعبوں میں سے ہر شعبے کا ایک امام ہو، تو ان میں سے ہر ایک کا اس کے عاملی کمال کے فعلاً ظہور کی بنا پر ایک درجہ ہوگا۔ چنانچہ ہر شعبے کا دستور اس کے علوم کا امام ہوگا۔ اور کوئی شخص اس وقت تک حکیم نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ ملتوں کے علوم کو ان کے دستور کی نسبت سے نہ جانے اس صورت میں وہ ایک ایسی ملت کو انتخاب کرے گا۔ جس کا نام ملتوں میں بہترین طریقہ ہوگا۔ اگر تو نے اس معاملے میں ذرا سی بھی غفلت کی، تو تو دنیا اور آخرت دونوں میں دھکے کھائے گا۔

اس بارے میں تحقیقی امر یہ ہے کہ ملتوں میں سے ایک ملتِ قصویٰ[2] ہونی ضروری ہے، جس کا دستور وہ علوم ہوں جن کی ہر ہر شعبے پر گہری اور تحقیقی نظر ہو۔ اب تم ہی تحقیق کر دو تو دیکھو گے کہ بلند اور پست چیزوں میں سے جو بھی موجود ہے، وہ فعلاً اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک کہ اسے اوپر سے اور نیچے سے علتیں محیط نہ ہوں۔ چنانچہ اس کی کنہہ حقیقت کا تب ہی ادراک

---

[1] "اور کچھ اسباب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی بنا پر لوگ ان رسوم کو مناسب اہتمام کے ساتھ مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔ مثلاً اعمال کی غیبی جزا و سزا کا تجربہ کہ فلاں رسم کے ترک کرنے سے فلاں سزا ملی یا کسی رسم سے غفلت برتنے سے کوئی فساد رونما ہو گیا۔ یا مثلاً نیک شیر اور باب بصیرت اس کے ترک پر ملامت کرتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے اسباب ہوتے ہیں، جن کی بنا پر ان رسوم کو استحکام حاصل ہو جاتا ہے" حجۃ اللہ البالغہ

[2] اس کی تشریح بعد میں آتی ہے

ہوسکتا ہے، جب اس کی تمام علتوں کا ادراک ہو۔ اسی طرح بنی آدم کے دل پر جو وارد ہوتا ہے، تو اس کا ظاہر اور باطن ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کے باطن کا تعلق ہے، تو اس کی علّتیں ہوتی ہیں، جس نے ان علتوں کے ذریعہ اس کے کنہ کو جانا، اس نے اس کے باطن کو جان لیا۔ باقی رہا اس کا ظاہر تو وہ اس عالم میں اس کی خواص، ظاہری کیفیات اور رنگ ہیں۔ جس نے اسے ان خواص اور علامات کے ذریعہ جانا، اس نے اس کا ظاہر جان لیا۔ (اس کے بعد شاہ صاحب نے دو مثالیں دی ہیں)

مختصراً ملت قصویٰ وہ ہے کہ اس سے بہتر طریقہ کسی اور ملت کے پاس نہ ہو اور نہ اس جیسے کسی کے ہاں جامع علوم اور ہر پہلو کو پوری طرح غور و تعمق کے ساتھ احاطہ کرنے والے نقطہ ہائے نظر ہوں۔ ایسی ملت کے قیّم کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوقات اور اس کی سنت پر دو کو اجمالاً اور تفصیلاً، ظاہراً و باطناً اور تجربتاً اور عقلاً محیط کئے ہوئے ہو۔ علوم کی تفصیل میں خوب غور و خوض کرتا ہو۔ اس کے علوم، علوم انسانیہ کے قبضے سے صادر ہوتے ہوں، اور وہ انہیں اور ان سے ملتے جلتے علوم کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ اس ملت کی شان یہ ہو کہ وہ ارتفاقات کے اصول و قواعد کو بغیر ان کی ایک ایک صورت کی تحقیق کئے، پیش کرے۔ اور اس کا جو قیّم ہو، وہ پھر ارتفاقات کی صور و اشکال کی الگ الگ پوری پوری تفصیل کرے۔ بعد ازاں ان صور و اشکال کو مختلف انسانوں پر ان کی استعدادوں، مزاجوں، عادتوں اور ان کی قوتِ اخلاق کے مطابق تقسیم کرے۔ لیکن ان کی پوری معرفت اور ان کے ایک کے دوسرے سے کامل طور پر امتیاز کے بعد نیز وہ الہیات کی ایک ایک چیز کی بنیاد رکھے۔ اس سلسلے میں وہ اللہ کی ذات اور صفات کی وضاحت کرے، اور اس کی یہ وضاحت زیادہ سے زیادہ صراحت لئے ہوئے ہو۔ یہ صرف عام عرفی زبان میں نہ ہو، بلکہ دلیل و برہان کے ذریعہ اس طرح وضاحت کی جائے کہ اس سے نہ کوئی راز چھوٹے نہ نکتہ، نہ کوئی خفی بات رہ جائے نہ جلی، وہ اس کا اوپر سے بھی احاطہ کرے اور نیچے سے بھی، اس کے بعد وہ لوگوں کو بتائے کہ وہ ان عمیق معارف اور حکمتوں کی کس طرح تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان معارف و حِکَم کی یہ تعبیرات مختلف لوگوں کے لئے خاص ہو جائیں۔ پس ایک ایک کے پاس اپنے اپنے طور پر ان کا عرفان و معرفت اور ان کے بارے میں تفصیل و وضاحت ہو،

یہ قیم اللہ تعالےٰ کے تقرب کے جو نسمی، روحانی اور دوسرے مراتب ہیں۔ ان میں غور و خوض کرے اور اس اعتبار سے لوگوں کے ان میں حصول کمال کی جو استعدادیں ہیں، ان کے مطابق مختلف گروہ کرے اور ہر استعداد والے کو اس کی استعداد کے مطابق تقرب الٰہی کی انواع میں کوئی نوع دے۔ اس کے بعد پھر وہ ادھر متوجہ ہو اور ہر تقرب کے جو خواص، آداب اور اسباب ہیں، اور انہیں جس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے، ان کو بیان کرے۔

مختصراً یہ قیم آدمیوں کی کثرت کے اعتبار سے کثیر التعداد عبادتیں شرعاً معین کرے ان میں سے بعض روحانی ہوں، بعض جسمانی۔ اسی طرح وہ بدیوں، ان کے درجات و اسباب اور جن ذرائع سے وہ پیدا ہوتی اور جن تدابیر سے ان کا قلع قمع ہو سکتا ہے، ان کی تحقیق و تفتیش کرے۔ اور یہ ہر ہر استعداد اور ہر ہر زمانے کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ ایسے ہی وہ عالم قبر اور عالم حشر کی پوری پوری تحقیق و تفتیش کرے، اور اس ضمن میں نہ کوئی چھوٹی چیز چھوڑے نہ بڑی۔ نیز وہ ان مصائب کے لئے جن کے پیش آنے کا انسانوں کو ڈر رہتا ہے، اور ان آفات و حوادث کے لئے جو وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں فرائض معین کرے، اسی طرح وہ ان اچھے مقاصد کے لئے بھی جو انسانوں کو مطلوب ہیں فرائض کا تعین کرے، بعد ازاں وہ ہر شے کے وہ اسباب جو اسے وجود میں لاتے ہیں، اسی طرح وہ اسباب جو اسے معدوم کرتے ہیں، بیان کرے۔ یہ جو ہم نے سب ذکر کیا ہے، یا آئندہ ذکر کریں گے ان کا احاطہ کرنا ممکنات میں سے نہیں، اس سلسلے میں جو کچھ بھی ہے وہ محض ہمارے اجمالی علم کے اعتبار سے ہے۔ الغرض "ملت قصویٰ" وہ ہے، جو اتم نوع انسان کی پوری پوری شرح ہو، اور یہ شرح

سلہ نسمہ، روح ہوائی کو کہتے ہیں، جس کا تعلق قوائے بدنیہ سے ہے، مترجم

سلہ نوع انسان کا بحیثیت مجموعی ایک مثالی (آئیڈیل) نمونہ

بر ہر فرد کے اعتبار سے تمام احکام و قواعد پر مبنی ہو، لیکن اس قسم کی ملت کا وجود میں آنا اور ظاہر ہونا ان وجوہ کی بنا پر امر محال ہے۔

اوّل۔ اس ملت کے قیم کے لئے لابدی ہے کہ وہ ہر جہت سے اپنے کمال میں فعلاً انتہا پر سرفراز ہو کہ اس کے اور رب کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے۔ اور بنی آدم میں ایسا ہونا محال ہے

دوم ۔ اس قیم کا جو ہر زمانے میں اور اس کلّی ملت میں سے مخصوص جزدی ملتوں کے بارے میں راوی ہو، اور اس کے مطابق فتویٰ دینے والا مفتی ہو، لازمی ہے۔ کہ وہ سارے کے سارے لشاآت[1] اور علوم کا پورے کا پورا احاطہ کریں۔ اور ایسا ہونا ممکن نہیں۔

سوم۔ لوگ سب کے سب ذہین و ذکی ہوں اور ان کے لئے اس راوی اور مفتی سے حصولِ علم ممکن ہو۔ غرضکہ ایسی ملت جو شخص کبیر[2] اور مجموعی انسانی نظام کے لئے حقیقی صحت کے مثل ہو، محال ہے اور جس طرح ایک شخص واحد کی جو عام انسان ہے حقیقی صحت ممکن نہیں، اس طرح اس ملت کا کامل و مکمل طور پر اصلاً وجود میں آنا ممکن نہیں۔ ان حالات میں اللہ تعالےٰ کے لطف و کرم اور اس کی عنایت سے یہ واجب ٹھہرا کہ وہ اس ملت جامعہ کا وجود عالم مثال میں برقرار رکھے۔ اس اعتبار سے اسے "امام مبین" کہا جائے۔ اور عالم جبروتِ الٰہی میں اس کا ایک کلّی نام ہو۔ پھر ہر زمانے میں اس ملت جامعہ میں سے ایک قسط یا حصہ کی جو جامع ہو، تقسیم ہو اور اسے ایک مخصوص ملت کا نام دیا جائے۔ چنانچہ اس ملتِ جامعہ میں سے جو عالم مثال میں ہے اس طرح کی مخصوص ملت کا ترشح اور نزول ہوتا رہے گا۔ یہ ترشح اور نزول یا تو عام طور سے لوگوں پر ہو۔ اگر ان کی طرف سے اس قسم کا کوئی مانع نہ ہو کہ وہ شیطان کے تابع ہیں، یا ان کی بڑی جبلت ہے۔ یا یہ ایک مخصوص شخص پر ہو۔ جس کے لئے سر بلندی و عظمت مقدر کی جائے اور لوگ اس کی طرف

---

[1] وہ امور جو اشیاء کے نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔

[2] پوری نوع انسان کا مجموعہ بحیثیت ایک فرد کے

دور سے چل کر آئیں۔ چنانچہ اس مخصوص شخص کے علم کے نقوش ان میں منعکس ہوں اور اسی طرح اس سے روایات کی جائیں اگر مصلحت یہی ہو۔ یا اس مخصوص ملت کا ترشح اور نزول کثیر التعداد اشخاص پر، ان میں سے ہر ایک کی استعداد کے مطابق ہو۔ پھر یہ سب جمع ہوں اور اس طرح اس زمانے کی یہ ملت بن جائے۔ اوپر ذکر کی ہوئی صور و اشکال کی مثالیں اصل حقیقت سے ملتی جلتی ہیں۔ پس تم سمجھو اور اس پر قائم رہو،



معلوم ہونا چاہیئے کہ رسولوں اور پیغمبروں کی بعثت کے متعلق حکمت الہیہ کا اقتضاء خیر نسبی اور اضافی کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے، جس کا اعتبار بعثت کی تدبیروں میں ضروری ہے اور اس کا اندازہ سوائے ذاتِ علام الغیوب کے کوئی نہیں کر سکتا۔ البتہ ہم اس قدر جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ضرور ہوتے ہیں، جن سے کوئی بعثت خالی نہیں ہوا کرتی اور پیغمبر کی اطاعت اس لئے فرض کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی اصلاح کا مقصد فرماتا ہے .... یہ لوگ خود اس قابل نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو براہِ راست ان امور کا القاء کیا جائے۔ اس لئے ان کی بہبود اس پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ اس وقت کے نبی کی پیروی کریں اور اس بنا پر حظیرۃ القدس میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے کہ لوگ اسی نبی کی اتباع کریں اس کی شکل یا تو یہ ہوتی ہے کہ یہ وقت کسی سلطنت کے ظہور کا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو مبعوث فرماتا ہے، جو ظہور ہونے والی سلطنت کے لوگوں میں دین کو قائم کرے، جیسے کہ ہمارے پیغمبر صلعم کی بعثت ہوئی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی قوم کا بقا اور دوسری قوم کے مقابلے میں اس کو برگزیدہ بنانا مقدر ہو چکا ہے۔۔۔ جیسے کہ سیدنا موسیٰ کی بعثت۔ یا یہ کہ کسی ملت کی قوت اور اس کے دین کے نظام کو زندہ رکھنا مقصود ہے اس صورت میں دین کا مجدد مبعوث کہا جاتا ہے جیسے کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ وغیرہم ....“

(حجۃ اللہ البالغہ)

مدینہ منورہ کے کتب خانے اور علمائے سندھ کی تصانیف

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی[۱]

مدینہ منورہ کی اوائل اسلام میں جو علمی اور سیاسی مرکزیت رہی، وہ محتاج بیان نہیں۔ مدینہ منورہ کی مسجد نبوی عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ درس گاہ بھی تھی۔ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ عموماً اور اصحاب صفہ خصوصاً بارگاہ نبوت سے فیض حاصل کرتے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس مقدس شہر کی سیاسی اہمیت اگرچہ کم ہو گئی لیکن اس کی علمی مرکزیت بدستور قائم رہی۔ دوسری صدی میں فقہائے مدینہ کے حلقہ ہائے درس سے کئی ائمہ مجتہدین پیدا ہوئے جن میں سے امام مالکؒ صاحب موطا نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔

اسلامی مدارس کے ساتھ کتب خانوں کا ہونا ایک لازمی امر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے مدینہ منورہ کے مرکز علم میں ہر دور میں برابر کتابیں جمع ہوتی رہیں۔ اس وقت بھی اس چھوٹے سے شہر میں کئی علمی کتب خانے موجود ہیں۔ جہاں صدیوں کی پرانی اور نایاب کتابوں کے قلمی نسخے موجود ہیں، جن سے کہ ارباب علم استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے مدینہ منورہ کے ایک کتب خانے کے متعلق اپنا تاثر ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔

مدینہ کے کتب خانہ محمودیہ کی کتابوں کو جب میں نے ہاتھ لگایا تو خوشی سے اچھل پڑا

---

[۱] یہ مولانا موصوف کے سفرِ حجاز کی چوتھی قسط ہے

کہ حدیث وتفسیر کا اتنا نایاب ذخیرہ اب تک میری نگاہوں نے نہیں دیکھا تھا، بہت سی کتابیں جن کو صرف ایک نظر دیکھنے کی تمنا تھی، وہ یہاں آج پوری ہو گئی آج پہلا دن تھا کہ میری آنکھوں نے دلائل النبوۃ امام بیہقی، معرفت اصول الحدیث امام حاکم شرح سنن ابی داود لابن ارسلان، شرح بخاری للکرمانی[1] شرح بخاری لابن بطال تمہید شرح موطا لابن عبدالبر، البیان لاحکام القرآن، للموزعی الیمنی، زاد المسیر فی علم التفسیر لابن جوزی، تفسیر ابن ابی حاتم، نزہتہ المحکم شرح صحیح مسلم وغیرہ کتابیں دیکھیں[2]

بالکل یہی کیفیت میری بھی ہوئی، جب میں نے مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت اور مکتبہ حرم مدینہ منورہ کی کتابوں کی زیارت کی۔ میں یہ دیکھکر خوشی اور بہجت سے اچھل پڑا کہ اپنے وطن سندھ کے محدثین کی تصانیف کا کافی بڑا نادر خود مؤلفین کے قلم سے لکھا ہوا ذخیرہ ان کتب خانوں میں نظر آیا۔ اور یہ میری ایک پرانی تمنا تھی جو یہاں مدینہ منورہ میں آکر پوری ہوئی۔ مکتبہ حرم یا مکتبہ محمودیہ میں اعلام علمائے سندھ کی جو نایاب اور نادر کتابیں میری نظر سے گذریں وہ یہ ہیں۔

حیاۃ المھجۃ وایضاح الوجۃ۔ شرح سنن الترمذی ج۔ ۱۔ ۲ تالیف علامہ ابو الطیب سندھی۔ یہ بزرگ عالم، علامہ ابوالحسن کبیر سندھی کے معاصر اور ہم وطن ہیں۔ حنفی مذہب اور نقشبندی طریقت رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی اور وہاں شیخ حسن بن علی عجیمی سے حدیث کی کتب صحاح ستہ پڑھیں علامہ طاہر بن ابراہیم بن حسن کورانی آپ کے ہمدرس تھے۔ آپ کا محبوب مشغلہ تدریس اور تالیف رہا۔ شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالکریم انصاری مدنی شیخ عبداللہ بن ابراہیم بری مدنی، شیخ محمد بن علی شروانی مدنی اور شیخ یوسف بن عبدالکریم مدنی جیسے جلیل القدر محدثین آپ کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حنفی مذہب اور تقلید میں نہایت ہی متصلب تھے۔ اس کے برعکس علامہ ابوالحسن کبیر سندھی حنفی ہونے کے ساتھ آزاد مشرب بھی تھے، چنانچہ ان دونوں ہمعصر سندھی

---

[1] کرمانی کی شرح طبع ہو چکی ہے اسی طرح معرفتہ اصول الحدیث بھی طبع ہو چکی ہے۔

[2] اسلامی کتب خانے ص۶۵ بحوالہ رسالہ معارف ج ۱۸ ص۱۱۲

محدثوں کے آپس میں مناظرے بھی ہوتے رہتے۔ ایک مرتبہ تو ابوالحسن کبیر سندھی کو نماز میں رفع یدین کرنے کی وجہ سے ابوالطیب سندھی کی شکایت پر مدینہ منورہ کے جیل میں بھی جانا پڑا۔

علامہ ابوالطیب سندھی نے اپنی مذکور کتاب میں حنفی مسلک کے مسائل کی بڑی خوش اسلوبی سے تائید فرمائی ہے۔ ہندوستان میں اس کتاب کا ابتدائی حصہ دو جلدوں میں "اربع شروح ترمذی" کے ساتھ قدیم زمانے میں چھپا تھا۔ جو اس وقت نایاب ہے۔[1]

اس مخطوطے کی یہ خوبی ہے کہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ڈیمی سائز کے ۱۸۱۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

جلد اوّل میں شروع کے صفحہ پر مصنف کی طرف سے ایک عربی تحریر ہے، جو بعینہٖ پیش کی جاتی ہے

"وقف لله تعالیٰ ...[2]... مصنفه الفقیر
الی الله تعالیٰ محمد ابوالطیب بن عبدالقادر
علی طلبة العلم الشریف بالمدینة المنورة
وشرط النظر لنفسه مدة حیاته، ثم لاولاده
ابداً ماتناسلوا ثم لمحمد حیاة السندی ثم
لمن یکون مدرساً فی علم الحدیث بالمسجد الشریف
ثم لمن یکون ناظراً علی کتب السید اسمعیل
بشرط ان لا یکون من اهل المناصب
وشرط علی الکل ان یسعوا فی
مطالعته اهل العلم، واستفادتهم منه
وصلی الله الخ

اس کتاب کے مصنف، اللہ تعالیٰ کے محتاج محمد
ابوالطیب بن عبدالقادر کی طرف سے یہ کتاب
مدینہ منورہ کے علم شریف کے شاگردوں کے لئے
وقف ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ مصنف کی زندگی میں
اس کے زیر مطالعہ رہے گی۔ پھر اس کے اولاد کے
لئے نسلاً بعد نسل ہوگی، پھر محمد حیات سندھی کے
لئے ہوگی، اس کے بعد مسجد شریف میں علم حدیث
کا جو مدرس ہوگا اس کے لئے (وقف) ہوگی پھر
سید اسمعیل کی کتابوں کے نگراں کے لئے ہوگی لیکن اس شرط
پر کہ وہ صاحب منصب نہ ہو، سب کے لئے یہ شرط
لازم ہوگی کہ اہل علم کے مطالعہ اور اس کتاب سے استفادہ
کی کوشش کرتے رہیں۔

---

[1] میرے ذاتی کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ [2] درمیان کے الفاظ مٹے ہوئے ہیں۔

شیخ محمد حیات سندھی علامہ ابوالحسن کبیر سندھی کے تلمیذ ہیں، اور شیخ ابوالطیب، شیخ ابوالحسن سندھی کے معاصر تھے لہٰذا محمد حیات سندھی کا اوپر کی عبارت میں جس سادگی سے بغیر تلقیب کے نام لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد حیات سندھی نے شیخ ابوالطیب سندھی سے بھی استفادہ کیا ہوگا

مذکور تحریر کے بعد ایک دوسری عبارت مرقوم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف علام نے اس وقف سے رجوع کیا تھا وہ عبارت یہ ہے۔

بیعت هذه الحاشیة لما ثبت رجوع الشیخ الواقف لها بمعرفة وصیة علی اولاده وحیث لم یحکم الحاکم الشرعی بلزوم وقفیتها۔	یہ حاشیہ اس لئے فروخت کیا گیا کہ وقف کرنے والے شیخ کا اس سے رجوع ثابت ہوا بسبب وصیت علی الاولاد کے اور اس لئے بھی کہ حاکم شرعی نے وقف کے لزوم کا حکم نہ فرمایا۔

دوسری جلد کے اخیر میں اس حاشیہ کی تالیف سے فراغت کی تاریخ ۱۸ شوال بروز سنیچر سنہ ۱۱۳۴ھ بتائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی یہ تالیف آخر عمر کی ہے۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

یقول مؤلفه العبد الضعیف الراجی عفو ربه الکریم قد فرغت من تالیفه یوم السبت ثامن عشر شهر شوال سنة اربع وثلثین ومائة والف من هجرة من له العز والشرف الخ	اس (حاشیہ) کا مؤلف بندۂ ضعیف اپنے رب کے عفو کا امیدوار کہتا ہے کہ میں اس کتاب کی تالیف سے بروز شنبہ، ۱۸ تاریخ شوال سنہ ۱۱۳۴ھ ہجری میں فراغت پائی۔

۲- قرة الأنظار شرح تنویر الابصار - تالیف شیخ ابوالطیب سندھی - تنویر الأبصار فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے۔ جس کی شرح الدر المختار تالیف علامہ حصکفی اور اس پر علامہ ابن عابدین کا حاشیہ رد المختار مشہور زمانہ ہے، مگر الدر المختار کے مطالعہ سے جس کا واسطہ پڑا ہوگا، اس کو ضرور یہ احساس ہوا ہوگا کہ در مختار کی عبارت تعقید، اغلاق اور الغاز سے مملو ہے، لہٰذا وہ صحیح معنی میں تنویر کی شرح کہلانے کی مستحق نہیں۔

علامہ ابوالطیب سندھی کی مذکور شرح ہر لحاظ سے در مختار پر فوقیت رکھتی ہے، عبارت کی وضاحت اور احادیث صحیحہ کو بطور دلائل پیش کرنا اس کی خصوصیت ہے، مگر ابنائے زمانہ کی ستم ظریفی کا کیا کہنا کہ در مختار نصاب میں داخل ہو گئی اور قوۃ الانظار طباعت میں بھی نہ آ سکی، ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ ندرت اور نایابی ہو۔ مصنف علام کے اپنے آبائی وطن سندھ کے کسی بھی کتاب خانے میں اس کتاب کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ البتہ سنا ہے کہ پشاور یونیورسٹی کی لائبریری میں اس کا واحد نسخہ موجود ہے جو نقص وغیرہ سے مبرا ہے۔

مکتبہ حرم کا یہ نسخہ ایک جلد میں ہے اور "باب المغنم وقسمتہ" تک ختم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ناقص ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ سندھ کا سندھی ادبی بورڈ جیسا علمی ادارہ پشاور یونیورسٹی سے اس نسخہ کو حاصل کر کے طبع کرائے اور اس طرح یہ نادر کتاب تلف ہونے سے محفوظ ہو جائے۔

۳۔ المتانۃ فی مرمۃ الخزانۃ۔ تالیف: علامہ مخدوم محمد جعفر بوبکائی سندھی۔ کتاب کا خط عمدہ ہے سن کتابت معلوم نہ ہو سکا۔ علامہ محمد جعفر ہجری دسویں صدی کے اعلام علمائے میں سے گزرے ہیں۔

اس کتاب کی جلالت شان کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مخدوم محمد ہاشم سندھی ٹھٹوی، مخدوم عبدالواحد سیوہانی سندھی اور دیگر اعلام سندھ کی کتابوں اور فتاویٰ میں متانۃ کے حوالے موجود ہیں فروع فقہی کی جزئیات سے یہ کتاب بھرپور ہے۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی حیدرآباد کی طرف سے احقر راقم کی تحقیق اور مقدمہ کے ساتھ ایک سال ہوا ٹائپ کے ایک ہزار صفحات پر یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

۴۔ منحۃ الباری فی جمع روایات صحیح البخاری۔ تالیف علامہ محمد عابد سندھی انصاری شیخ محمد عابد سندھی سندھ کے آخری محدث ہیں۔ ان کے تبحر علمی اور قوت تحریر کے موافق اور مخالف سب معترف ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع میں نادر اور نایاب ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، مدینہ منورہ میں دنیا کا یہ واحد نسخہ ہے اور کسی علمی کتاب خانے کی فہرست میں اس کتاب کا نام مجھے دیکھنے میں نہیں

آیا۔ کتاب کیا ہے ایک بیش بہا علمی ذخیرہ ہے جو بڑی سائز کے ۹۶۶ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے اندراج کا نمبر ۱۶۱۴ ہے۔

منحتہ الباری کا یہ مخطوطہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جس طرح حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت تیز لکھتے تھے، اس لئے ان کے خط میں حسن کتابت کا فقدان تھا اور پڑھنے میں بھی دقت ہوتی تھی، شیخ محمد عابد سندھی کے متعلق بھی یہی روایت مشہور ہے کہ بہت تیز لکھتے تھے، مگر اس تیزی کتابت کے ساتھ ان کے خط کی ایک خوبی یہ تھی کہ حروف اگرچہ سادہ اور حسن سے خالی ہوتے تھے لیکن ان کے پڑھنے میں کسی کو بھی دقت پیش نہیں آتی۔ مولانا محب اللہ صاحب العلم درگاہ پیر جھنڈو کے علمی کتب خانے میں شیخ محمد عابد سندھی کی تالیف المواہب اللطیفہ شرح مسند الامام ابی حنیفہ (جو کہ نادر روزگار تالیف ہے اور بقول علامہ محدث رشد اللہ صاحب العلم (پیر جھنڈو) یہ کتاب فتح الباری کے ٹکر کی تالیف ہے) خود مصنف کے ہاتھ کا مخطوطہ ہے۔ اس کو پہلے یہاں دیکھ چکا تھا۔ بالکل ویسا ہی منحتہ الباری کا خط تھا۔ کتاب کے شروع میں مصنف علام نے اس کتاب کے وقف کے سلسلہ میں ایک عبارت لکھی ہے جو بعینہ نقل کی جاتی ہے۔

وقفت للہ تعالیٰ وجعلت النظر فیہ لنفسی مدۃ حیاتی ثم للارشد من ذریتی ذکراً کان او انثی ان کان لی عقب والا فللارشد من ذریۃ جدی شیخ الاسلام محمد مراد ابن الحافظ یعقوب بن محمود الانصاری ذکراً کان اُو انثی لینتفع بنظرہ الخاص والعام حررہ مؤلفہ وواقفہ محمد عابد - ۱۲۴۹

(اس کتاب کو) میں نے اللہ کے لئے وقف کیا (اس شرط پر کہ) کہ اپنی زندگی میں میرے زیر نظر رہے گی پھر میری اولاد میں سے جو صالح اور رشد والا ہوگا اس کے لئے چاہے وہ مرد ہو یا عورت اگر میری اولاد ہو، ورنہ میرے دادا شیخ الاسلام محمد مراد ابن حافظ یعقوب بن محمود انصاری کی اولاد میں سے جو صالح ہو مرد ہو یا عورت اس کے لئے تاکہ اس کے مطالعہ سے خاص اور عام سب نفع حاصل کریں۔ اس کتاب کے مولف اور وقف کرنے والے محمد عابد نے اس تحریر کو لکھا ۱۲۴۹ھ میں

اس تحریر کے بعد مؤلف علام کی زندگی صرف تین سال رہی۔

کتاب کے آخر میں شیخ محمد عابد سندھی کے ایک تلمیذ خاص لطف اللہ بن احمد کی تحریر بھی موجود ہے جس میں اس نے مؤلف کے حکم سے اس مسودہ سے فراغت کی تاریخ تحریر کی ہے، جو کہ ماہ جمادی الاول کی آخری تاریخ ہے مگر سن کتابت دیکھنے میں نہ آیا۔ اس تحریر میں مصنف علام کا سندھ میں سیوہان کو مولد بتایا گیا ہے۔ یہی ہم نے اپنے اساتذہ سندھ سے بھی سنا تھا، مگر نواب صدیق حسن خاں نے "لواری" بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ لواری شریف میں شیخ محمد عابد کا بہت آنا جانا ہوتا تھا۔ کیونکہ خواجہ محمد زمان ثانی ابن خواجہ محمد حسن ابن خواجہ محمد زمان اوّل سے وہ نقشبندی طریقت میں بیعت تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ خواجہ محمد زمان دوم نے حدیث کی سند اپنے مرید شیخ محمد عابد سے حاصل کی اس لحاظ سے وہ اپنے مرشد کے استاد ٹھیرے۔ سندھ کے بعض ادباء سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ انہوں نے لواری کو آپ کا وطن بتایا ہے۔

تلمیذ شیخ محمد عابد کی عبارت ملاحظہ ہو۔

الحمد لله امرنی مؤلف هذا السفر الجلیل العلامة الاوحد الخ محمد عابد بن احمد علی السندی السیوستانی الأصل والمولد الحدادی النشأة۔ أن احرر تاریخ فراغه من بخار هذه المسودة الخ	سب تعریف اللہ کے لئے ہے مجھ کو اس بڑی کتاب کے مؤلف علامہ، یگانہ الخ محمد عابد بن احمد علی سندھی جو کہ وطن اور جائے پیدائش کے لحاظ سے سیوھانی اور نشوونما کے لحاظ سے حدادی ہیں، یہ فرمایا کہ میں اس اصل مسودہ سے فراغت کی تاریخ لکھوں الخ
احقر لطف الله بن احمد کمال	احقر لطف اللہ بن احمد کمال

۵۔ حصر الشارد من اسانید محمد عابد۔ یہ کتاب بھی شیخ محمد عابد سندھی کی تالیف ہے اور جیسے دوسرے محدثین نے اپنے اسانید کو جمع کرکے اثبات تیار کی ہیں حصر الشارد بھی بالکل اسی طرح ہے۔ مشہور ثبت "الیانع الجنی" میں اس کے کئی حوالے موجود ہیں۔

اس مخطوطہ کے ۳۰۸ صفحات ہیں۔ اس کا ایک دوسرا قلمی نسخہ مولانا سید محب اللہ صاحب العلم درگاہ پیر جھنڈو کے علمی کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔

مدینہ منورہ کے مختصر قیام کے دوران مکتبہ (محمودیہ) حرم کے ساتھ مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا۔ مطالعہ کے لئے بڑا اچھا انتظام تھا۔ نیچے فرش پر غالیچے بچھے ہوئے تھے جن پر تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ہر فن کی فہرست کتب موجود تھی کتابیں بھی بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں مجھے تو اعلام علمائے سندھ کی کتابوں کی خاص تلاش تھی اس لئے پہلی فرصت میں ان کی تلاش اور زیارت کی بعد میں جو مختصر وقت ملا اس میں کچھ دوسری کتابیں بھی دیکھیں جن کا تذکرہ خالی از معلومات نہ ہوگا۔ عربی دستور کے مطابق ہر آدھے گھنٹے کے بعد حاضرین کی طراوت اور تازگی دماغ کے لئے چائے بھی پلائی جا رہی تھی۔ کتابوں کی تفصیل عرض خدمت ہے۔

حاشیۃ العلامۃ السندی علی صحیح البخاری۔ علامہ ابوالحسن کبیر سندھی نے حدیث کی جملہ کتب صحاح ستہ پر حواشی لکھے تھے اور ان حواشی کو دریا در کوزہ کہا جائے تو بجا ہوگا۔ ابوالحسن کبیر روایت کے امام ہیں، سنن ابی داؤد کی تعلیقات کے علاوہ باقی سب چھپ چکے ہیں۔ زیر بحث کتاب صحیح بخاری پر تعلیقات ہیں۔ اس کی کتابت سے فراغت کا سن اتوار صفر ۱۱۷۷ھ ہے، یعنی مصنف علام کی وفات کے ۳۹ سال بعد کا مخطوطہ ہے، خط عربی ہے۔ سائز ڈیمی۔ اندراج ۲۳ کتب الاحادیث کتاب کے سرورق پر یہ عبارت تحریر شدہ ہے۔

ھٰذا حاشیۃ الامام والعلامۃ الھمام ابی الحسن السندی علی متن الامام البخاری	یہ امام علامہ ھمام ابوالحسن سندھی کا امام بخاری کے متن کا حاشیہ ہے۔

مکتبہ عارف حکمت کے بانی کی اس کتاب پر یہ تحریر وقف کے سلسلے میں نظر آئی۔

مما وقفہ العبد الفقیر الی ربہ الغنی احمد عارف حکمۃ اللہ بن عصمۃ اللہ الحسینی فی مدینۃ الرسول الکریم وعلی آلہ	یہ ان (کتابوں) میں سے ہے جس کو بندۂ فقیر اپنے غنی پروردگار کے محتاج احمد عارف حکمۃ اللہ بن عصمۃ اللہ حسینی نے وقف کیا مدینۂ رسول کریم میں آپ

الصلوٰۃ والتسلیم بشرط أن لا یخرج عن خزانتہ والمومن محمول علی امانتہ ۱۲۶۶

پر اور آپؐ کی آل پر صلوٰۃ اور سلام ہو۔ (وقف کے لئے) شرط یہ ہے کہ کتاب خانے سے باہر نہ نکالی جائے مومن پر امانت کی ذمہ داری لازم ہے ۱۲۶۶

اس پر وقف کرنے والے کی مہر بھی ثبت ہے۔

۷۔ تعلیقات علی صحیح الامام مسلم۔ تالیف امام ابوالحسن کبیر سندھی

مولانا عبدالتواب صاحب ملتانی نے پیر جھنڈو کے علمی کتب خانے سے اس کتاب کا قلمی نسخہ حاصل کرکے طبع کرایا تھا، یہ نایاب ہوچکا تھا۔ اس کو حال میں نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی نے صحیح مسلم کے آخر میں چھاپ دیا ہے جزاہ اللہ خیرا۔

مدینہ منورہ والا مذکور قلمی نسخہ صحیح اور صاف لکھا ہوا ہے۔

۸۔ رسالۃ فی بیان قراءۃ المأموم خلف الامام الحنفی۔ تالیف علامہ ابوالحسن کبیر سندھی۔

اس رسالہ میں حنفی امام کے پیچھے مقتدی کی قراءۃ فاتحہ کے سلسلے میں تحقیق پیش کی گئی ہے۔ رسالہ کے اوراق ۲۲ اور ہر صفحہ کی سطریں ۲۱ ہیں خط نسخ میں ہے۔ سن کتابت ۱۲۳۹ھ ہے نمبر اندراج ۱۰۲ ہے۔

۹۔ جمع المناسک و نفع الناسک۔ تالیف علامہ رحمت اللہ سندھی۔

علامہ رحمت اللہ سندھی کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ مناسک حج میں آپ کی تالیف دنیا کے ہر کتب خانے کی زینت رہی ہے۔ ملا علی قاری مکی نے آپ کے متن کی شرح کی ہے جس پر کئی عرب علمائے محققین کے حواشی ہیں اور یہ مصر میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ زیر بحث رسالہ بھی مناسک حج کے بیان میں ہے، خط عربی۔ اوراق ۳۲۱ اور سن کتابت ۱۱۷۵ھ ہے نمبر اندراج ۶۸ الفقہ ہے

۱۰۔ شرح الأحادیث الأربعین النوویۃ۔ تالیف علامہ محمد حیات سندھی۔

چالیس احادیث کے مجموعے کئی پائے جاتے ہیں مگر امام نووی کا مجموعہ سب سے مشہور ہے۔ اس رسالہ میں شیخ محمد حیات سندھی نے ان کی شرح فرمائی ہے۔ خط نسخ اوراق ۳۲ ہر صفحہ

کی سطریں ۱۹ ہیں۔ سنہری مزین۔ سن کتابت ۱۱۴۴ھ یعنی مصنف کی حیات کا مخطوطہ ہے۔ کاتب کا نام نظر آیا۔ ممکن ہے مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔

۱۱۔ بہجتہ النظر شرح شرح نخبتہ الفکر۔ تالیف علامہ ابوالحسن صغیر سندھی۔

شیخ ابوالحسن صغیر سندھی، علامہ محدث محمد حیات سندھی کے تلمیذ رشید ہیں۔ استاذ الاساتذ کے ساتھ ہم کنیت ہونے کی وجہ سے صغیر مشہور ہوئے۔ زیرِ نظر کتاب حامل المتن شرح نخبہ کی شرح ہے جو بہت پہلے ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے اور اب نایاب ہے۔[1]

گیارہویں صدی ہجری کے ایک دوسرے محدث سندھی عالم قاضی محمد اکرم نصرپوری سندھی نے بھی شرح نخبہ کی شرح امعان النظر کے نام سے لکھی ہے جو کہ نہایت ہی بسیط اور مفصل شرح ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کی تالیفات میں اکثر اس شرح کے حوالے موجود ہیں۔ اس طرح مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی سندھی کی علمی تصنیفات میں بھی امعان النظر کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ بہجتہ النظر میں اس کے مقابلہ میں ایجاز اور اختصار ہے۔

امعان النظر کے تین مخطوطے مشہور ہیں۔ (۱) پیر جھنڈہ کی علمی لائبریری کا نسخہ۔ یہ نسخہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کے درس میں رہا ہے۔ ایک دو جگہ حاشیہ پر مخدوم صاحب اور ان کے پوتے مخدوم ابراہیم صاحب القسطاس کی تحریر بھی موجود ہے۔ (۲) رامپور کی علمی لائبریری کا نسخہ یہ بعد کا لکھا ہوا ہے۔ (۳) ازہر کا نسخہ۔ ان تینوں نسخوں سے ایک قدیم تر مخطوطہ ۱۱۱۸ھ کا لکھا ہوا احقر راقم کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے جو مجھے سندھ کے ایک نوجوان عالم مولانا قاضی عبدالکریم بیرائی سے حاصل ہوا۔ فللّٰہ الحمد

یہ تو تھیں اعلام سندھ کی تصنیفات۔ ان کے علاوہ مکتبہ شیخ الاسلام میں دوسری نادر روزگار تصانیف بھی نظر سے گذریں۔ جس کا ذکر خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

---

[1] اس کا ایک مطبوعہ نسخہ میرے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے۔

۱۲- فتح الباقی شرح الفیۃ العراقی۔ تالیف علامہ زکریا انصاری

۱۳- عقود الجواہر المنیفۃ فی ادلۃ مذہب الامام ابی حنیفۃ۔ تالیف سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی۔ یہ کتاب اگرچہ مصر میں چھپ چکی ہے لیکن اس مخطوطے کی یہ خوبی ہے کہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور سن کتابت سنہ ۱۱۹۷ھ ہے۔ سید مرتضیٰ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے تلمیذ خاص ہیں۔ آپ کی دوسری تصنیف تاج العروس شرح قاموس اور احیاء علوم کی شرح مشہور زمانہ ہے۔

۱۴- الریاض فی ختم شفاء القاضی عیاض۔ تالیف حافظ سخاوی۔ کتابت سنہ ۹۱۶ھ

۱۵- الفیۃ السیر النبویۃ۔ تالیف حافظ زین الدین عراقی

۱۶- الانوار والحکم واسرار الکلم۔ تالیف سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی

یہ کتاب علم التوحید میں ہے۔ مصنف کے ہاتھ کا مخطوطہ ہے جو کہ ۲۵ اوراق میں پھیلا ہوا ہے ہر صفحہ کی سطریں ۲۱ ہیں۔ حاشیہ پر سنہری کام ہے۔

۱۷- الزوراء المشتملۃ علی زبدۃ الحقائق و نبذۃ الدقائق فی شرحہا۔

یہ فلسفہ الہیات کا مشہور رسالہ اور اس کی شرح ہے۔ تالیف محقق جلال الدین دوانی۔ اوراق ۱۴۔ ہر صفحہ کی سطریں ۲۵ اور سن کتابت سنہ ۱۱۲۱ھ ہے۔ علم التوحید میں اندراج ۲۷ ہے۔
اس رسالہ[1] کی ایک شرح مخدوم نعمت اللہ سندھی ٹھٹوی نے بھی لکھی ہے جو کہ اپنی سلاست اور روانی عبارت کے لحاظ سے بے نظیر شرح ہے۔ مخدوم نعمت اللہ سندھ کے مشہور محقق محمد ہاشم ٹھٹوی

---

[1] اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی احقر کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے، اصل نسخہ مولانا سید وہب اللہ صاحب العلم پیر جھنڈو کے علمی کتب خانہ کا تھا جو کہ نہایت بوسیدہ تھا۔ جناب مورخ سندھ پیر حسام الدین راشدی کی عنایت سے یہ فوٹو اسٹیٹ کاپی حاصل ہوئی۔ [2] اس کا ایک قدیم صحیح اور کامل مخطوطہ میرے دوست اور تلمیذ مولانا الحاج عبدالکریم سیرائی سندھی کے کتاب خانے میں موجود ہے [3] اس کا ایک نسخہ جو کہ آخر سے کرم خوردہ ہے احقر کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے
(۲ ، ۳ ص ۴۲ پر ملاحظہ ہو)

کے استاذ کے استاذ ہیں۔

۱۸۔ تعلیقات علی المقدمات الاربع من التوضیح والتلویح۔ تالیف علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی۔ اوراق ۴۲۔ سطور ہر صفحہ ۲۱۔

یہ تعلیقات بھی ہندوستان میں چھپ چکے ہیں۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے صاحبزادے عبداللہ لبیب نے ان کو جمع کیا تھا۔[۵۲]

بارہویں صدی ہجری کے ایک سندھی عالم روح اللہ بکھری نے بھی تلویح پر تعلیقات لکھی ہیں۔ جو نہایت بسیط اور سہل عبارت میں ہیں۔[۵۳]

۱۹۔ شرح السیرالکبیر۔ تالیف امام سرخسی۔ خط نسخ ۔ ۸۹۷ سطلی سنہری خوبصورت اندراج ۱۳۱

۲۰۔ شرح کتاب الطحاوی۔ تالیف علامہ اسیجابی خط نسخ اوراق ۳۰۱ سطور ہر صفحہ ۳۵۔ اندراج ۱۳۷

۲۱۔ شرح منظومۃ شروط الصلوۃ۔ تالیف شیخ حسین راشدی۔ اندراج ۶۵ فقہ حنفی۔

۲۲۔ خزانۃ الروایات۔ خط نسخ۔ اوراق ۲۷۹ سطور ہر صفحہ ۴۳ سن کتابت ۱۱۳۳ھ

خزانۃ الروایۃ کے مؤلف کے متعلق مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی اور مولانا عبدالحی حسنی صاحب نزہۃ الخواطر اور دوسرے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس کا نام قاضی جکن ساکن قصبہ کن گجرات ہے۔

میں نے المتانۃ فی مرمتہ الخزانۃ کو ایڈٹ کرتے وقت ان بزرگوں کے حوالہ سے قاضی جکن لکھا ہے لیکن مکتبہ شیخ الاسلام کے اس مخطوطے میں مؤلف کا نام القاضی حسین الہندی بتایا گیا ہے اور ابتدائی اوراق میں کشف الظنون کی یہ عبارت تعارف میں تحریر ہے۔ فی کتاب کشف الظنون خزانۃ الروایات فی الفروع للقاضی حسن الحنفی۔

کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے۔ بید عامر الأشمونی بلدا، الشافعی مذھبا البرہانی خرقتہ۔

۵۲ ۵۳ صفحہ ۵۲ پر

اب یہاں ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ کشف الظنون کے مطبوعہ نسخہ میں جو ہمارے ہاں موجود ہے، تحریف ہوگئی ہو اور حسن کے بجائے جکن لکھا گیا ہو۔ اصل مخطوطے میں جکن شہر کا نام بتایا گیا ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی کو بھی اس ہندی عالم کے متعلق کشف الظنون سے معلومات فراہم ہوئی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہو کہ عرب علماء نے جکن ہندی نام کو حسن بنایا ہو۔ واللہ اعلم۔

۲۳۔ تیسیر المقاصد شرح نظم الفرائد لابن وھبان۔ تالیف شیخ حسن شر بنلالی خط نسخ۔ اوراق ۷۶، ۲۴ ہر صفحہ کی سطریں۔ ۲ کتابت سنہ ۳،۳ھ خوبصورت سنہری منون

"اس زمانے (عہد مغلیہ) کا ایک اور اہم علمی مرکز زیریں سندھ کا دارالخلافہ ٹھٹھہ تھا۔ مغربی پنجاب اور سندھ کی ثقافتی تاریخ ابھی تک مرتب نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملتان، اچہ، منصورہ اور دیبل کے قدیم اثرات اور ایران کے قرب کی وجہ سے اس علاقہ میں علوم اسلامی اور عربی فارسی ادب کا بہت بلند معیار تھا۔ اور ٹھٹھہ، بھکر، سیوستان اور بیلہ (نزد سیوستان) میں علم و ادب کے بڑے مرکز تھے۔ جب خاندان تغلق کے زوال کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہوگئی اور سندھ خود مختار ہوگیا۔ اس وقت بھی علم و فضل کی سرپرستی جاری رہی اور اس علاقے میں بڑے اہل علم پیدا ہوئے۔ مغلیہ حکومت میں بھی کئی سندھی علماء نے نام پایا۔ متعدد سندھی علماء (مثلاً سید نظام الدین ٹھٹوی اور مولانا ابوالخیر ٹھٹوی) نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں مدد دی۔ قاضی ابراہیم ٹھٹوی عہد شاہجہانی میں دارالخلافہ کا مفتی اور قاضی عسکر تھا۔
ملا محمد دماغی ٹھٹوی شاہجہاں کے ایام شاہزادگی میں اس کا پیش امام تھا۔"

(رودِ کوثر از شیخ محمد اکرام)

ابن رشد کے سیاسی افکار[1]

ترجمہ ۔ محمد سرور

یہ ہماری غلطی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ ابن رشد صرف ارسطو کے فلسفہ کی بڑے شارحین ہی میں سے ایک ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ افلاطون کی مشہور تصنیف "جمہوریہ" کے شارحین میں سے بھی ہے۔ اگرچہ وہ افلاطون کے سیاسی افکار کا پورا احصاء نہیں کر سکا۔

ابن رشد علم السیاست کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، جیسا کہ علم طب کی کیفیت ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ارسطو کا علم الاخلاق نظری اعتبار سے اس کا جزو اول ہوگا۔ اور افلاطون کی جمہوریت عملی لحاظ سے اس کا جزو ثانی اور یہ کہ علم السیاست عملی فلسفہ کا ایک جزو لا یتجزی ہے۔ باقی رہے عملی فلسفہ کے دو دوسرے اجزا، تو وہ علم الاخلاق اور علم الاقتصاد ہیں۔ اس کی فلسفے کی یہ تقسیم یونانی افکار و آرا سے مستفاد ہے،

ابن رشد نے جمہوریہ افلاطون کی جو شرح کی ہے، اسے آج اس زمانے میں جو چیز اہم اور مفید بناتی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی اس شرح میں اس کا دوسری شرحوں میں جو عام معمول ہے وہ اس سے الگ راہ اختیار کرتا ہے، بلکہ وہ اس میں اپنے فلسفی مسلک کے خلاف جاتا ہے

---

[1] یہ مضمون عربی مجلہ "البیّنۃ" سے ماخوذ ہے، جسے خاص اس مجلّہ کے لئے کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر "ا۔ ج، روزنطال" نے لکھا۔ "البیّنۃ" مراکش کے شہر "الرباط" سے شائع ہوتا ہے۔ (مدیر)

اس سلسلے میں ابن رشد کے سامنے جمہوریہ افلاطون کا وہ نسخہ تھا، جو اس تک عربی متن میں پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ اس کی روشنی میں اسلامی سلطنت کا تجزیہ کرتا ہے اور خاص طور سے وہ اپنی ہم عہد دو سلطنتوں یعنی سلطنت مرابطین اور سلطنت موحدین کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ وہ اپنے اس تجزیہ و تنقید کی بنیاد اس تجربے پر رکھتا ہے، جو اسے قرطبہ میں محکمہ قضا میں بحیثیت مالکی قاضی کے عہدے پر فائز ہونے سے حاصل ہوا تھا۔

ہم اگر یہاں یہ کہیں، تو راہِ صواب سے زیادہ دور نہیں ہوں گے کہ موحدین اور مرابطین کے عہد حکومت میں بھی قاضی کے عہدے کی وہی حیثیت باقی تھی، جو ان حکومتوں سے پہلے دور میں تھی۔ اور اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ابن رشد کا دادا اپنے زمانے میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھا اس دور میں قاضی کا صرف یہ کام نہیں ہوتا تھا کہ وہ بس فیصلے اور احکام صادر کر دیا کرے، بلکہ اس کے ذمے سول ایڈمنسٹریشن (ادارہ مدنیہ) بھی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے ابن رشد کے پاس منصب قضا سنبھالنے کی وجہ سے سیاسی زندگی کے تمام شعبوں میں بڑا وسیع اور پائیدار تجربہ جمع ہو گیا ہوگا اور سلطنت کے نظم و نسق اور اسلامی معاشرے کے اسرار و رموز کے بارے میں بھی اس کی بڑی گہری نظر ہو گئی ہو گی۔ اس کے علاوہ افلاطون کی طرح ابن رشد کی بھی یہ رائے تھی کہ سلطنت کی عنان اقتدار فلسفیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے اور اگر یہ ناقابل عمل ہو تو فلسفیوں کو چاہیئے کہ نظم و نسق کی اصلاح اور بہتری کے لئے اپنے عقلی معیاروں کے مطابق اس پر تنقید کرتے رہیں۔ فلسفی کا مقام سیاسی گروہوں کی باہمی آویزش اور آپس کے متناقض خصوصی مفادات سے بلند و بالا ہے اور اسے ان چیزوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ عقل کو حاکم مان کر پوری بہادری اور آزادی سے اپنی مقصود و مطلوب حقیقت کی خدمت کرے۔ اور عقل وہ گراں بہا عطیہ ہے، جو اللہ تعالےٰ نے انسان کو بخشا ہے اس ضمن میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ابن رشد ایک متدین فلسفی ہے۔

ابن رشد نے افلاطون کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ریاست و مملکت کے پس منظر میں حقیقت پر بحث کی ہے۔ یہاں اس کی تو گنجائش نہیں کہ اس کے سیاسی افکار و آراء کی اس کے

پورے فلسفہ کی روشنی میں شرح کی جائے۔ لیکن ابن رشد نے اس سلسلہ میں افلاطون کی جو شرح کی ہے میری بحث اس کی صرف دو بنیادی باتوں پر محدود رہے گی۔ ایک ریاست میں قانون الٰہی اور قانون انسانی کی حیثیت، اور دوسرے اپنے عہد کی اسلامی سلطنت پر اس کی تنقید اور خاص طور سے مسلمانوں کے ہاں عورتوں کی جو حالت تھی، اس کے بارے میں ابن رشد کی شدید ناپسندیدگی۔

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ابن رشد جو قرون وسطی میں مسلمانوں کے بڑے فلسفیوں میں سے سب سے آخری ہے، اس کی عظیم فکری سرگرمیوں میں فلسفے کا کیا مقام تھا؟ اس ضمن میں ضروری ہے کہ ابن رشد کے عہد میں فلسفہ اور فلسفیوں کو جس بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، ہم اسے جانیں، کیونکہ اس سے اس فلسفی کو اچھی طرح سمجھا جاسکے گا۔ ابن رشد سے پہلے امام الغزالی نے فلسفے پر جو حملے کئے تھے اس سے اسلامی فلسفہ کی حیثیت مدافعانہ ہوگئی تھی۔ امام الغزالی کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کے جواب میں ابن رشد نے تہافتہ التہافتہ نام سے جو کتاب لکھی تھی خواہ وہ کتنی بھی کامیاب رہی ہو، لیکن اس سے امام الغزالی ہی کے موقف کو تقویت پہنچی اور اس کے بعد اسلامی فلسفہ ایک خاص نہج پر چل پڑا۔ امام الغزالی جیسے بڑے متکلم فلسفی نے فلسفہ پر جو حملہ کیا اور ابن رشد کو اس کا دفاع کرنا پڑا، تو اس کی وجہ سے آزاد فکر ایک محدود دائرے میں محصور ہو کر رہ گیا۔ یہاں ہمیں اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہیئے کہ ابن رشد دین اسلام کا معتقد ہے اور وہ پوری طمانیت سے شریعت کی بالادستی اور فلسفی بحث وجدل کے دائرے کی تحدید کو قبول کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ لازمی ہے کہ دین اسلام کو ماننے والے خواہ وہ فلسفی ہوں یا متکلم یا عوام الناس، اسلامی معتقدات پر یقین رکھیں۔ نیز یہ معتقدات فلسفیوں کی بحثوں سے جو محض دلیل و برہان پر اعتماد کرتے ہیں، ماوراء ہیں۔

دینی معتقدات اور فلسفہ کے بارے میں ابن رشد کا جو موقف ہے، وہ دراصل نتیجہ ہے ان حملوں کا جو امام الغزالی کی طرف سے فلسفہ پر کئے گئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس بات کے حق میں بھی تھا کہ اپنے اس موقف کے دائرے کے اندر رہ کر فلسفیانہ دلائل اور عقلی براہین سے دین کی تائید کرے ابن رشد نظریہ نبوت کے بارے میں قدماء کا ہم خیال تھا اور اس ضمن میں ان مسلم فلسفیوں کے نظریات سے جو افلاطون سے متاثر تھے اور نبوت کو سرچشمہ عقل و فعال

کا سوتا سمجھتے تھے، اسے اختلاف تھا۔

علما، اور فقہا کے ساتھ ابن رشد کی جو بحثیں ہوئیں، جب ہم ان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ابن رشد کے ہاں جگہ بہ جگہ ابہام اور تناقض ملتا ہے۔ لیکن ہمیں اس بارے میں زیادہ تعجب نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ آخر ابن رشد موحدین کی سلطنت کا ایک عہدے دار تھا اور گو موحدین کا فلسفیانہ افکار کی طرف بھی کچھ رجحان تھا، لیکن وہ تھے اہل سنت والجماعت کے مسلک کے علمبردار اور شرع کے خالص اسلام کے داعی۔ بہر حال میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ابن رشد پہلے مسلمان تھا اور اس کے بعد فلسفی اور یہ کوئی راز نہیں کہ وحی اور عقل اور قانون الٰہی اور قانونِ انسانی کے درمیان جو کہ عقل کی پیداوار ہے، مطابقت کرنا اگر محال نہیں، تو مشکل ضرور ہے اور میرے خیال میں قرون وسطیٰ میں کوئی بھی ایسا مفکر نہیں گزرا، خواہ وہ مسلمان ہو، یا یہودی یا مسیحی، جو ان دونوں میں پوری طرح مطابقت کر سکا ہو۔ اس سلسلے میں ابن رشد ایمان کی فوقیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس پر وہ مُصر ہے کہ شریعت کے بارے میں دین اور فلسفہ دونوں کے مقاصد ایک ہی ہیں اور یہ کہ ایک فلسفی ہی عقلی لحاظ سے وحی کی تشریح کر سکتا ہے۔ اور یہ کام فقہا کے بس کا نہیں۔ کیونکہ ان کے پاس واضح دلیل (الحجتہ البینتہ) نہیں ہوتی اور اس معاملے میں منطقی دلیل ناکافی رہتی ہے، بلکہ یہ عوام الناس کے لئے خطرناک ہے۔

ابن رشد شریعت کا دفاع کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شریعت ایک واضح حکم ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور شریعت اور فلسفہ میں اساسی فرق یہ ہے کہ فلسفہ کی تلقین صرف منتخب لوگوں کو کی جاتی ہے۔ درآں حالیکہ دین عوام الناس کو سکھایا جاتا ہے لیکن ہر دو کے پیش نظر ہے ایک ہی حقیقت۔ یہاں ہم یہ اشارہ کر دیں کہ ابن رشد کی طرف غلط طور پر دوئی اور ثنویت منسوب کی گئی ہے۔ یہ تصور دراصل اس کے بعض اطالوی متبعین کا ہے ابن رشد کا نہیں۔ ابن رشد کے نزدیک وحی بھی عقل کی طرح حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ لیکن وحی کا درجہ مقدم ہے کیونکہ وہ اللہ کی حکمت مطلقہ کی پیداوار ہے اور عقل کا مصدر و منبع انسان ہے، جو خطا سے خالی نہیں۔ اس ضمن میں

یہ ملحوظ رہے کہ ابن رشد انسانوں کے تین طبقے منوانے پر بہت زور دیتا ہے۔ ایک فلسفی دوسرے متکلمین اور تیسرے عوام الناس۔ اس کے نزدیک یہ تینوں کے تینوں طبقے اپنی عقلی استعداد کے مطابق اللہ کے وجود، رسالت اور آخرت کا جہاں کہ انسان کو اپنے اعمال کی جزا و سزا ملے گی، ادراک کرتے ہیں، لیکن جہاں تک امور عبادت کا تعلق ہے، ان کا دائرہ عقلی تشریح سے باہر ہے۔ ابن رشد کے اس خاص موقف میں ہمیں امام الغزالی کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔

موجودہ بحث میں جو چیز ہمارے لئے اہم ہے وہ ہے ابن رشد کے سیاسی فکر اور دین میں باہمی تعلق۔ افلاطون کا فلسفہ اس کے شاگردوں کی شرح کے ساتھ مسلمانوں میں داخل ہوا۔ اب سیاست میں اہل یونان اور اسلام دونوں کی آراء کا مرجع و اساس عدل کا اصول تھا۔ اس اساس کی بدولت قرون وسطی میں مسلمان اہل فکر کو افلاطون اور ارسطو کے افکار و آرا کو قبول کرنے میں بڑی مدد ملی۔ البتہ ایمان اور عقل، قانون الٰہی و شریعت اور قانون انسانی کی باہمی کشمکش نے ان کے ہاں ایک نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ ایک طرف افلاطون تھا، جو یونانی ہیئتِ سیاسیہ یا ریاست کو مثالی و آئیڈیل قرار دیتا تھا۔ اور دوسری طرف ابن رشد ہے جو اس ریاست کو دین سے خارج ہونے کے باوجود ایک بہترین ریاست سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک مثالی و آئیڈیل ریاست ایک اسلامی ہی ہے جس کی بنا شریعت پر ہے اور وہ نبوت سے اپنے اصول اخذ کرتی ہے اور وہ یقیناً افلاطون کے قوانین سے جو عقل انسانی پر مبنی ہیں فائق ہیں۔ باوجود اس کے کہ دونوں نظاموں میں بنیادی اختلافات تھے، پھر بھی سیاسی نقطہ نظر میں یونانی اور اسلامی افکار میں باہم امتزاج ہوا اور اس طرح فلسفہ واقعی کے ذریعہ وحی اور عقل میں اتصال بروئے کار آیا۔ جس کا دائرہ آگے چل کر فلسفہ نظری تک جا پہنچا اور پھر اس فلسفہ نظری کو دینی معتقدات کی شرح میں استعمال کیا جائے لگا۔ ابن رشد افلاطون سے اس معاملے میں متفق ہے کہ ریاست اور مملکت خواہ وہ یونانی ہو یا اسلامی اس کے لئے معتقدات کا ہونا ضروری ہے۔

ابن رشد کے نزدیک قانون کی آخری غایت اللہ اور حقیقت کی معرفت اور اس زندگی کے

کے بعد دوسری زندگی میں سعادت (نیک بختی) اور شقاوت (بدبختی) پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمارے اعمال کو سعادت کی طرف ہماری رہنمائی کرنی چاہیئے اور شقاوت سے ہمیں بچنا چاہیئے یونانیوں کے ہاں علم السیاست کی آخری غائت سعادت ہے۔ اور اس سلسلے میں علم السیاست کا ایک مقصد "خیر عام" ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک سعادت مشتمل ہے غور و تامل اور عمل خیر ہر دو پر اسی ضمن میں خاص اس مسئلے پر الفارابی نے کتاب "تحصیل السعادۃ" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ سیاست اور دین اور قانونِ افلاطون اور قانون اسلام یعنی شریعت کے درمیان یہی رشتہ ہے۔ ریاست کی اساس قانون ہے اور ایک اسلامی ریاست میں فلسفی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ یقینی برہان و دلیل سے قانون الہی کی شرح کرے اور یہ کہ حقیقت کا اظہار صرف یقینی برہان و دلیل ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ ابن رشد شریعت اور قانون میں جیسا کہ افلاطون نے آخر الذکر کی تحدید کی ہے، بڑا واضح فرق بتاتا ہے۔ اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے، جیسے کہ اوپر بیان ہوا، وہ شریعت کی اوّلیت کا قائل ہے۔ نیز قانون الہی کے بارے میں اس کا جو ایجابی موقف ہے، اس کی وجہ سے اس کے لئے اس قانون (الہی) اور دوسرے مختلف قوانین میں جن کا ذکر ارسطو نے کیا ہے، مقابلہ کرنا آسان ہو گیا ہے۔ باقی رہی شریعت، تو وہ اس کے نزدیک اسلامی ریاست یعنی خلفائے راشدین کے عہد کی خلافت کا ایک کامل قانون ہے اور یہ اسلامی ریاست افلاطون کی مثالی و آئڈیل ریاست سے فائق تر ہے۔

چونکہ یہ خلافت قانون الہی کا جس کی کہ رسول کریم صلعم پر وحی کی گئی ہے، سیاسی مظہر ہے اس لئے ایک مسلمان کا فرمانروائے ریاست سے یہ مطالبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس میں نبوت کے اوصاف ہوں۔ اس معاملے میں ابن رشد کا الفارابی اور ابن سینا سے اختلاف ہے۔ ابن رشد کے نزدیک امام صاحب شریعت رسولؐ کا خلیفہ ہے۔ اور خلافت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں رسولؐ کے قانون کی پوری پوری تطبیق ہوئی۔ اور یہ کہ رسولؐ صاحبِ معجزات سے زیادہ صاحب شریعت تھے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ پر جو قانون بذریعہ وحی اتارا ہے، اس میں انسان کی اِس زندگی کا بھی خیال رکھا گیا ہے

اور آخرت کا بھی، لیکن آخرت کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ قانون انسان کے لئے دو اچھائیوں (حسنۃ فی الدنیا اور حسنۃ فی الآخرۃ) کا حامل ہے۔ اس کے برعکس ابن رشد کی نظر میں افلاطون کا قانون صرف اِس دنیا کی اچھائی کا خیال رکھتا ہے ابن رشد کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح کے قانون فلسفیوں نے ایک مختصر سے منتخب گروہ کے لئے، جس میں خود ان کا شمار ہوتا ہے، وضع کئے ہیں تاکہ وہ دوسروں سے پہلے خود زیادہ سے زیادہ سعادت حاصل کریں۔ باقی رہے عوام الناس، تو وہ اس لئے جان مارتے اور جفائیں جھیلتے ہیں تاکہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ "خیر اعلیٰ" کا جو انسانی مقصد ہے، وہ اسے حاصل کریں اس سلسلے میں ابن رشد افلاطون پر اس بنا پر سخت تنقید کرتا ہے کہ اس نے عوام الناس کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن ایک مسلمان کی نظر میں تمام مومنین کی سلامتی کی بڑی اہمیت ہے۔ ابن رشد انسانوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا، اس کے نزدیک قانون الٰہی ان تمام لوگوں کے لئے جو اپنے درجوں کے مطابق اس کا اتباع کرتے ہیں، امن کی کفالت کرتا ہے دینی نقطہ نظر سے سعادت کے باب میں لوگوں میں جو اختلاف ہوتا ہے تو وہ ان کے درجات اور مراتب کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ ان کی شخصی حیثیتوں کی بنا پر اللہ کے سامنے سب انسان برابر ہیں۔ اور وہ ان کا ان کے فضائلِ (اعمال) کی بنا پر، نہ کہ ان کے انکار کی بنا پر محاسبہ کرے گا۔ ظاہر ہے یہ موقف فلسفہ کا نہیں، بلکہ ایمان کا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک طرف ابن رشد عرفان کے بلند مرتبے پر فائز لوگوں میں سے جو افراد علم الغیب کا سراغ لگانے میں کوشاں ہیں اور وہ اپنے ذہنِ رسا اور عقلی غور و تعمق کے ذریعہ اللہ کی حقیقی اور گہری معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان سے مثالی سعادت کا وعدہ کرتا ہے اور دوسری طرف بحیثیت ایک مسلمان کے اس کا اس پر بھی اصرار ہے کہ شریعت سب کی سلامتی کی کفیل ہے۔

ہم ایک بار پھر اسلامی ریاست کی مثالی خلافت کے موضوع کو لیتے ہیں ابن رشد اس خلافت کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور بحیثیت اہل سنت والجماعت میں ہونے کے وہ اسے مثالی سمجھتا ہے لیکن ایک فلسفی کی طرح وہ اس خلافت اور افلاطون کی ریاست کے درمیان باوجود اس کے کہ دونوں میں بنیادی فرق ہے، موازنہ بھی کرتا ہے۔ اور ان کی روشنی میں وہ اپنے دور کی اسلامی

حکومت کا جائزہ لیتا ہے اور اس پر رائے زنی کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب میں مثالی ریاست کے علاوہ ناقص اور غیر کامل ریاستوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں وہ افلاطون کی غیر کامل ریاستوں سے ملتی جلتی ہیں ابن رشد نے مسلمانوں کی ان غیر کامل حکومتوں کا ذکر کرتے ہوئے الفارابی کی تعبیرات سے کام لیا ہے دراصل یہ الفارابی ہی تھا جس نے مسلمانوں کے ہاں افلاطون کی تعبیرات کو داخل کیا، لیکن ابن رشد الفارابی سے زیادہ باریک بین تھا اس نے حکومتوں کی جو قسمیں گنائی ہیں، وہ الفارابی سے زیادہ ہیں الفارابی نے افلاطون کی صرف چار ہی حکومتوں کے ذکر پر اقتصار کیا ہے، جو یہ ہیں۔

ڈیمو قراطیہ (Democracy) مطلق العنان حکومت (Autocratie)

چند سری حکومت "حکم العصبۃ" (Oligarchy) مستبد حکومت (Tyrannie)

غرض اس طرح الفارابی نے مسلمانوں میں یونانی سیاسی فلسفہ داخل کیا۔

ابن رشد، ابن خلدون کی طرح جو اس کے بعد ہوا ہے، بادشاہت کے نظام کو ایک مخلوط نظام سمجھتا ہے۔ بے شک اس نظام بادشاہت میں نظری و عملی اعتبار سے خلافت اسلامیہ کے اساسی عناصر محفوظ رہے، لیکن بادشاہ کی اپنے اقتدار اور شخصی حکومت کو برقرار رکھنے کی جو خواہش ہوتی تھی اس کی وجہ سے اس نظام میں کافی ملاوٹ پیدا ہو گئی۔ غرض ابن رشد نے مغرب (الجزائر و مراکش) میں قائم شدہ اسلامی سلطنت کو خلافت اسلامیہ اور افلاطون کی مثالی ریاست اور اس کی دوسری چار ناقص و غیر کامل ریاستوں کے معیار سے جانچا ہے۔ میرے نزدیک ابن رشد کے مغرب کی اسلامی سلطنت کو افلاطونی معیاروں سے جانچنے کے معنی یہ تھے کہ وہ اس کا قائل تھا کہ افلاطون جس سے ارسطو نے اپنے اہم نظریات اخذ کئے ہیں، وہ سیاست کے مقاصد، ریاست کے بنیادی اصولوں، اس کی خرابیوں اور پھر وہ جس طرح بتدریج زوال پذیر ہو کر ناقص و غیر کامل حکومتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جیسا کہ خود ایک فرد انسانی اور نوع انسانی کا حال ہے، ان امور پر غائر نظر رکھتا تھا۔ چنانچہ یہاں ہم ابن رشد مسلمان کو ابن رشد فلسفی سے اتفاق کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

ابن رشد نے ان اشعار پر جن سے غیر مستحسن جذبات بھڑک سکتے ہیں، تنقید کی ہے، اسی طرح وہ عہد جاہلی کے اشعار کو دینی اور اخلاقی لحاظ سے ناپسند کرتا ہے اور اس دور کے قصائد میں جو سیاسی مفاسد تھے ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ابن رشد کا شاعری کی اس طرح مخالفت کرنا قدرتی طور پر افلاطون کے اثرات کا پتہ دیتا ہے۔

عورت کے معاملے میں ابن رشد کی جو رائے ہے، وہ صاف طور سے افلاطون سے مستنبط ہے ابن رشد نے بڑی جرأت اور نہایت عجیب طریقے سے اپنی اس رائے کو مسلمانوں کے ہاں اُسوقت عورت کی جو حیثیت تھی، اس پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ افلاطون کی طرح شہری زندگی کے فرائض و واجبات میں عورت کی شرکت کو پسند کرتا ہے۔ اس کی یہ رائے اس زمانے کے مسلمان معاشرے کے عام معمول کے خلاف ہے، جہاں مرد اور عورت کے اختلاط کو بُرا سمجھا جاتا تھا، اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے۔

"ہماری ان سلطنتوں میں عورتوں کی استعداد و قابلیت کا کوئی اظہار نہیں ہوتا کیونکہ ان سے یہاں سوائے نسل و تناسل کے اور کوئی کام ہی نہیں لیا گیا۔ ان کی زندگی اپنے خاوندوں کے اشارے پر موقوف ہے اور وہ سوائے بچوں کو جنتے انہیں دودھ پلانے اور ان کو پالنے کے کسی اور کام کے قابل نہیں سمجھی جاتیں، لیکن اس کی وجہ سے ان کی دوسری سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان سلطنتوں کے بانجھ پن کے اسباب میں سے ایک سبب عورتوں کا اپنے خاوندوں پر بار ہونا ہے ہمارے ہاں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد دو چند ہے اور اس کے باوجود ہم انہیں سوت کاتنے اور کپڑا بُننے جیسے معمولی کاموں کے سوائے دوسرے ضروری کام سکھانا ضروری نہیں سمجھتے۔"

ابن رشد نے یہ جو لکھا ہے، وہ درحقیقت اس کی اپنی ہم عہد سلطنت موحدین پر تنقید ہے اس کے علاوہ جس طرح افلاطون سوفسطائیوں پر تنقید کیا کرتا تھا، اسی طرح متکلمین ابن رشد کی تنقید کا نشانہ بنے۔ وہ انہیں سلطنت کے لئے ایک خطرہ قرار دیتا تھا۔

ابن رشد نے اپنے پیش رو فلسفی ابن باجہ سے "مدنیہ امامیہ" کی اصطلاح مستعار لی ہے جس

کا اطلاق وہ ایک ناقص وغیر کامل ریاست پر کرتا ہے ۔ ابن رشد کے نزدیک یہ "مدینہ امامیہ" اس کے عہد کی سلطنت موحدین ہے، جو افلاطون کی تعبیر کے مطابق دیموقراطی نظام سے منتقل ہو کر استبدادی نظام کی حامل ہو گئی تھی ۔ اس سلسلے میں ابن رشد کہتا ہے ۔

"پہلے اموال عوام کے ہاتھ میں تھے پھر وہ حکمراں خاندانوں کے پاس جمع ہو گئے
یعنی رعایا کا کام یہ رہ گیا کہ وہ بادشاہ کے شخصی مفادات کو پورا کرتی رہے ۔"

معلوم ہوتا ہے یہ اشارہ ان امور حکومت کی طرف ہے جو موحدین کے فرمانروا عبدالمومن کے بعد اس کے جانشین اور بیٹے ابو یعقوب یوسف کے عہد میں رونما ہو رہے تھے ایک اور جگہ ابن رشد نے اس صورت حال پر کہ کس طرح خلافت نے بعد میں بادشاہت کی شکل اختیار کر لی، تنقید کی ہے اسی ضمن میں وہ مرابطین اور موحدین کے عہد میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان کا موازنہ کرتا ہے مثال کے طور پر یوسف بن تاشفین کے عہد میں نظام حکومت شریعت پر مبنی تھا، یعنی وہ خلافت سے ملتا جلتا تھا پھر اس کے بعد اس کے بیٹے کے عہد میں وہ بادشاہت میں بدل گیا۔ اور اس کے پوتے کے عہد میں ہوا و ہوس بن کر رہ گیا ۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا، اس میں ہم نے دیکھا کہ ابن رشد نے خلافت اور افلاطون کی پیش کردہ ریاست میں موازنہ کیا ہے ۔ اس ضمن میں وہ یونانی فلسفی کے نقش قدم پر چلا ہے اور دوران بحث وہ بتاتا ہے کہ طریقہ ہائے حکومت کی تبدیلی کا افراد کی طبیعت پر کیا اثر پڑا مرابطین کے ہاں دیموقراطی نظام حکومت ۵۴۰ھ میں استبداد میں تبدیل ہوا ہے اور یہ تاریخ اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ ابن رشد نے اس کے پس منظر میں اس صورت حال پر بحث کی ہے ۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے "تمہارے لئے یہ ممکن ہے کہ ۵۴۰ھ کے بعد فرمانرواؤں اور ارکان سلطنت کے اخلاق اور ان کی عادات میں جو تغیر رونما ہوا، اسے دیکھو۔ جب وہ نظام جس کے زیر اثر ان کی نشو و نما ہوئی تھی وہ کمزور ہو گیا۔ تو طبعاً ان کے اخلاق بھی خراب ہو گئے، ان میں جو لوگ تعلیمات دینی پر کاربند تھے وہ تو اپنے اخلاق کو بحال رکھنے میں کامیاب رہے لیکن یہ ان میں بہت کم تھے"

کیا ابن رشد کی یہ رائے افلاطون کے ان اقوال سے نہیں ملتی، جو اس نے اپنی مثالی و آئیڈیل ریاست کے زوال کے بارے میں کہے ہیں۔

ابن رشد کے سیاسی فلسفے میں دین اسلام کی بحیثیت ایک پیغام وحی ہونے کے جو مرکزی اہمیت ہے، اس کی وضاحت کے لئے ہم نے اب تک جو مثالیں دی ہیں، وہ کافی ہیں۔ اسی طرح ان مثالوں سے اس کی بھی پوری وضاحت ہو گئی ہے کہ ابن رشد نے اپنی ہم عصر اسلامی سلطنتوں پر کس جرأت سے تنقید کی ہے جو اس کے نظریات کے تحت اسلامی اساس کی ضد تھیں۔ ابن رشد کے یہ نظریات افلاطون اور ارسطو سے مستفاد تھے چنانچہ اس نے جس طرح افلاطون کے افکار اور اس کے نظام ہائے حکومت کو مرابطین اور موحدین کی سلطنتوں پر منطبق کیا ہے، وہ ہمارے اس خیال کی پوری تائید کرتا ہے[1]

---

[1] میں نے اس مقالے میں ایک عبرانی زبان میں لکھے ہوئے مسودہ سے، جو جمہوریہ افلاطون کی ابن رشد کی تصنیف کردہ شرح ہے، استفادہ کیا ہے۔ یہ عبرانی مسودہ میں نے شائع کر دیا ہے اس کا اصل عربی متن معلوم ہوتا ہے، ضائع ہو گیا ہے۔ اس عبرانی مسودے کا مترجم اسپین کے شہر مرسیلیا کا ایک یہودی ہے اور اس نے یہ ترجمہ ۱۳۲۳ء میں مکمل کیا ہے۔ اسی یہودی نے ابن رشد نے افلاطون کی کتاب الاخلاق' کی جو شرح کی تھی، اس کا بھی عبرانی میں ترجمہ کیا ہے۔ (مصنف)

"ابن رشد نے یورپ کے اقلیم ذہن پر چار سو سال سے زائد عرصے تک حکمرانی کی۔ اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بھی اسی کے ہاتھوں سے رکھی گئی"

ارتقائے معاشرہ کا نظریہ

عبدالوحید صدیقی

معاشرہ اور اس کے ارتقا کی علمی تحقیق کے بانی کے متعلق موجودہ دور کے مغربی ماہرین کا اختلاف ہے اس سلسلے میں ان کے تین مکاتیب فکر قابل ذکر ہیں[1]

۱- پہلا مکتب فکر عمرانیات کے ان ماہرین کا ہے، جن کا خیال ہے کہ اگرچہ معاشرہ سے متعلق فلسفیانہ طرز کی بحثیں قدیم یونان میں شروع ہوگئی تھیں لیکن اس موضوع پر علمی استقرائی اور تجرباتی انداز سے سب سے پہلے فرانسیسی مفکر آگسٹ کامٹ (۱۷۹۸- ۱۸۵۷ء) نے بحث کی لہذا یہی مفکر بابائے عمرانیات کہلانے کا مستحق ہے۔

ارتقائے معاشرہ کے متعلق اگرچہ افلاطون (۴۲۷- ۳۴۷ ق م) ارسطو (۳۸۴- ۳۲۲ ق م) پالیبئس (۲۰۳- ۱۲۱ ق م) اور لیوکریشس (۹۹- ۵۵ ق م) نے سب سے پہلے بحثیں کی تھیں لیکن یہ فلسفیانہ مفروضات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں اس سلسلے میں صحیح معنوں میں علمی و سائنسی نظریہ کی ابتدا ڈارون کے نظریۂ حیاتیاتی ارتقا ۱۸۵۹ء کے بعد ہی ممکن ہوسکی۔ چنانچہ لوئیس هینری مارگن (۱۸۱۸- ۱۸۸۱ء) اور ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰- ۱۹۰۳ء) ہی دراصل معاشرتی ارتقا کے نظریہ کے سب سے پہلے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۲۰ مضمون سوشیولوجی ۱۹۵۹ء

سائنٹفک شارح ہیں۔[1]

اس مکتبِ خیال میں براتھ اور رسمال جیسے ماہرین شریک ہیں۔[2]

۲۔ دوسرے مکتبِ فکر کے حامیوں میں ہاؤس، بارنس، لچن برگر جیسے ماہرین ہیں۔[3] ان کے خیال کے مطابق عمرانیات کی ابتدا کا سہرا قدیم یونانیوں کے سر ہے۔

۳۔ تیسرا مکتبِ فکر اس علم کی ابتدا کو یونانیوں سے بھی قبل کی قدیم تہذیبوں کے علماء کا مرہونِ منت سمجھتا ہے۔ سوروکن، برزر، اور بوگرڈس جیسے ماہرین اس مکتبِ فکر کے حامی ہیں۔[4]

ان تینوں مکاتیب فکر کا اگر زیادہ غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تینوں دراصل ایک ہی امر کے مدعی ہیں۔ صرف الفاظ اور تعبیر کے اختلاف نے انہیں تین گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ فی الحقیقت ان تینوں مکاتیب کے ماہرین میں سے کوئی بھی اس امر کا منکر نہیں ہے کہ آگسٹ کامٹ کے بعد عمرانیات نے جو صورت اختیار کی، وہی صحیح معنوں میں سائنس کی اس تعریف کے ماتحت آسکتی ہے جس کے مطابق اس مربوط و منظم علم کا نام سائنس ہے جو تجزیہ درجہ بندی، تجربیت، استقراء اور ترکیب کے فنی طریقوں سے گذر کر حاصل ہوتا ہے اور جس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اس کا تجزیہ کر سکیں۔ نیز یہ کہ اس کے ذریعہ آئندہ کے متعلق ایک حد تک صحیح پیشنگوئی کی جا سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف بحیثیت ایک علیحدہ علمی شاخ کے عمرانیات بلکہ اس کے ماتحت آنے والے تمام مباحث بھی انیسویں صدی سے قبل کبھی سائنسی مقام حاصل نہ کر سکے تھے۔ مذکورہ بالا تین

۱؎ بارنس، این انٹروڈکشن آف دی ہسٹری آف سوشیولوجی شکاگو ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۱۱۱ - ۱۳۸

۲؎۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ ۱۹۵۹ء۔ مضمون۔ سوشیولوجی

۳؎ اور ۴؎ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ سوشیولوجی

مکاتیبِ فکر میں سے دوسرا اور تیسرا مکتب جب عمرانیات کی ابتدا کا سہرا ہزاروں سال پہلے کے علماء کے سر باندھنا چاہتا ہے تو اس سے ان کی مراد محض معاشرہ کے متعلق سوچ بچار اور بحث و مباحثہ ہوتی ہے، نہ کہ سائنسی طریقے سے چھان بین۔ چنانچہ جب یونانی مفکر لیوکریشس کو نظریۂ ارتقائے معاشرہ کا پہلا واضح مصنف قرار دیا جاتا ہے، تو بھی اس سے مراد اس موضوع پر اس کا صرف فلسفیانہ واستخراجی انداز گفتگو ہوتا ہے نہ کہ سائنسی مثبت طریقے سے اس نظریئے کو ثابت کرنا۔ پھر یہ کہ لیوکریشس نے کبھی بھی معاشرہ کے ارتقا کو کسی الگ اہمیت کا حامل نہ سمجھا بلکہ اس نے اسے اپنے مابعد الطبیعی نظریات کے ثبوت کے لئے پیش کیا اور پیش کرنے کا طریقہ بھی مناظرے کا اختیار کیا، جس کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا تعلق حقائق سے کم اور فریق ثانی کو ساکت کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ لاطینی زبان میں لکھی ہوئی اپنی کتاب "حقائق الاشیاء" (ڈی ریرم ناٹورا) کے پانچویں باب میں لیوکریشس نے قِدَم عالم کے قائلین کو ساکت کرنے اور حدوثِ عالم کو ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے میں ارتقائے معاشرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے، اس نے تغیر کی وہ دلیل فراہم کی ہے جسے اس موضوع پر یونانیوں نے بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا تھا۔ لیوکریشس لکھتا ہے۔

"زمین اور آسمان کی پیدائش کی اگر کوئی گھڑی نہیں ہے اور اگر یہ ابدالآباد سے موجود ہیں تو تھیبس کی جنگ اور ٹرائے کی بربادی سے قبل شعراء نے دوسرے موضوعات پر کیوں طبع آزمائی نہیں کی ہے؟ دوسرے لوگوں کے اتنے کارنامے کہاں چلے گئے ہیں؟ ناموری کی ابدی کتاب میں کیوں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے؟ میرے خیال میں حقیقت یہ ہے کہ سورج کسی قریبی تاریخ میں پیدا ہوا ہے۔ زمین کی پیدائش بھی کوئی زیادہ دور واقع نہیں ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ اس وقت بھی کچھ ایسے فنون ہیں جن پر ترقی کا آخری رنگ چڑھایا جارہا ہے۔ کچھ فنون ترقی کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی جہاز بنانے کی صنعت میں کچھ اصلاحیں کی گئی ہیں۔ ابھی کل ہی موسیقاروں نے مدھر آوازوں کو جنم دیا ہے پھر یہ بھی کہ اشیاء کے اس نظام کا بہت دیر سے انکشاف ہوا ہے۔ اور میں سب سے پہلا شخص۔ اس لائق پایا گیا ہوں کہ اس نظام کو ملکی زبان میں منتقل کرسکوں۔"

ظاہر ہے کہ لیوکریشنس کے اس طریقے کو مناظرانہ و فلسفیانہ حیثیت سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے اور عمرانیات کی ابتدا کے متعلق مذکورہ بالا تینوں مکاتیب فکر اس کو سائنسی اہمیت نہیں دیتے۔ ان سب کے خیال کے مطابق دراصل معاشرہ کے ارتقاء سے متعلق سب سے پہلے جس شخص نے سائنسی انداز سے جستجو کر کے نتائج اخذ کئے ہیں وہ مارگن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے ارتقائے معاشرہ کی سائنسی بحث کا بانی قرار دیا گیا ہے[1]

اس سلسلے میں مشیگن یونیورسٹی کے ماہر عمرانیات لیزلی اے وہائٹ یوں رقم طراز ہیں۔ "انیسویں صدی میں معاشرتی ارتقاء کے نظریئے کو فکر عمرانی کے طور پر متعارف کرانے کا واحد ذمے دار ہربرٹ سپنسر ہے۔ لیکن معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے اس نظریئے کا عملی استعمال سب سے پہلے امریکی ماہر عمرانیات لیوس هنیری مارگن نے کیا۔ علوم عمرانی میں مارگن واقعی ایک بانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنا کام ایک ایسے دور میں شروع کیا جب کہ مسیحیت کا عقیدۂ تخلیق بغیر کسی چون و چرا کے تسلیم کیا جاتا تھا۔ کتاب پیدائش میں جو تخلیق کائنات کا تذکرہ ہے، اُسے مارگن نے جوانی میں بالکل اسی طرح تسلیم کیا تھا جیسے ڈارون نے اس سے قبل کیا تھا لیکن بعد میں اپنی کتاب "قدیم سماج" تحریر کرتے وقت وہ بائیبل کے تخلیق آدم کے بیان کی مخالفت کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرہ کے ارتقاء کا تصور مارگن سے پیدا نہیں ہوا۔ اس سے قبل کئی مصنفین اس تصور کو مختلف طریقوں سے زیر بحث لائے تھے لیکن مارگن ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس بارے میں ایک صحت مند اور طبعی نظریہ دیا، جو کہ جدید سائنس کے تقاضے کے مطابق ہے۔

مارگن کے نظریہ کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا جا سکتا ہے۔ "جب انسان کی مادی ضروریات

---

[1] این انٹروڈکشن آف دی ہسٹری آف سوشیولوجی شکاگو ۱۹۴۸ء - ص۱۳۸ - بارنس

کی تسکین کے لئے اس کے فنی طریقوں میں کثرت اور اصلاح ہوتی ہے تو اس کے معاشرہ و تمدن کا ہر پہلو رو بہ ترقی ہوتا ہے۔"[۱]

وہائٹ، بارنس اور دوسرے ماہرین عمرانیات اس حد تک تو بالکل صحیح ہیں کہ اس نظریہ پر سب سے پہلا سائنسی مغربی محقق مارگن ہے لیکن اسے پوری دنیا تک ممتد کرنا غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر شاہ ولی اللہؒ کے مباحثِ ارتفاقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں سائنسی انداز سے بحث کا موجود ہونا واضح طور پر سامنے آجائے گا۔ جن وجوہات کی بنا پر انیسویں صدی کے یورپی ماہرین کو معاشرتی ارتقاء کی سائنسی تعبیر کا بانی قرار دیا گیا ہے ان ہی کی بنیاد پر اٹھارویں صدی کے ہندی مفکر شاہ ولی اللہ کو اس کا بانی قرار دینا کوئی تعجب خیز امر نہ ہونا چاہیئے۔

---

[۱] وہائٹ، ایل ڈبلیو مارگن - پایونیر ان دی تھیوری آف سوشل ایولیوشن بارنس ۔ ص ۱۳۸-۱۴۰

"فیلسوفِ تاریخ کی حیثیت سے ابن خلدون ہی نے اپنے "مقدمہ" میں سب سے پہلی دفعہ تاریخی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نظریے میں اخلاقی اور روحانی کارفرما قوتوں کے ساتھ ساتھ آب و ہوا اور جغرافیہ جیسے طبعی حقائق کا بھی پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے ابن خلدون نے طبیعی ترقی و زوال کے قوانین کی دریافت و ترتیب کے باب میں بڑی کاوشوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر تاریخ کی ماہیت اور وسعت کی دریافت کا سہرا اس کے سر باندھا جائے، تو بے جا نہ ہوگا۔
صرف یہی نہیں بلکہ وہ بلاشبہ عمرانی علوم کا بانی مبانی تھا۔ نیز اس کو سیاسی معاشیات کا موسس کہنا بھی بالکل حق بجانب ہوگا۔"

ظاہر ہے کہ لیوکریشس کے اس طریقے کو مناظرانہ و فلسفیانہ حیثیت سے
اور عمرانیات کی ابتدا کے متعلق مذکورہ بالا تینوں مکاتیبِ فکر اس کو سائنسی اہمیت
سب کے خیال کے مطابق دراصل معاشرہ کے ارتقار سے متعلق سب سے پہلے جس شخص نے سا
انداز سے جستجو کرکے نتائج اخذ کئے ہیں وہ مارگن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے ارتقائے معاشر
کی سائنسی بحث کا بانی قرار دیا گیا ہے[۱]

اس سلسلے میں مشیگن یونیورسٹی کے ماہر عمرانیات لیزلی اے وہائٹ یوں رقم طراز ہیں
"انیسویں صدی میں معاشرتی ارتقاء کے نظریئے کو فکرِ عمرانی کے طور پر متعارف کرانے
واحد ذمے دار ہربرٹ سپنسر ہے۔ لیکن معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے اس نظریئے کا عملی
استعمال سب سے پہلے امریکی ماہر عمرانیات لیویس ھنیری مارگن نے کیا۔ علوم عمرانی میں مارگن
واقعی ایک بانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنا کام ایک ایسے دور میں شروع کیا جب کہ
میسحیت کا عقیدۂ تخلیق بغیر کسی چون وچرا کے تسلیم کیا جاتا تھا۔ کتاب پیدائش میں جو تخلیق کائنا
کا تذکرہ ہے، اُسے مارگن نے جوانی میں بالکل اسی طرح تسلیم کیا تھا جیسے ڈارون نے اس۔
قبل کیا تھا لیکن بعد میں اپنی کتاب "قدیم سماج" تحریر کرتے وقت وہ بائیبل کے تخلیق آدم کے بی
مخالفت کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرہ کے ارتقار کا تصور مارگن سے پہ
ہوا۔ اس سے قبل کئی مصنفین اس تصور کو مختلف طریقوں سے زیر بحث لائے تھے لیکن
وہ پہلا شخص ہے جس نے اس بارے میں ایک صحت مند اور طبعی نظریہ دیا، جو کہ جدید سائنس
کے مطابق ہے۔

مارگن کے نظریہ کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا جاسکتا ہے۔ "جب انسان ک

---

[۱] این انٹروڈکشن آف دی ہسٹری آف سوشیولوجی شکاگو ۱۹۴۸ء - ص۸۵

مئی ۶۴ء

۔ المتوفی دریائے سندھ کے کنارے بسر کرتے تھے اور غسل کر کے اور
۔ ہو جاتے تھے۔ پھر جب چادر خشک ہو جاتی تھی تو پھر سے غسل کر کے اور چادر
۔ تمام عمر اس طرح دشت پیمائی اور چلہ کشی کرتے رہے ایک مرتبہ ملتان
۔ بہاء الدین ذکریا ملتانی کے سجادہ نشین سے بیعت ہوئے تحفۃ الکرام میں آپ
۔ حکایت بیان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ میں خدائی نور کے دیدار میں محو تھا کہ غیب سے آواز آئی
۔ غلام بننا چاہتے ہو؟" میں نے کہا نہیں" پھر آواز آئی" نوکر بنو گے" میں نے پھر بھی انکار
۔ طرح تین مرتبہ آواز آئی اور میں انکار کرتا رہا۔ آخر میں آواز آئی کہ اگر غلام اور نوکر بننا نہیں چاہتے
۔ بتاؤ کہ کیا بننا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا خداوندا! میں کچھ بھی نہیں ہوں اور کچھ بھی
۔ پھر غیب سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر اگیا اور ارشاد ہوا۔ خداوند تعالےٰ نے تیری معرفت

۔ مخدوم بلڑی والے کے ملفوظات بیان العارفین میں آیا ہے کہ سردی کی راتوں میں متواتر
۔ پڑھنے اور موسم گرما میں لق و دق صحرا میں نوافل پڑھنے سے آپ کے بدن کی کھال
۔ آپ کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ہوئیں۔ لیکن تحفۃ الکرام سے یہ معلوم ہوتا
۔ مخدوم محمد اور مخدوم احمد کے ہم عصر تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نویں صدی کے آخر
۔ صدی کے شروع میں گذرے ہیں۔

۔ عرف نور بنگ، سومرہ خاندان سے تھے اور سرزمین جون کے تعلقہ ٹھٹی کے گاؤں

۔ ہاکڑو" نامی ایک علیحدہ دریا تھا، جو ہمالیہ سے نکل کر سمندر سے جا کر ملتا تھا اور
۔ شالی راجپوتانہ اور تھر کو آباد کرتا تھا۔ اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ گو کہ یہ قدیم
۔ ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اس کی بہت سی نہروں کو دریائے سندھ سے پانی ملتا رہتا۔
۔ پیران" "رین" اور "سانگڑھ" کے نام قابل ذکر ہیں۔ (باقی حاشیہ ص ۶۴ پر)

سندھ کے سہروردی مشائخ

میمن عبدالمجید سندھی۔ لیکچرار اسلامیہ کالج سکھر

عبدالحمید سہروردی ۔ روہڑی کے جنوب میں، دریائے سندھ کے کنارے پر "تنین جوتھان" کے نام سے ایک پُرفضا مقام ہے۔ اس کے متعلق مختلف روایات مشہور ہیں۔ بکھر کے گورنر میر ابوالقاسم نمکین (وفات ۱۰۱۸ھ) نے اس شہر کو موجودہ شکل دی تھی اور "صفۂ صفا" نام رکھا۔ موسم گرما کی راتوں میں اس پُرفضا مقام پر بیٹھ کر مجالس شعر و سخن منعقد کرتے تھے۔
آخر میں میر نمکین کو ان کی وصیت کے مطابق دفن بھی یہیں کیا گیا۔ آج وہاں جو قبریں موجود ہیں، وہ میر نمکین اور ان کی اولاد کی ہیں۔

سید محب اللہ شاہ نے اپنی کتاب تاریخ البلاد والقصبات میں لکھا ہے کہ جب ۴۱۹ھ میں سلطان محمود غزنوی کا تسلط سندھ پر ہوا تو سات یا نو عارفوں نے اسی جگہ پر چلہ کشی کی۔ فاضل مورخ نے ان میں سے کچھ عارفوں کے نام بھی دیئے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ عبدالحمید سہروردی۔ ۲۔ عبداللہ جریری۔ ۳۔ حمزہ بن رفیع۔ ۴۔ علی بن احمد ۵۔ حمزہ بن رفیع ۶۔ صفی الدین شیرازی۔ ۷۔ ابوالحسن خرقانی۔ ان بزرگوں کے جانے کے بعد لوگ اس جگہ کو متبرک

لہ اس سلسلے کا پہلا مضمون مارچ ۱۹۶۷ء میں ملاحظہ ہو۔

ٹہ بحوالہ محترم عطا محمد حامی" کا مضمون شائع شدہ روزنامہ "مہران" مورخہ ۱۲ر اپریل ۱۹۵۸ء

سمجھ کر وہاں آکر نفل پڑھتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں عبدالحمید کے نام سے ایک سہروردی بزرگ سندھ میں آئے تھے ؛ لیکن آپ کے متعلق زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔

شیخ خضر سیوستانی :۔ شیخ خضر کے نام سے دو بزرگ سیوھن میں گذرے ہیں ایک شیخ خضر مشہور قادری بزرگ تھے، جو میاں میر لاہوری سیوستانی کے مرشد تھے آپ نے ۹۹۲ھ میں وفات پائی دوسرے شیخ خضر، شیخ موسیٰ کے اولاد میں سے تھے۔ شیخ موسیٰ، ابوالفضل اور فیضی کے جد اعلیٰ تھے اور نویں صدی ہجری میں سیوھن میں آکر آباد ہوئے ان کی اولاد میں سے شیخ خضر دسویں صدی ہجری میں گذرے ہیں سیر و سفر کے دوران وہ ناگور میں پہنچے اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے جانشین شیخ بخاری اوچی کے مرید ہوئے۔ اس کے بعد وہاں ناگور میں ہی شیخ عبدالرزاق قادری اور شیخ یوسف سندھی سے بھی بیعت کی سیر و سفر کے بعد وہ واپس سیوھن میں آئے اور ۹۱۱ھ میں آپ کے فرزند شیخ مبارک تولد ہوئے[۱] ابوالفضل اور فیضی شیخ مبارک کے فرزند ہیں۔ شیخ خضر کی وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔ شیخ بخاری اوچی کے مرید ہونے کی وجہ سے ہم اسے سہروردی بزرگوں میں شمار کرتے ہیں۔

شیخ فاضل قریشی ۔ شیخ فاضل قریشی، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کی اولاد میں سے تھے۔ آپ گیارہویں صدی ہجری کے شروع میں سندھ میں آئے اور "بکیرا" نامی ایک گاؤں میں متوطن ہوگئے، جو نصرپور سے تین کوس پر ہے۔ آپ کامل بزرگ ہونے کے علاوہ دنیاوی کاروبار میں بھی ذی اثر تھے۔ نھر "پران" کے کنارے "پرآمری" نامی ایک گاؤں تھا، جہاں حضرت غوث بہاؤالدین زکریا ملتانی کی یادگار ایک درخت تھا اور قدیم الایام سے وہاں اس سلسلے کے فقیروں کا میلہ لگتا تھا۔ بعد میں اس جگہ پر حضرت مخدوم نوح کے مریدوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔

---

[۱] تحفۃ الکرام ج ۳۔ ص ۱۴۳

شیخ فاضل نے کوشش کرکے اس کا قبضہ حاصل کیا اور میلہ لگوانا شروع کیا۔[1]

شیخ شہراللہ۔ یہ بزرگ بھی حضرت بہاؤالدین ملتانی کے اولاد میں سے تھے آپ شیخ فاضل کے زمانے میں ہی سندھ میں آئے۔ شیخ فاضل نے آپ کو داماد بنایا اور اپنا جانشین بھی منتخب کیا، کیونکہ شیخ فاضل کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ شیخ شہراللہ کے دو فرزند ہوئے۔ ۱۔شاہ سراج الدین۔ ۲۔ شاہ قائم الدین۔ قائم الدین شاہ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی[2]

شاہ سراج الدین شیخ شہراللہ کے بعد آپ کے فرزند شاہ سراج الدین سجادہ نشین ہوئے۔ آپ نے پیری مریدی کا سلسلہ وسیع کیا اور شاہی دربار میں اثر و رسوخ حاصل کیا اس زمانے میں شاہ عنایت صوفی جھوک میراں پور والے کی شہادت واقع ہوئی۔ یہ فرخ سیر کا زمانہ تھا اور سندھ پر کلہوڑا حکمران تھے۔ کلہوڑوں کے ساتھ کچھ زمینداروں اور سجادہ نشینوں نے بھی شاہ شہید کی مخالفت میں کام کیا۔ شاہ سراج الدین ان دنوں دہلی تھے اور وہ شاہی دربار میں اس مسئلے کو لانے کے اولین محرک بنے۔ آخر بادشاہ کے حکم سے مغلیہ نواب نے ۱۱۳۰ھ میں شاہ شہید کو شہید کروایا۔ شاہ سراج الدین کو دو فرزند ہوئے۔ ۱۔ فاضل شاہ۔ ۲۔ مہر شاہ۔ پہلے فاضل شاہ مسند نشین ہوئے اور بعد میں آپ کے بھائی مہر شاہ سجادہ پر بیٹھے۔ اب بکیرا ٹنڈو الہیار میں واقع ہے اور ہر سال فاضل شاہ کے مزار پر عرس ہوتا ہے۔ شیخ شہراللہ کی اولاد اب "غوث پوٹہ" کے لقب سے مشہور ہے اور پیری مریدی کا سلسلہ جاری ہے۔

شیخ بھرکیہ کا تیار۔ کا تیار سندھ کے ساداتی پرگنہ کا قدیم گاؤں ہے۔ وہاں شیخ بھرکیہ ابن شاہو سندھ کے مشہور مجذوب گذرے ہیں۔ آپ مخدوم اسحاق بھٹی ہالائی کے فرزندان مخدوم احمد اور مخدوم محمد کے ہم عصر تھے۔ یہ زمانہ جام نظام الدین سمہ کی حکومت کا تھا۔ حضرت شیخ صاحب نے ابتدا میں سخت ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔ سردی اور گرمی میں صرف

---

[1] تحفۃ الکرام ص۱۵۹ [2] ایضاً

ایک چادر بدن پر اوڑھے رہتے تھے۔ اکثر دریائے سندھ کے کنارے بسر کرتے تھے اور غسل کرکے اور چادر تر کرکے نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ پھر جب چادر خشک ہو جاتی تھی تو پھر سے غسل کرکے اور چادر تر کرکے نماز پڑھنے لگتے تھے۔ تمام عمر اس طرح دشت پیمائی اور چلہ کشی کرتے رہے ایک مرتبہ ملتان گئے اور حضرت غوث بہاؤ الحق زکریا ملتانی کے سجادہ نشین سے بیعت ہوئے تحفتہ الکرام میں آپ کی زبانی ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ میں خدائی نور کے دیدار میں محو تھا کہ غیب سے آواز آئی "اے بھرکیہ! غلام بننا چاہتے ہو؟" میں نے کہا "نہیں" پھر آواز آئی "نوکر بنو گے" میں نے پھر بھی انکار کیا۔ اس طرح تین مرتبہ آواز آئی اور میں انکار کرتا رہا۔ آخر میں آواز آئی کہ اگر غلام اور نوکر بننا نہیں چاہتے ہو تو پھر تم ہی بتلاؤ کہ کیا بننا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا "خداوندا! میں کچھ بھی نہیں ہوں اور کچھ بھی بننا نہیں چاہتا۔ پھر غیب سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا گیا اور ارشاد ہوا۔ خداوند تعالےٰ نے تیری معرفت قبول فرمائی۔

شاہ عبدالکریم بلڑی والے کے ملفوظات بیان العارفین میں آیا ہے کہ سردی کی راتوں میں متواتر غسل کرکے نمازیں پڑھنے اور موسم گرما میں لق ودق صحرا میں نوافل پڑھنے سے آپ کے بدن کی کھال اتر گئی تھی۔ آپ کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ہوئیں۔ لیکن تحفتہ الکرام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مخدوم محمد اور مخدوم احمد کے ہم عصر تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے شروع میں گذرے ہیں۔

مخدوم نور اللہ ۔ عرف نور ننگ، سومرہ خاندان سے تھے اور سرزمین جون[۱] کے تعلقہ کھٹی کے گاؤں

۱؎ قدیم زمانے میں "ھاکڑو" نامی ایک علیحدہ دریا تھا، جو ہمالیہ سے نکل کر سمندر سے جاکر ملتا تھا اور مشرقی پنجاب، شمالی راجپوتانہ اور تھر کو آباد کرتا تھا۔ اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ گو کہ یہ قدیم زمانے میں خشک ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی بہت سی نہروں کو دریائے سندھ سے پانی ملتا رہتا۔ ان نہروں میں سے "پیران" "رین" اور "سانگرھ" کے نام قابل ذکر ہیں۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۶۴ پر)

درپاٹ کے رہنے والے تھے۔ ملتان کے سہروردیہ خانقاہ کی طرف سے لاڑ (سندھ کا نشیبی حصہ) کے لئے خلیفہ تھے۔ آپ کا زمانہ دسویں صدی ہجری ہے۔ آپ کا مقبرہ ٹنڈو غلام حیدر میں ہے اور آپ کی اولاد اب "نورنگ پوٹہ" کہلاتی ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند مخدوم عبدالمجید سجادہ نشین ہوئے جو اپنے وقت کے متبحر عالم اور عارف کامل تھے۔ اس کے بعد ان کے فرزند مخدوم اسحاق سجادہ نشین ہوئے، جو وقت کے مشہور عالم ہو گذرے ہیں۔ مخدوم رحمت اللہ ٹھٹوی آپ کے پوتا تھے جن کا احوال بعد میں آئے گا۔ اس خاندان میں شعروشاعری کا شوق بھی رہا ہے۔

(بقیہ حاشیہ) ان نہروں میں کلہوڑوں کے زمانے تک کسی قدر پانی موجود تھا۔ "نہر ریّن" کے کنارے پر "جون" اور "فتح گڑھ" نامی عالیشان شہر موجود تھے، جو باغات اور سرسبزی کے لئے مشہور تھے۔ "جون" باغات کے علاوہ تجارت اور ثقافت کا بھی مرکز تھا۔ بڑے بڑے تجار دور دور سے یہاں آتے تھے معزول شہنشاہ ہمایوں نے سندھ سے گذرتے ہوئے جون کے باغ "باغ آئینہ" میں قیام کیا تھا اور اس جگہ کو بہت پسند کیا تھا۔ ہمایوں کی ہمشیرہ گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" میں یہاں کے باغات کی بہت تعریف کی ہے۔ ۱۸ صدی عیسوی میں مدو خاں پٹھان کی شورش کے دوران یہ شہر ویران ہوئے۔ "جون" شہر کے علاوہ پرگنہ بھی تھا۔

"بھکر ایک خوبصورت شہر ہے۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ اس کے درمیان سے گزرتی ہے۔ شاخ کے وسط میں ایک خوبصورت زاویہ ہے، جہاں ہر آنے والے کو کھانا ملتا ہے اسے کشلو خاں نے تعمیر کیا تھا۔ یہاں میری ملاقات امام عبداللہ حنفی اور شمس الدین محمد شیرازی سے ہوئی، جن کی عمر ان کے بیان کے مطابق ایک سو بیس برس تھی۔

(سفرنامہ ابن بطوطہ)

سلطنت مغلیہ کا زوال اور شاہ ولی اللہ

پروفیسر ہنری لینڈ ایبوٹ

آخری عظیم مغل فرمانروا اورنگ زیب کی سلطنت بہت حد تک گزشتہ شوکت و عظمت کی آئینہ دار تھی، لیکن اس کے جانشینوں کی حکومت تو محض اس سلطنت کا ایک سایہ تھا، اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ کو راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کی مسلسل بغاوتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا جانشین جہاندار شاہ عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اور ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اسے مار ڈالا گیا۔ اسی زمانے میں دربار شاہی تورانیوں اور ایرانیوں کی باہمی چپقلش کا رزم گاہ بن گیا۔ اور دکن، بنگال اور اودھ کے صوبے دار نیم خود مختار ہو گئے، مرہٹوں کو موقع ملا، اور انہوں نے شمالی ہند کا رخ کیا۔ اس اثنا میں ایران سے نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اور بے شمار دولت اور زر و جواہر لوٹ کر لے گیا۔ اس کے بیس سال بعد مرہٹے دہلی پر قابض ہو گئے، لیکن چار سال نہیں گزرے تھے کہ پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست فاش دی اور شمالی ہند میں ہمیشہ کے لئے مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا لیکن اس کامیابی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، اور احمد شاہ ابدالی واپس افغانستان چلا گیا۔

لہ اصل مضمون انگریزی میں امریکہ کے مشہور رسالے "دی مسلم ورلڈ" میں چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے امریکہ کی ٹفٹس یونیورسٹی، میڈفورڈ، میساچوسٹس، میں پروفیسر ہیں۔ اور پاکستان میں کچھ عرصہ رہ چکے ہیں یہاں اس مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

بابر نے ۱۵۲۶ء میں اور اکبر نے ۱۵۵۶ء میں اسی پانی پت میں فتح حاصل کرکے اپنی اپنی سلطنتوں کی بنیاد رکھی تھی۔ اگرچہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی اس تیسری جنگ میں مسلمانوں فوجوں کو فتح ہوئی تھی۔ لیکن یہی وہ وقت تھا، جب کہ ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے مغل سلطنت ختم ہوگئی۔ یہ سلطنت گو برائے نام بعد بھی قائم رہی، لیکن مسلمان اور ہندو دونوں نڈھال ہوچکے تھے چنانچہ اس سے ایک تیسری طاقت انگلستان نے فائدہ اٹھایا اور وہ اٹھارھویں صدی کے وسط سے دونوں پر غالب آنے لگی قدرتاً مغل سلطنت کے اس دردناک انجام نے ان راسخ العقیدہ مسلمانوں کو جو قسمت پر قانع ہونے کو تیار نہ تھے، سوچنے پر مجبور کردیا۔ اس ضمن میں زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ یہ زوال اورنگ زیب کے فوراً بعد، بلکہ اس کے آخری زمانے ہی میں، یک بارگی شروع ہوگیا تھا۔ اور یہ اورنگ زیب وہی تھا، جسے راسخ العقیدہ مسلمان مغل فرمانرواؤں میں سب سے اچھا مسلمان سمجھتے تھے۔ سلطنت کے اس زوال سے ایک بار پھر وہ سوالات ابھرے، جو کم سے کم چودھویں صدی عیسوی سے ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اس برصغیر میں دوسرا بڑا عالم دین پیدا کیا، جس کی راسخ العقیدگی ہر شک و شبہ سے بالا تھی لیکن اس کے ساتھ ہی، ان حالات کے مطالعہ کی وجہ سے جن میں اسے زندگی گزارنی پڑی، اس نے ان چیزوں پر زیادہ زور نہیں دیا، جن پر اس کے پیش رو علمائے دین دیتے تھے۔

احمد بن عبدالرحیم المعروف شاہ ولی اللہ اورنگ زیب کی موت سے چار سال پہلے پیدا ہوئے اور پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد کے سال میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی زندگی اس دور میں گزری جب سلطنت اور اس کے ساتھ مسلم معاشرہ بڑی سرعت سے زوال پذیر تھا۔ شاہ ولی اللہ کی یہ کوشش تھی کہ انہیں کوئی ایسا راستہ مل جائے جس پر چل کر مسلم معاشرہ از سر نو مضبوط ہو جائے، اور جیسا کہ ایک عالم دین سمجھتا ہے وہ اسلام کے اصولوں سے پھر ایک بار ہم آہنگ ہو۔

شاہ ولی اللہ کے والد صوفی بھی تھے اور عالم دین بھی۔ ایک وقت میں وہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سے منسلک ہوئے، لیکن جلد ہی اس سے الگ ہوگئے۔ اور انہوں نے اپنا مدرسہ قائم

کیا۔ جہاں وہ ایسی تعلیم دیتے تھے جس سے صوفیاء اور راسخ العقیدہ علماء ایک دوسرے سے قریب ہو سکیں۔ ان کے بعد ان کے نامور فرزند بھی اسی راہ پر چلے۔

شاہ ولی اللہ سترہ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ ان کی جگہ درس دینے لگے ۱۷۳۰ء میں وہ حج کو گئے اور ۱۷۳۳ء میں لوٹے، اور اس کے بعد تیس سال تک ان کی باقی زندگی تمام تر اسلامی علوم کے مطالعے، زوال آمادہ سلطنت کے دفاع اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف رہی

شاہ ولی اللہ کی شخصیت قرون وسطیٰ اور دور جدید کی درمیان کی کڑی ہے، جیسے کہ یورپ میں دانتے تھا۔ آج کے پاکستان میں تمام گروہ، خواہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے سختی سے پابند ہوں یا نہ ہوں، شاہ ولی اللہ سے ذہنی انتساب کے مدعی ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ شاہ ولی اللہ مذہبی عقائد میں جدت پسند (ماڈرنسٹ) نہیں ہیں۔ البتہ انھوں نے اپنے دور کے پریشان کن حالات کا جس طرح تجزیہ کیا اور اس سے وہ جن نتیجے پر پہنچے، بعد میں آنے والے جدت پسندوں نے اسے اپنے ڈھب پر ڈھال لیا۔ جہاں تک شاہ ولی اللہ کا تعلق ہے مذہب میں ان کا نقطہ نظر حقیقی طور پر راسخ العقیدگی کا حامل ہے۔ اور وہ ہندوستان کے پہلے عظیم عالم دین یعنی شیخ احمد سرہندی کے نقطہ نظر سے جنہوں نے کہ اکبر کی اس عجیب وغریب کوشش کی کہ وہ سیاسی مقاصد کے لئے مختلف مذاہب کا ملا جلا ایک عقیدہ ترتیب دے، سخت مخالفت کی تھی زیادہ مختلف نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اور شیخ احمد سرہندی دونوں صوفیاء کے نقشبندی طریقے سے منسلک ہیں، لیکن دونوں میں فرق اتنا ہے کہ آخر الذکر اس دور میں تھے، جب اسلامی سلطنت اپنے عروج کی طرف گامزن تھی۔ اور شاہ ولی اللہ کا وہ دور ہے، جب یہ سلطنت اپنی انتہائی پستی کی قریب تھی، بہر حال ہر دو کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ اور دونوں اسی سے عہدہ برآ ہونے میں کوشاں رہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کو کیسے تقویت دی جا سکتی ہے۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کا ذہن زیادہ دوررس تھا اور انہوں نے اسلام کے فعال اور حرکت آفریں کردار کو زیادہ عمیق تجزیے کے ذریعہ، یا اسے یوں کہہ لیجئے، کم عربیت کے زیر اثر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی صحیح ترین تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ وہ ایک انقلابی عالم دین تھے۔ وہ جس دور میں تھے، وہ دور ایک انقلاب کے لئے بے تاب تھا۔ انہوں نے بڑی مستقل مزاجی سے اور مسلسل خطوط اور رسائل کے ذریعہ اس امر کی نشان دہی کی کہ ان کے معاشرے میں کیا خرابیاں ہیں اور بتایا کہ ان کی کیسے اصلاح ہو سکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی طاقت کو اس سرزمین میں بحال کرنا ہے، تو اس کے لئے ایک زبردست اقدام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ ساری عمر اس مقصد کی تکمیل کے لئے سرگرم کار رہے۔ ہو سکتا ہے کہ پانی پت کے معرکے کے وقوع پذیر ہونے میں ان کے قلم کا بھی دخل ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ایک خط لکھا تھا۔ یہ اقدام دراصل ایک کوشش تھی مسلمانوں کو قبل اس کے کہ ان میں نئی زندگی پیدا ہو، تباہی سے بچانے کی۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم شاہ ولی اللہ کے وہ افکار و خیالات ہیں، جو انہوں نے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کے سلسلے میں پیش کئے۔

ایک مخلص اور متقی عالم دین کی نظر میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے کا ایک ہی حل تھا، اور وہ یہ کہ خلافت راشدہ جیسے نظام کو بروئے کار لایا جائے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے ہاں خلافت راشدہ کے بعد بادشاہت آگئی۔ اور بادشاہ خواہ اہل ہوتا یا نا اہل، مسلمان اس کے سامنے سرنگوں ہونے لگے۔ اس سلسلے میں وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ زمانہ جب مسلمان سرتاپا ایمان تھے اور ان میں اتحاد عمل تھا، اُس زمانے کے سماجی اور سیاسی نظام میں جو روح کارفرما تھی، اسے از سر نو زندہ کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ سمجھتے تھے کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں جو حالات تھے، ان کی طرف بجنسہٖ لوٹنا اب ممکن نہیں۔ اسلام کے متعلق ان کا تصور ایک خالص عالمگیر مذہب کا ہے۔ اگرچہ اسے دنیا کے سامنے عربی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی مذہبی روایت خلا میں ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ اب اگر ایک مذہب ایک خاص ثقافتی قالب میں جو مذہب اسلام کے معاملے میں عربیت ہے پیش کیا گیا ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ ہمیشہ کے لئے عربی مراسم و طریقہ ہائے کار کا پابند کر دیا گیا ہے۔

ایک خالص مذہب نہ صرف مختلف ثقافتوں میں مختلف صورتوں میں پیش کیا جائے گا۔ بلکہ ایک ہی ثقافت کے مختلف ادوار میں اس کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ لیکن اس ضمن میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ مذہب سے اس کے خالص حصے کو ان اجزا سے جو محض اس کے ثقافتی قالب اور سلانچے ہیں، کیسے منتخب کیا جائے۔ گو شاہ ولی اللہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتے لیکن انہوں نے یہ سوال اٹھا کر (اگرچہ ان سے پہلے حنفی مکتب فکر میں، بلکہ اس سے بھی پہلے شیعہ سنی اختلاف کے سلسلے میں، یہ سوال اٹھایا جا چکا ہے) قریب قریب لامحدود نظریات و قیاسات کے دروازے کھول دیئے۔ مخصوص عربی ثقافتی قالب کی حدود سے باہر اسلامی خیالات و افکار کی نشرو اشاعت کے لئے شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ہندوستان میں اس وقت بہت کم مسلمان عربی جانتے تھے، لیکن فارسی ان کے اونچے طبقے کی زبان تھی۔ ان کے اس اقدام سے گو بہت سے قدامت پسند علماء ناراض ہوئے (وہ کلام اللہ کے معاملے میں کسی قسم کی تبدیلی کے خواہ وہ ترجمہ ہی کیوں نہ ہو، عقیدۃً خلاف تھے) لیکن ان کا یہ اقدام بہت مقبول ہوا۔ بعدازاں شاہ ولی اللہ کے دو صاحبزادوں نے قرآن کا اردو جیسی نئی زبان میں ترجمہ کیا، جو مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ بڑی سرعت سے فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے اس اقدام سے، جس نے بے شک بعد والوں کے لئے راستہ صاف کر دیا، قرآن مجید کے عام لوگوں کی زبان میں یہ ترجمے کہیں زیادہ انقلابی اقدام تھے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان کے معاشرے کے انحطاط کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس میں حد سے زیادہ اسراف پھیل چکا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہاں صحیح اسلامی روایات دوبارہ مروج ہوں، تو اس بات کا بہت زیادہ یقین ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ سے طاقت اور اقتدار جو جا رہا ہے وہ بحال ہو سکے۔ شاہ ولی اللہ مسلم معاشرے کو مضبوط کر کے مذہب اسلام کو مضبوط کرنا چاہتے تھے یہ ان کا بنیادی مقصد تھا۔ کیونکہ اگر مذہب و عقیدہ مضبوط ہوگا، تو لازماً ملت بھی مضبوط ہوگی۔ اب مسلم معاشرے کو مضبوط بنانے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ ہندوانہ رسمیں جنہیں برصغیر کے مسلمانوں نے

اختیار کر لیا تھا، انہیں ختم کیا جائے، چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ان کے خلاف لکھا اور بتایا کہ اسلام کے عہد اوّل میں ان کا کہیں وجود نہ تھا۔ خاص طور سے انہوں نے مسرفانہ رسوم کی سخت مخالفت کی اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ان رسموں کی اس لئے مخالفت نہیں کرتے کہ وہ ہندوانہ ہیں بلکہ اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ غیر اسلامی ہیں۔ اس بارے میں ان کے ہاں محرک جذبہ وہ تعصب (Bigotry) نہیں، جو شیخ احمد سرہندی کے ہاں پایا جاتا ہے اپنی ممتاز ترین انسائیکلوپیڈیا جیسی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں وہ رومی و ایرانی سلطنتوں کے زوال کے اسباب گناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہیں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں، تم اپنے شہر کے فرمانرواؤں کی زندگیاں دیکھ سکتے ہو۔

شاہ ولی اللہ نے یہ بھی دیکھا کہ معاشرے کے ضعف کا باعث صرف اسراف اور ہندوانہ رسمیں ہی نہیں، بلکہ مسلمان خود آپس میں بھی بٹے ہوئے ہیں۔ اور ان میں حقیقی اتحاد نہیں۔ ایک طرف صوفیہ کے چاروں طریقے ایک دوسرے کا بہت کم پاس کرتے ہیں پھر ان میں اور راسخ العقیدہ گروہ میں مسلسل آویزش ہے۔ اور جہاں تک مسلمانوں کے راسخ العقیدہ گروہ کا تعلق ہے، اس کی صوفیہ اور شیعہ دونوں سے ٹھنی ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ مسلمانوں کے ان مختلف فرقوں کے اتحاد کے لئے اسلام کے دور اول کو اساس بناتے ہیں جب کہ نہ صوفی اتنی اہمیت رکھتے تھے اور نہ سنی شیعہ اختلاف تھا۔ شاہ ولی اللہ میں جو علمی شان ہے، وہ برابر توازن و اعتدال پر زور دیتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ چیز ہے جس پر وہ بار بار زور دیتے ہیں۔ وہ بڑی شد و مد سے اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں میں عدل و انصاف کی شکل میں یہ توازن و اعتدال موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ کبھی بھی شیخ احمد سرہندی یا اپنے ہم عصر مصلح عرب محمد ابن عبدالوہاب کی طرح ایسے خالص انقلابی نہیں ہوئے کہ جن کی نظروں میں یا تو چیزیں بالکل سیاہ ہوتی ہیں، یا بالکل سفید۔

مفاہمت اور مصالحت شاہ ولی اللہ کا خصوصی امتیاز ہے۔ لیکن، جہاں تک سیاسی تخریب کے ان عناصر سے نمٹنے کا سوال ہے، جو اسلام کے لئے خطرہ بن گئے تھے جیسا کہ جوش میں آئے ہوئے مرہٹے

جاٹ اور سکھ، وہ البتہ اس سے مستثنیٰ تھے ایک اور مسئلہ تھا جو صوفیا اور راسخ العقیدہ گروہ میں بہت عرصے سے مابہ النزاع تھا۔ اور جس کے بارے میں شیخ احمد سرہندی کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے اسے موثر طریقے سے حل کر دیا ہے ان کے نزدیک صوفیہ کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے وجود کی وحدت کا اثبات کیا اور یہ کہ یہ سب وہم تھا۔ اس کے برعکس شیخ احمد سرہندی کا کہنا تھا خالق اور مخلوق دونوں کے الگ الگ وجود ہیں۔ لیکن بعض صوفیہ کو اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ اور دونوں گروہوں میں یہ نزاع جاری تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اسے یوں حل کیا کہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ راہ راست پر ہیں۔ ساری بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو دیکھنے والے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ دونوں نقطہ ہائے نظر صحیح مکاشفے پر مبنی ہیں اور شیخ احمد سرہندی نے جو کچھ کہا ہے، وہ درحقیقت ابن عربی ہی کی تائید ہے۔ شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں "اگر حقائقِ واقعی پر استعاروں اور تشبیہوں کو نظرانداز کر کے غور کیا جائے، تو دونوں نقطہ ہائے نظر کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے" اس بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے دراصل وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی یہ جو تعبیر کی ہے، اس سے راسخ العقیدہ اسلام کو ایک فلسفیانہ و متصوفانہ اساس مل گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے صرف صوفیا اور راسخ العقیدہ گروہ کے نزاع کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ خود صوفیہ میں جو نزاع تھا، اسے بھی ختم کرنا چاہا۔ انہوں نے اپنے ہاں چاروں طریقوں کی بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا، جو اب تک مدرسہ دیوبند نے ان کے زیر اثر قائم رکھا ہے۔ ان کے مصالحت پسند مسلک کی ایک اور مثال یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے راسخ العقیدہ لوگوں کے معمول کے خلاف اس پر مصر نہیں تھے کہ شیعہ مسلمان نہیں۔

شاہ ولی اللہ کی رائے میں مسرفانہ زندگی اور داخلی نزاعات کے علاوہ ایک اور چیز جو مسلم معاشرے کی تباہی کا باعث بنی، وہ فقہی امور میں ان کی اندھی تقلید تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک صحت مند معاشرے کے لئے ارتقاء اور تبدیلی لازمی ہے۔ اور چار مذاہب فقہ میں سے کسی ایک مذہب کی اندھی تقلید سے مسلم معاشرے کو کوئی تقویت نہیں ملی

اس معاملے میں شاہ ولی اللہ شیخ احمد سرہندی اور شیخ ابن عبدالوہاب سے، جو ان کی طرح اندھی تقلید کو اسلام کی کمزوری کا باعث سمجھتے تھے، اختلاف نہیں رکھتے۔ برصغیر کے مسلمانوں پر شاہ ولی اللہ کے ان خیالات کا شاید سب سے زیادہ اثر پڑا ہے، جن میں کہ انہوں نے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

بحیثیت مجموعی شاہ ولی اللہ کے افکار و آرا کے بارے میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ اگرچہ وہ پورے کے پورے عالم دین تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے معاشرے کو عمرانی نظر سے دیکھا اور سمجھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ضروری نہیں کہ مذہبی احکام کی محض اس لئے تعمیل ہو کہ وہ اصلاً اللہ کی طرف سے ہیں بلکہ اس لئے بھی ان کی تعمیل ہونی چاہیئے کہ ان سے افراد اور معاشرہ دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے احکام صرف ثواب و عذاب کا معیار نہیں ہیں، بلکہ ان کا مقصد معاشرتی بھی ہوتا ہے کہ ان سے معاشرے کو اور افراد کو، جن سے کہ معاشرہ عبارت ہے، فائدہ پہنچے۔ اس نقطہ نظر میں کوئی چیز غیر اسلامی نہیں۔ بے شک چار سو سال پہلے مشہور مورخ ابن خلدون بھی یہی بات لکھ چکے ہیں اب اگر مذہب تمام چیزوں پر حاوی ہے، جیسا کہ اسلام تعلیم دیتا ہے تو یقیناً اسے معاشرے پر بھی حاوی ہونا ہوگا۔

شاہ ولی اللہ کی ایک عالم دین اور ایک نیک و متقی مسلمان ہونے کی جو زبردست شہرت تھی اور اس کے ساتھ انہوں نے جو اسلام کے اس عمرانی و معاشرتی پہلو پر زور دیا اس کی بنا پر انہوں نے ایک ایسا غیر دینیاتی اساس بہم کر دیا ہے، جس پر بعد میں آنے والے ارباب فکر جو خالصاً دینیاتی ذہنی فضا سے دور ہیں۔ نئی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر اسلامی احکام اس غرض کے لئے ہیں کہ ان سے معاشرتی فوائد پہنچیں، تو اس صورت میں ایک حکم کو جانچنے کا قدرتاً یہ معیار ہوگا کہ وہ کس حد تک اس غرض کو پورا کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں جب کہ ہر طرف سے ثقافتی نمونوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ انہیں جانچنے کا اس قسم کا معیار کافی سمت ہے۔

شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ علمائے دین کی قرونِ وسطیٰ کے فقہائے مجتہدین کے آراء کی غلامانہ تقلید معاشرے کے لئے ایک خطرہ ہے۔ ان کا یہ کام ہونا چاہیئے کہ وہ اصل و خالص دین کے لئے حدیث اور قرآن کی طرف رجوع کریں۔ اور پھر اپنے زمانے اور اپنے ملک کی ضرورتوں پر اس کا اطلاق کریں۔ بے شک اس معاملے میں انہیں قرونِ وسطیٰ کے مجتہدین کو نظر انداز بھی کرنا ہوگا، جو یقیناً بڑا انتہا پسندانہ اقدام ہے لیکن شاہ ولی اللہ کے زمانے میں یہ چیز کوئی زیادہ نادر نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کے لئے جس کا دین کا مطالعہ زیادہ نہیں، کسی نہ کسی عالم کی مدد ضروری ہے لیکن یہ صرف اس بنا پر ہو کہ وہ عالم قرآن اور سنت پر عبور رکھتا ہے، شاہ ولی اللہ باوجود اس بات پر اعتقاد رکھنے کے، کہ قرآن بالکل ایک واضح کتاب ہے وہ اس بارے میں اس حد تک نہیں گئے کہ وہ یہ کہیں کہ اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بہر حال وہ اس سلسلہ میں اپنے مخصوص انداز میں علماء کے سامنے ایک مصالحت پسندانہ متبادل رکھتے ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ اگر وہ ان سے اپنی زیادہ بات نہیں منوا سکتے تو تھوڑی سی ہی منوا لیں اس ضمن میں ان کا کہنا یہ ہے کہ فقہ کے جو چاروں مذاہب ہیں، علماء ان سب کو برابر سمجھیں، اور ان میں سے کسی خاص کی طرف اس طرح توجہ نہ دی جائے کہ دوسرے نظر انداز ہو جائیں۔

قرونِ وسطیٰ کے فقہاء کی اسلامی فکر پر جو سخت گرفت تھی، شاہ ولی اللہ اسے ڈھیلا کر کے برصغیر کے اسلام میں اتنی لچک پیدا کرنا چاہتے تھے کہ اس کو نئے زمانے اور نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ اصلاح اور "ریفارم" چاہتے ہیں، لیکن ان کے پیشِ نظر بظاہر کوئی بڑی تبدیلی نہیں تھی۔ بہر حال انہوں نے ایسے طریقوں کی نشان دہی ضرور کر دی ہے جن کی مدد سے وہ افراد جنہیں مسلمان علماء سے زیادہ بھرپور معاشرتی تبدیلیاں درپیش ہیں، منطقی طور سے ایسی اصلاحات اور

"زیادہ ارمز" تجویز کر سکتے ہیں۔ جن کا شاہ ولی اللہ نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے دور میں جس لچک کو کافی سمجھا تھا، بعد میں آنے والے مصلحین نے اسے مایوس کن طور پر ناکافی قرار دیا۔ درحقیقت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے نتیجے میں دو طاقتور تحریکیں ابھریں۔ ان میں سے ایک جس کا بہت زیادہ براہ راست شاہ ولی اللہ سے تعلق تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ قدامت پسند ہوتی گئی اور اس کا انداز بھی زیادہ سے زیادہ خشک ظاہر پرست ہو گیا۔ اور دوسری تحریک زیادہ سے زیادہ آزاد خیال ہوتی گئی اور اس کی اسلام کی تعبیرات بھی زیادہ سے زیادہ تجریدی اور نظریاتی ہوگئیں۔ جہاں تک اپنے دور کے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کے متعلق خود شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا تعلق ہے شاید سوائے سیاسی میدان کے اور وہ بھی صرف عارضی طور پر، وہ زیادہ تر ناکام رہیں، لیکن اس کے باوجود ان کا اثر و نفوذ پاکستانی و ہندوستانی مسلم ذہن پر آج بھی بہت زیادہ ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہی علم (اسرارِ دین) ہے، جس سے آدمی پکا مسلمان ہوتا ہے اور اس کا ایمان مثل ایسے شخص کے کامل یقین کے پختہ ہو جاتا ہے، جس کو کسی نہایت سچے شخص نے یہ بات کہی ہو کہ سنکھیا زہر قاتل ہے۔ اس کے کھانے سے آدمی مر جاتا ہے۔ اور اس شخص نے بسبب اس قائل کی سچائی اور معتبری کے اس کی تصدیق کی اور پھر قواعد علم حکمت سے یہ بات بھی جانی کہ زہر میں حرارت اور یبوست بے انتہا ہے۔ اور وہ دونوں خاصیتیں انسان کے مزاج کے برخلاف ہیں اور اس لئے اس کو مار ڈالتی ہیں اور اس بات کے جاننے سے اس کا یقین اس قائل پر اور اس کی بات پر اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ پس اسرار دین کے علم کا یہی نتیجہ ہے کہ وہ انسان کو ایسا پختہ کر دیتا ہے کہ کسی طرح ڈگمگا ہی نہیں سکتا۔

شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگرچہ عام عالموں نے فقہ کو لب لباب علوم دین کا سمجھا ہے۔ مگر ان کے نزدیک علم اسرارِ دین ہی سب کا سرتاج ہے ...

(حجۃ اللہ البالغہ کا یہی موضوع ہے)۔ سرسید احمد خاں

افکار و آراء

ایڈیٹر صاحب الرحیم

ایک خط اس سے پہلے آپ کے نام لکھا تھا، لیکن اس کے بھیجنے میں تامل اور تردد رہا تا آنکہ مارچ کے الرحیم کے شذرات نظر سے گزرے، میری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے رسالے کا مطالعہ کروں۔ ہوں تو اُمّی، لیکن حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی نگاہِ کیمیا اثر نے میری زندگی بدل ڈالی۔ دین کے نام سے جو بھی بات کہی جاتی ہے، اس پر غور کرتا رہتا ہوں اور یہ حق مجھ سے اب کوئی نہیں چھین سکتا۔

آپ نے مارچ کے شذرات میں علمائے دین کو حکومت کا سیاسی حریف بننے سے روکا ہے میرے نزدیک یہ صحیح ترین بات اور مشورہ ہے، لیکن ہے یہ کام ذرا مشکل۔ الرحیم کے شذرات پڑھنے کے بعد میں آپ کے اس صحیح مشورے کے بارے میں خط لکھنے پر آمادہ ہوا۔ لیکن پھر تردد میں پڑ گیا۔ اور آپ کو خط نہ لکھا۔

آج شب کو نماز عشا پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا۔ تو آپ یاد آئے اور آپ نے علماء کو حکومت کا سیاسی حریف نہ بننے کا جو مشورہ دیا تھا وہ یاد آگیا، اور اس کے ساتھ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کی بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ اب میرے لئے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں آپ کے خیال کی تائید کروں اور علماء میں سے جو علمائے حق ہیں، وہ خدا نخواستہ اگر اس تصادم کا سوچتے ہیں تو انہیں اِس سے اور اس کے نقصان سے بچالوں۔ حضرت مولانا سندھی اس شرط پر واپس وطن آئے تھے کہ

وہ انگریزی حکومت کے خلاف کسی بیرونی طاقت سے ساز باز نہیں کریں گے۔ اور ان کا یہ مقصد نہیں ہوگا کہ حکومتِ وقت کو اُلٹیں مولانا کے متعدد خطبوں میں یہ بات واضح طور سے کہی گئی ہے لیکن اس وقت کم فہم اور جوشیلے مولویوں نے اس کے غلط معنی لئے۔

میں یہاں صاف صاف کہہ دوں کہ اگر یہ علماء دین کے نام سے کسی حکومت کو الٹ بھی دیں تو اس کے بعد ان کی جو حکومت ہوگی، وہ کبھی "دینی" نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کے پاس دین یعنی دینِ اسلام بطور ایک سیاسی فکر کے ہے کہاں؟ وہ دین کے نام سے جو حکومت بنائیں گے، وہ لادینی ہوگی۔ کیونکہ محض ایک حکومت کو دینی کہنے سے وہ دینی تو نہیں ہو جائے گی۔

اسلام اگر کبھی سیاسی طاقت حاصل کر سکتا ہے، تو اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے عبید اللہی راستہ، عبید اللہی راستہ کیا ہے، اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں۔ اس کے علاوہ دینی سیاست اور کہیں سے آ ہی نہیں سکتی۔ حضرت مولانا سندھی نے کسی خاص مکتبِ خیال کی بنیاد نہیں ڈالی، بلکہ انہوں نے اسلام کے اصولوں کو از سر نو زندہ کرنے کے متعلق اشاروں میں اپنی بات کہی۔ اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں کہ مولانا اسلام کے مبلغ تھے اور اسلام کو دنیا میں کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اسلام ان طریقوں سے ہرگز کامیاب نہیں ہوگا، جنہیں آج کل استعمال کیا جا رہا ہے یہ لوگ دراصل اسلام کی آڑ میں خود حاکم بننا چاہتے ہیں۔ مولانا فرماتے تھے کہ حاکم کوئی بھی ہو، تمہارا کام اسے اسلام کے اصولوں پر چلانا ہے۔ حکومت کا کوئی نام بھی ہو، اسے اسلام کے اصولوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہاں پہ بلکہ ہر جگہ اسلام کو غالب کر کے دکھاؤ۔ بے شک یہ بڑا صبر آزما اور دیر طلب معاملہ ہے، لیکن اس دھن اور خیال میں سرگرمِ عمل رہنا جہاد اور اس راہ میں مرنا شہادت ہے۔

میں جو یہ کہہ رہا ہوں کہ علماء حکومت کے سیاسی حریف نہ بنیں، تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں حکومت کا ایجنٹ ہوں۔ میں دین کی خاطر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ خدانخواستہ اگر دین کے نام سے علماء حکومتِ وقت سے متصادم ہوئے، تو ان کو تو جو نقصان پہنچے گا وہ تو پہنچے گا ہی۔ اس سے

دین کو بھی نقصان ہوگا۔ دین کو سیاست کے وقتی اور ہنگامی شورشوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ دینی سیاست اور ہے اور یہ جو کچھ دین کا نام لے کر کیا جا رہا ہے وہ اور ہے۔ "الرحیم" نے بڑے پتے کی بات کہی ہے، لیکن کیا اس میں اتنی جرأت ہے کہ وہ اپنی اس دعوت کو عام کرے۔

محمد امین کھوسو۔ عزیز آباد انڑواہ
ضلع جیکب آباد

مکرمی ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم۔ دسمبر ۱۹۶۳ء سے ماہنامہ "الرحیم" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مضامین کے لحاظ سے مجھے بہت پسند آیا ہر ماہ خرید تا ہوں ماہنامہ "الرحیم" بابت ماہ مارچ میں حافظ عباد اللہ صاحب کا ایک مضمون "نبوت" زیر نظر آیا۔ اس مضمون سے ذرا ذرا بو آتی ہے۔ کیونکہ ہمارے بعض بزرگوں نے ایسی روایاتیں چھوڑی ہیں جن سے منکرین ختم نبوت سہارا لے رہے ہیں۔ آخر کار حافظ صاحب نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ ابن عربی مقام نبوت کو صحیح طرح معلوم نہ کرسکے۔ ظاہر بات ہے کہ ولایت کے متعلق تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نبوۃ بعدی الا المبشرات قیل وما المبشرات یا رسول؟ قال الرؤیا الحسنۃ او قال الرؤیا الصالحۃ۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں عرض کیا۔ وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں۔ یا رسول اللہ! فرمایا اچھا خواب یا فرمایا صالح خواب۔

(مسند امام احمد بروایت ابو الطفیل۔ نسائی ابوداؤد۔ بحوالہ رسالہ "ختم نبوت")

یہ مقام ولایت کا ہے۔ یعنی وحی کا اب کوئی امکان نہیں اور وحی کے بجائے بشارتیں ہیں یا خواب۔ اور بشارت نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ اگر کسی ولی یا مجدد کو کوئی اشارہ ملے گا تو اچھے خواب کے ذریعہ مل جائیگا۔ امید ہے کہ حافظ صاحب دوبارہ نبوت پر مدلل

مضمون لکھ کر شائع فرمائیں گے ۔ میری دعا ہے ۔ کہ لوگوں کو اس سے متعارف کرنے کے لئے خداوند کریم اکیڈمی اور تمام عملہ ماہنامہ الرحیم کی مدد فرمائے ۔

شاہ محی الدین ملا فیروز شاہ گیلانی
سکنہ اکبر پورہ ضلع پشاور

السلام علیکم ۔ بخیرم دخیر خواہم

مارچ کے شمارے میں سبز علی خاں صاحب کا خط "افکار و آرا" کے ذیل میں شائع ہوا ہے ۔ میری بھی چند ایک تجاویز ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو انہیں بھی قارئین کرام کے غور و فکر کے لئے شائع کر دیں ۔

۱۔ سبز علی خاں صاحب کی تجویز کے مطابق جو ترجمہ اور تفسیر بھی الرحیم میں دی جائے وہ شاہ صاحبؒ ہی کے اقتباسات اور فتح الرحمٰن والفوز الکبیر ہی میں سے ہو ۔ اس سے قرآن پاک کو شاہ صاحب کے طرز فکر پر سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔

۲۔ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عنوان بھی مستقل ہو جائے ۔ زیادہ ضرورت اس بات کی بھی ہے ۔

۳۔ الرحیم میں شائع ہونے والے مضامین کا مواد بالکل مروجہ شرکیہ افعال اور بدعات سے پاک ہو اس لئے کہ ملت کے زوال کے اسباب میں سے یہ بھی ایک وجہ ہے ۔

۴۔ ایک شمارے میں شائع ہونے والے ضروری خطوط جن میں کہ لکھنے والے نے کسی مسئلے کے بارے میں جواب طلب کیا ہو ۔ آئندہ شمارے میں اس کو مطمئن بھی کیا جائے ۔

۵۔ وقتاً فوقتاً آپ اس جریدہ کے ذریعہ قارئین کرام کو اپنے ادارے کی کارکردگی کے متعلق بھی مطلع کیا کریں ۔ مثلاً کون کون سی کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں ۔ یا کون کون سی کتابیں شاہ صاحب کی زندگی یا ان کے طرز فکر کی وضاحت کے سلسلے میں معاون ہو سکتی ہیں اور ان کا پتہ ۔

دعا گو ۔ ملک نور محمد اعوان اختر واہ

مکرمی ...

مارچ کے الرحیم کے مطالعہ کے بعد میں یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ ایک مضمون "نبوت" کے سوا کوئی مضمون بھی جامع اور سیر حاصل نہیں۔ ان مضامین کو ایک سرسری مطالعہ یا سطحی تعارف کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے قاری کا متجسس ذہن تسکین نہیں پاتا۔ بلکہ ایک طرح کی تشنگی اور خلجان محسوس کرتا ہے۔

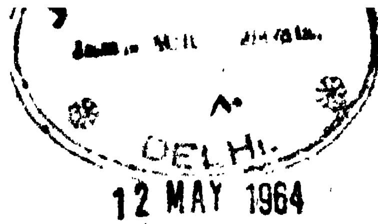
وارث سرہندی
کنجرور، ضلع سیالکوٹ

مکرمی ...

اپریل کے الرحیم میں "الاسلام دین الاشتراکیہ" مضمون پڑھا۔ سوشلزم یعنی اشتراکیت اب ایک مذہب کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ بے شک اس کے بھی بہتر فرقے ہوں گے آپ نے عرب سوشلزم کا ذکر کیا۔ اب برمی سوشلزم کا ظہور ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں ایک زمانے سے اسلامی سوشلزم کا نعرہ تو گونج ہی رہا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ ناموں اور اصطلاحوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اور سب یہی کرتے ہیں، آخر ناموں کے ہیر پھیر سے ہوتا ہی کیا ہے۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے اور آپ بھی اس سے واقف ہوں گے کہ سوشلزم سے مراد پیداوار و دولت کے وسائل پر افراد کا نہیں بلکہ مجموعی قوم کا، جسے آپ حکومت کہہ لیں، تصرف ہے۔ ایک معاشی نظام میں، جس حد تک یہ قومی تصرف پایا جائے گا، اسی حد تک ہم اس کے سوشلسٹ ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں۔ باقی ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کسی نظام کو عرب سوشلزم کہیں یا یوگوسلافی سوشلزم یا چشم دور ہمارے ہمسایہ ملک کی کانگرس کا سوشلزم۔ براہ کرم چھلکا نہ دیکھئے، بلکہ اس کے اندر جو گودا ہوتا ہے، اس پر نگاہ رکھئے۔

عنایت حسین - ایسٹ گارڈن۔ کراچی



الرحیم حیدرآباد — مئی ۱۹۶۴ء

ایڈیٹر صاحب

چاہتا ہوں کہ پروفیسر خالد عمر صاحب کے طویل مکتوب پر کچھ لکھوں۔ لیکن اس سے چونکہ لمبی چوڑی بحثوں کا دروازہ کھل جائیگا۔ جس کا کہ شاید "الرحیم" متحمل نہ ہو، اس لئے یہاں صرف چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

صاحب موصوف کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ ایک "قدیم" چیز کو محض اس لئے ترک کر دینا کہ وہ "قدیم" ہے، صحیح نہیں، لیکن انھوں نے یہ جو فرمایا ہے، کہ "انسانی عقل تو صدیوں میں ایک چھوٹے سے کیڑے کے متعلق بھی صحیح معلومات نہیں حاصل کر سکتی"۔ یہ حقیقت نہیں انسانی عقل نے تجربہ، مشاہدہ اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ خدائی کائنات کے وہ وہ راز سربستہ معلوم کئے ہیں کہ سائنس سے تھوڑی بہت شُد بُد رکھنے والا بھی اس سے واقف ہے۔ عقل بھی آخر عطیہ خداوندی ہے۔ اور اس کے کمالات بھی ایک لحاظ سے اسی ذات حق کے کمالات ہیں، جو مصدرِ وحی والہام ہے۔

پروفیسر صاحب کا یہ ارشاد کہ "نہ دنیا بدلتی ہے، نہ زمانہ بدلتا ہے، نہ انسانی فطرت بدلتی ہے ....، بدیہی طور سے حقیقتِ واقعی کے اتنا خلاف ہے کہ شاید ہی کوئی ذی ہوش انسان اس سے اتفاق کرے۔ بقول اقبالؔ یہاں تو "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"! یہ دعوی کہ نہ دنیا بدلتی ہے، نہ زمانہ، قدامت کے حق میں غیر منطقی سی دلیل ہے۔

آخر میں موصوف نے یہ جو فرمایا ہے کہ "مسلمانوں کے لئے "حَکَم" کا مرتبہ قرآن اور سیرت خاتم النبین کو حاصل ہے، اور اس سلئے اسلاف کا نام لے کر ایسی (یعنی تجدد کی) "کوشش کرنا بے سود ہوگا" سو عرض یہ ہے کہ بے شک "حَکَم" تو قرآن و سیرت ہی ہے، لیکن اگر ان سے اسلاف کا کوئی استنتاج حجت نہیں تو آپ اس سے جو نتیجہ نکالیں گے، وہ کیسے حجت مانا جائے گا۔ اس بارے میں صواب و ناصواب کا آخر معیار کیا ہے؟

الطاف جاوید۔ مارٹن روڈ، کراچی

nthly 'AR-RAHIM'' Hyderabad Regd. S. No

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

اہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع

ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی

اعت کا انتظام کرنا۔

امی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن

ہیں دستیاب ہوسکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کا

لیے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

ب ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم

ں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

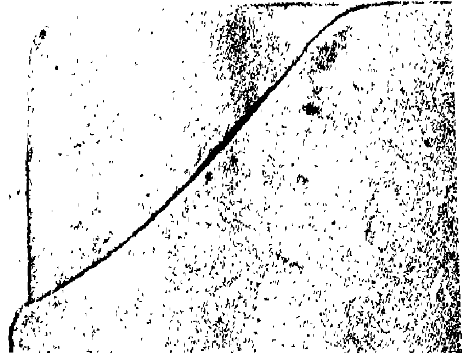
ت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا

ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، اُنہیں فروغ دینے

سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں

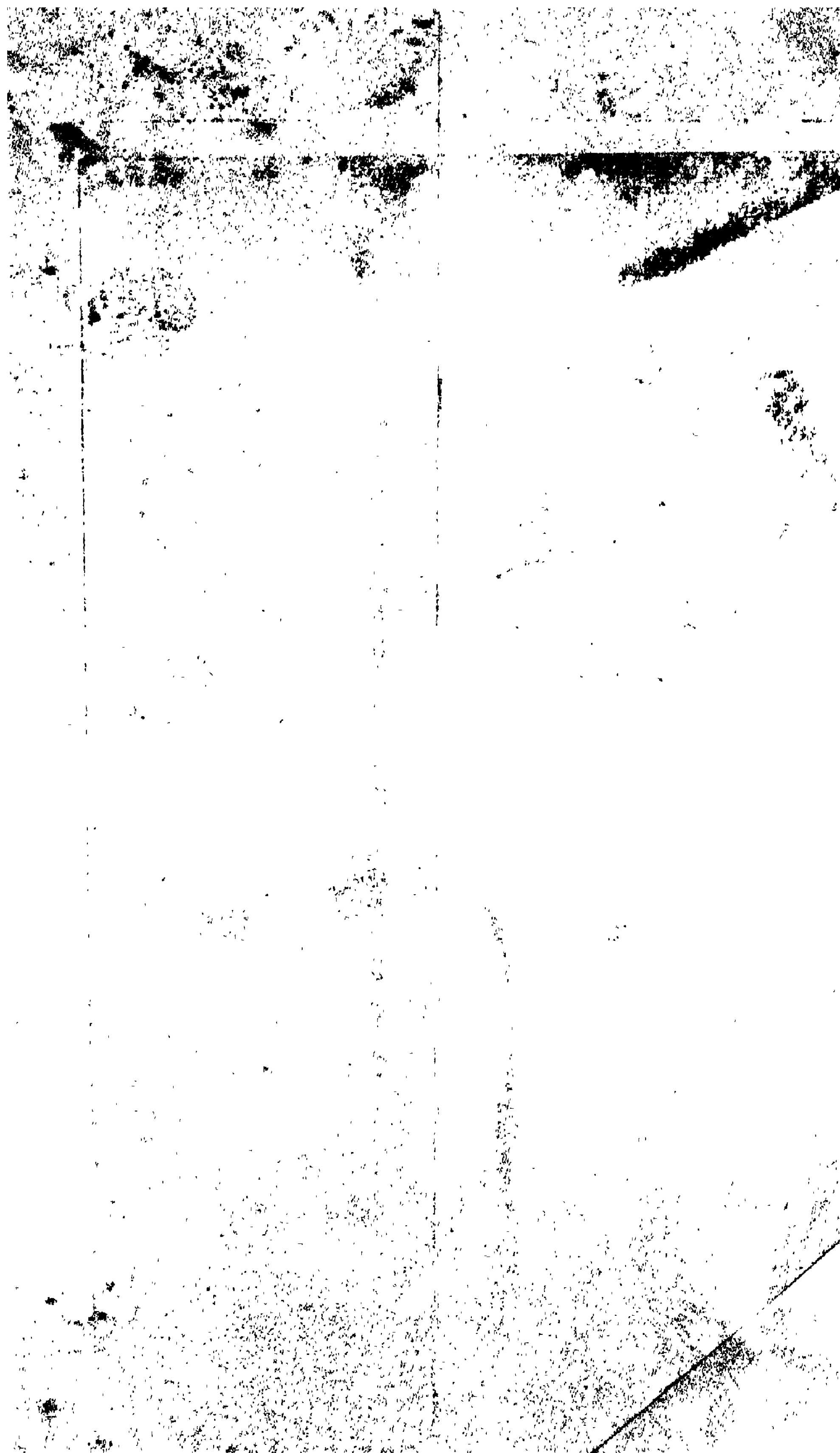


سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع









جھلکیاں

حرفِ اوّل

ادب میں جمود ہے یا نہیں؟ اس وقت ہم اس بحث میں اُلجھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں "ادب محترم" حضرات بہت کچھ کہہ چکے ہیں اور کہہ رہے ہیں

ہمارا نظریہ تو یہ ہے کہ ادب چونکہ زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور زندگی ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے اس لئے ادب میں انجماد یا انحطاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بادی النظر میں جمود کا جو گہرا بادل ادب پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ ادباء اور شعراء کی نگارشات کی اشاعت کے لئے معیاری جرائد کا فقدان ہے۔ پگڈنڈی کے اجراء نے اس کمی کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ اس کی ایک جھلک " اور فنکاروں نے کہا" کے عنوان کے تحت چھپنے والے پیغامات سے مل سکتی ہے۔ پگڈنڈی کی روز افزوں مقبولیت اور اس کی بڑھتی ہوئی اشاعت کے پیشِ نظر پگڈنڈی کا یہ شمارہ منظر عام پر لاتے ہوئے ہم اپنے ادب نواز ساتھیوں کے پُرخلوص تعاون پر بجا طور پر فخر محسوس کر رہے ہیں۔

ادارہ